قومی زبان
زیڈ۔ اے۔ احمد
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

قومی زبان

زیڈ۔اے۔احمد

قومی زبان

زیڈ۔ اے۔ احمد

مترجم

معین اعجاز

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Qaumi Zaban

Compiled By

Z.A. Ahmad

سنہ اشاعت : جنوری/مارچ 2001 شک 1922

اڈیشن : 1100

قیمت : =/76

سلسلہ مطبوعات : 865

ناشر : ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان

ویسٹ بلاک ا، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

طابع : فہمی کمپیوٹر، دین دنیا ہاؤس، 900 جامع مسجد دہلی۔6 ٹیلیفون: 3280644

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی۔ علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انہوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہوگئے۔ جو کچھ نہ لکھا جاسکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے

والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشو و نما طبعی ،انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ اگلے اڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست مضامین

دیباچہ

قومی زبان کا مسئلہ حالیہ دنوں میں زبردست تنازعے کا باعث بنا ہے۔ اس سوال پر کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے کہ ہندستان کی کوئی قومی زبان ہونی چاہیئے یا نہیں کیونکہ تمام باشعور افراد اس بات پر متفق ہیں کہ فکر و اظہار کا ایک ایسا وسیلہ تلاش کیا جانا چاہیے جو ہماری قومی زندگی کی باز آبادکاری اور ترقی کے لیے جاری مشترکہ کوششوں اور ولولوں کو ہم آہنگ کر سکے۔ اس بات پر بھی کوئی تنازعہ نہیں ہے کہ تمام ہندستانی زبانوں میں وہ زبان جو شمالی ہند کے وسیع تر علاقے کے شہروں اور گاؤوں میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور جسے ہندی، اردو یا ہندستانی کے نام سے جانا جاتا ہے، وہی قومی زبان کی حیثیت سے سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوگی۔ دراصل اختلاف وہاں شروع ہوتا ہے جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ قومی مقاصد کے حصول کے لیے شمالی ہند کی اس زبان کو کس طرح اور کن خطوط پر فروغ دیا جائے۔ اگر تکلف کو بالائے طاق رکھ کر بات کی جائے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا قومی زبان کی تشکیلِ نو اس طور پر کی جائے کہ اس کا جھکاؤ سنسکرت کی جانب ہو اور اسے غیر ملکی عناصر بطورِ خاص عربی اور فارسی الفاظ سے بالکل پاک کر دیا جائے یا پھر یہ کہ غیر ملکی الفاظ کے ایک معقول حصے کو باقی رکھا جائے۔ بدقسمتی سے اس سوال پر پیدا ہونے والے مختلف اور متضاد خیالات نے ایک ایسی شکل اختیار کر لی ہے جسے ہندی اردو تنازعے کا نام دے دیا گیا ہے۔

ہندی کے حامیوں کی دلیل یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق صرف شمالی ہند سے نہیں بلکہ پورے ملک سے ہے اور چونکہ بیشتر ہندستانی زبانوں کا ماخذ سنسکرت ہے اس لیے کوئی بھی قومی زبان اس وقت تک عظیم اکثریت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ

اس میں سنسکرت اصل کے الفاظ اور محاوروں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود نہ ہو۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ملک کی بہترین ادبی اور ثقافتی روایات کی نمائندگی صرف اسی زبان میں ہو سکتی ہے جو مقامی الفاظ سے لبریز ہو اور جو حال کو ماضی بعید سے جوڑ سکے۔ دوسری طرف اردو کے حامی یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ مسلم اثرات کی وجہ سے ہندستان میں تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لہٰذا قومی نقطۂ نظر سے یہ بات قطعی مناسب نہ ہوگی کہ ملک پر ایک ایسی زبان تھوپ دی جائے جو قدیم ہندو تہذیب کا ماحول تیار کرنے کا باعث بنے کیونکہ اس کے نتیجے میں آپسی ٹکراؤ نیز مذہبی اور فرقہ وارانہ نوعیت کی اشتعال انگیزی کو شہ ملے گی۔ ان کے خیال میں اردو ایک ایسی زبان ہے جو اس بے مثال کلچر کی نمائندگی کرتی ہے جو گذشتہ چھ یا سات صدیوں میں پروان چڑھا ہے اور جس میں اس سرزمین کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ امیدوں، جد و جہد، کامرانیوں اور خوشیوں کے علاوہ ان کے دردِ مشترک کی آئینہ داری ہوئی ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک ہندستانی زبان ہے لیکن عربی اور فارسی الفاظ کی آزادانہ آمیزش نے اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی اور تہذیبی روایات کے اظہار کا وسیلہ بنا دیا ہے۔ اب اگر اسے سنسکرت آمیز الفاظ سے بوجھل بنا دیا جائے تو یہ ہندستانی عوام کے ماضی کی پچھلی کئی صدیوں کی تاریخ کو مٹا دینے کے مترادف ہوگا۔

ان دو مکاتبِ فکر کے دلائل اور جوابی دلائل کو خواہ کوئی کتنی ہی اہمیت کیوں نہ دے لیکن یہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں کے نقطۂ نظر پر کچھ ایسے اثرات کا غلبہ ہے جن کا زبان کے مسئلے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ سنسکرت آمیز ہندی کے حامیوں پر جس بات کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے احیا پرستی کی دُھن۔ یہ خیال ہندو سماج کے تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر باشعور اعلیٰ اور متوسط طبقے کے دلوں میں سرایت کر گیا ہے۔ دوسری طرف اردو کے حامیوں میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے کے ذہنوں میں اکثریتی فرقے کے تئیں شک وشبہ کے ایک ایسے احساس نے گھر کر لیا

ہے جو معقولیت پسندی سے تقریباً عاری ہے۔اس احساس کا اظہار علاحدگی پسندی کی شکل میں کلچر کے شعبے میں بھی اتنا ہی نمایاں ہوتا ہے جتنا سیاست میں۔ پچھلے کئی برسوں سے متعدد ادبی شخصیتیں اور سیاست داں سنسکرت آمیز ہندی اور فارسی آمیز اردو کے درمیان سمجھوتے کی راہ نکالنے کے لیے ہندستانی نام کی ایک زبان کے فروغ کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس کے تحت تجویز یہ ہے کہ ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ ان الفاظ اور محاوروں کو اس زبان میں شامل کر لیا جائے جو یا تو پہلے ہی سے رائج اور مقبول ہیں یا پھر اتنے عام فہم ہیں کہ انھیں آسانی سے مشترکہ طور پر قبول کر لیا جائے گا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہندستانی کسی بھی لفظ سے محض اس بنیاد پر پرہیز نہیں کر سکتی کہ اس کی اصل کیا ہے۔ یہ زبان ہندی اور اردو کی مشترکہ قواعد اور سنسکرت، عربی، اور فارسی کے ان الفاظ کے سہارے فروغ پائے گی جو ہماری روزمرہ گفتگو میں اس طرح شامل ہو گئے ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ہندستانی صحیح معنوں میں قومی میڈیم بن جائے گی اور ہماری تہذیبی رنگا رنگی کو ایک لڑی میں پرو کر اسے اس طرح فروغ دے گی کہ سب ایک دوسرے کے معاون بن جائیں گے۔

زبان کے مسئلے کا لامحالہ طور پر جو حل سامنے آئے گا وہ شاید انھی خطوط پر ہوگا جن کی تجویز ہندستانی کے حامیوں نے پیش کی ہے۔ لیکن اس وقت جو مشکل درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ادب کی حد تک ہندستانی ابھی تک صرف ایک ذہنی میلان کی نشاندہی کر سکی ہے۔ جب تک کہ سختی اور تیزی سے اس رجحان کو کوئی ٹھوس شکل نہیں دی جاتی اس وقت تک ایک طرف ادبی ہندی اور دوسری طرف ادبی اردو کے دباؤ کو روکنا آسان کام نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب ہم اصل تحریر کی طرف آتے ہیں تو خود ہندستانی کے حامیوں کے درمیان بھی اچھے خاصے اختلاف نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حال واضح طور پر اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ ہندستانی کا تصور ابھی تک کوئی باقاعدہ ادبی شکل اختیار نہیں کر سکا ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کو زیادہ گہرائی سے دیکھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ آج کا تنازعہ بڑی حد تک بے مقصد اور بے معنی ہے کیونکہ زبانیں چند مصنفین یا ادب کے کچھ جوشیلے افراد کے

ہاتھوں تشکیل نہیں پاتیں بلکہ سماجی تنظیم کی دین ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہماری قومی زبان کی شکل اور ڈھانچے کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوگا کہ ہندستان میں سماجی ترقی کا عمل کیا رخ اختیار کرے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ تمام تر سماجی تبدیلیاں خود انسان ہی کے ہاتھوں عمل میں آتی ہیں لہٰذا ہم ان لوگوں کے خیالات اور آرا کو نظرانداز نہیں کر سکتے جو عارضی طور پر ہی سہی عوام کے ذہنوں کو متاثر کر کے انھیں ایک یا دوسری سمت موڑ سکتے ہیں۔ ان کی جانب سے ہمدردی یا منافرت کے جن جذبات کو فروغ دیا جاتا ہے ان کا اثر حالات و واقعات پر چونکہ دیرپا نوعیت کا ہوتا ہے لہٰذا اس حقیقت کے پیش نظر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سمپوزیم میں مختلف مکتبِ خیال کے عصری اہلِ قلم اور اسکالرز کو قومی زبان کے مسئلے پر اظہارِ خیال کے لیے یکجا کیا جائے۔

اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اس سمپوزیم میں تمام تر اہم مکاتبِ خیال کے لوگوں کو مدعو کیا جائے۔ راسخ قسم کے اردو نواز مکتبِ فکر کی نمائندگی مولوی عبدالحق اور میاں بشیر احمد کر رہے ہیں جن کا خیال ہے کہ بعض معمولی اصلاحات کے بعد اردو آسانی سے ملک کی عام زبان بن سکتی ہے اور اسی طرح اسے ہر جگہ تسلیم بھی کر لیا جائے گا۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ 1857ء تک اردو ہمہ گیر پیمانے پر تسلیم کی جاتی تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں عام زبان کے طور پر بولی جاتی تھی لیکن بغاوت (پہلی جنگ آزادی) کے بعد ایک نئی ہندو قومیت کے تصور نے جنم لیا جس نے احیا پرستی کی کئی تحریکوں کو فروغ دیا جن کا مقصد ویدوں کے عہد کے علم و دانش کو حیاتِ نو بخشنا اور قدیم ہندو تہذیب کی بالادستی کو دوبارہ قائم کرنا تھا۔ اس احیا پرستی کی حمایت برہمو ادیوں (Thesophists) نے کی جبکہ اس کے کچھ پہلوؤں کی سرکاری افسروں کی جانب سے حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس طرح اس زبان کو سنسکرت آمیز بنانے کی مہم شروع ہو گئی اور بہار اور یوپی میں ایسی باقاعدہ تنظیمیں قائم ہو گئیں جن کے ذریعے انتہائی سنسکرت آمیز زبان کا پرچار کیا گیا اور اسے ہندی کا نام دیا گیا۔ سر سیّد احمد خاں اور اردو کے بعض دوسرے حامیوں نے ہندوؤں کے ایک طبقے کی اس

علاحدگی پسندانہ مہم کی مخالفت کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ہندی زبان وادب کا پنڈت مدن موہن مالویہ اور ہندو فرقے کے بعض دوسرے رہنماؤں کی سرپرستی میں اردو کی مخالفت میں فروغ ہوتا رہا۔ مولوی عبدالحق کا یہ بھی کہنا ہے کہ غیر مانوس اور مشکل سنسکرت الفاظ کو اس زبان میں دانستہ طور پر ہندی ادیبوں نے داخل کیا جس کے باعث ہندی اور اردو کے درمیان بہت بڑی خلیج پیدا ہو گئی اور اس نے دونوں جانب بہت سے تعصبات کو اتنا بڑھاوا دیا کہ آج قومی زبان کا کوئی معقول حل تلاش کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ وہ اپنی اس رائے پر مضبوطی سے قائم ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ ان کے مطابق ہندوؤں نے ماضی میں اس کی نشو ونما میں زیادہ نمایاں رول ادا کیا ہے لیکن آج احیا پرستانہ رجحان کے زیر اثر بیشتر ہندوؤں نے اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے اور اسے ان لوگوں کے حوالے کر دیا ہے جو عربی اور فارسی کے الفاظ سے اسے بوجھل بنا دینا چاہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خیال میں مہاتما گاندھی نے ہندی کی پورے طور پر پشت پناہی کر کے اردو کے حامیوں کے شکوک وشبہات کر بڑھا دادیا ہے اور اب وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ بہت سے قوم پرست رہنماؤں کی یہ ایک سوچی سمجھی پالیسی ہے کہ ملک پر انتہائی سنسکرت آمیز زبان تھوپ دی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ نام نہاد ہندستانی جس کے بارے میں سیاسی حلقوں میں بہت کچھ سنا جا رہا ہے، صرف بات چیت کی سطح پر کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ادبی کاموں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔ اردو اور ہندی کے موجودہ تنازعے کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے اس مسئلے کے حل کے لیے ایک تجویز پیش کی ہے۔ خود انھی کے الفاظ میں ـــــ "ایک مشترک فرہنگ ترتیب دی جائے جس میں عربی، فارسی اور اردو کے ان تمام الفاظ کو شامل کیا جائے جو ہندی زبان وادب میں داخل ہو چکے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی کے ان تمام الفاظ کو بھی شامل کیا جائے جنھیں اردو نے اخذ کر لیا ہے۔ اس فرہنگ کو اردو اور ہندی مصنفین کے ایک نمائندہ ادارے کے سامنے پیش کیا جائے جس کی منظوری کے بعد اسے اس مقصد سے شائع کیا جائے کہ یہ مشترکہ زبان کے مزید فروغ کے لیے بنیاد فراہم کرے گی۔ اسی ادارہ یا اس کی

ناہمزد کردہ کسی کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندی اور اردو کے ایسے الفاظ اور محاوروں کو اس فرہنگ میں شامل کرتی رہے جنھیں زبان کی ترقی اور نئے خیالات سے آشنا کرانے کے لیے ضروری سمجھا جائے۔ ان کوششوں کے جو نتائج سامنے آئیں ان کی مناسب ڈھنگ سے تشہیر بھی کی جانی چاہیے۔ ممکن ہے کہ اس طور پر ہم مصنفین کا ایک ایسا حلقہ تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو اپنی ادبی کاوشوں کے ذریعے مشترکہ زبان کو مقبول بنانے میں معاون ثابت ہو۔ کم از کم اتنا تو ہوگا ہی کہ دونوں زبانوں کے درمیان جو فاصلہ بڑھتا جارہا ہے اسے کم کرنے میں مدد ملے گی۔ اس مشترکہ زبان میں کچھ اخبارات اور جرائد کی اشاعت اسے مقبول بنانے میں دوررس اثرات مرتب کرے گی"۔

میاں بشیر احمد کا تجزیہ بھی مولوی عبدالحق جیسا ہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو نے تاریخی طور پر ہندو اور مسلم کلچر کی آمیزش کا ایک بے مثال نمونہ پیش کیا ہے جیسا کہ ان کا خیال ہے ـــــ "یہ بات بالکل واضح ہے کہ اردو کی بنیاد سنسکرت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رشتہ ہندوؤں سے ہے۔ دوسری طرف اس کا بالائی ڈھانچہ جزوی طور پر مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ زبان دو تہذیبوں کے درمیان ایک سمجھوتے کی آئینہ داری کرتی ہے"۔ وہ مہاتما گاندھی اور کانگریس کے ان رہنماؤں کی تنقید کرتے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو ہندی نواز تحریک سے جوڑ رکھا ہے۔ ہندی مصنفین کے سامنے وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ـــــ "وہ عربی اور فارسی الفاظ سے احتراز کرنے کی اس پالیسی کو ترک کردیں جو تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس کی جگہ وہ ایسے الفاظ اور محاورے استعمال کریں جو زیادہ عام اور مستعمل ہیں"۔ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو ہندی اردو کے قریب تر آجائے گی اور پھر رفتہ رفتہ دونوں زبانیں ایک مقام پر پہنچ کر مل سکتی ہیں"۔

اس سمپوزیم میں رائج ہندی نواز مکتبِ خیال کی نمائندگی ڈاکٹر دھیریندر ورما کررہے ہیں۔ ڈاکٹر دھیریندر ورما اردو کو ہندی ہی کا ایک اسلوب مانتے ہیں جو عربی اور فارسی الفاظ کے بوجھ سے لدی ہوئی ہے اور جو تہذیبی سطح پر ایران، وسطی ایشیا اور عرب سے فیضان

حاصل کرتی ہے۔ ماضی میں اردو نے جو مقبولیت حاصل کی تھی وہ کچھ سیاسی حالات کی مرہونِ منت تھی۔ یہ ان ہندوؤں کے لیے سب سے آسان ذریعۂ اظہار تھی جو ہندی والے علاقوں میں رہتے تھے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ انتظامیہ میں استعمال ہوتی تھی اس لیے سرکاری عہدیدار اور وہ افراد سیکھتے تھے جو کسی نہ کسی سطح پر اس وقت کی سرکاری مشینری سے وابستہ تھے۔ لیکن مغلوں کے زمانے میں اردو یا کھڑی بولی کو ہندوؤں نے عام طور پر ایک غیر ملکی زبان تصور کیا۔ انیسویں صدی میں بہر حال کھڑی بولی کو غیر ملکی لفظیات اور رسم خط سے آزاد کرا کے جدید ہندی کی شکل میں فروغ دیا گیا۔ اردو اب اس سرکاری سرپرستی سے محروم ہو چکی ہے جو ماضی میں اسے حاصل تھی لہٰذا آج اس کا مستقبل اتنا تابناک نہیں ہے۔ حکمرانوں کے بدل جانے کے بعد اردو کے استعمال کو انتظامیہ میں باقی رکھنے کا کوئی جواز موجود نہیں رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس اعتبار سے موجودہ دور میں انگریزی آمیز ہندی اور رومن رسم خط کا کیس اردو کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہے۔ ڈاکٹر ورما کے مطابق ہندی وہ واحد زبان ہے جو ایک طرف سب کو ہندستان کی ان قدیم تہذیبوں کے قریب لے جائے گی جو سنسکرت، پالی اور پراکرت میں محفوظ ہیں اور دوسری طرف تقریباً تمام جدید ہندستانی زبان وادب مثلاً بنگالی، مراٹھی، گجراتی، اڑیہ، آسامی حتیٰ کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے بھی رشتہ استوار کرے گی۔ ڈاکٹر ورما ہندستانی کو فروغ دینے کے سخت خلاف ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ہندستانی کا کوئی وجود نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ ایک آسان قسم کی اردو ہے جو اعلیٰ ادبی اور علمی کاموں کے لیے قطعی کار آمد نہیں ہے۔ انھیں اس بات کا خوف ہے کہ ایک مشترکہ زبان کی دُھن میں ہندستانی کے حامی نہ تو ہندی کو پروان چڑھنے کا موقع دیں گے اور نہ اردو کو۔ ان کے مطابق زبان کے مسئلے کے اصل حل کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ "ہندی بولنے والی آبادی میں مثبت قسم کی قوم پرستی بیدار ہو جس کے تحت وہ اپنی قومی زبان ہندی کی حمایت میں مذہب، ذات اور طبقات کے اختلافات سے بلند ہو کر یکجا ہو جائیں"۔

اس سمپوزیم کے باقی جو مقالہ نگار ہیں ان میں پروفیسر امر ناتھ جھا کے سوا سبھی ہندستانی مکتبِ فکر کے کسی نہ کسی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پروفیسر امر ناتھ جھا واضح طور پر اردو کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کیے جانے کے خلاف ہیں کیونکہ وہ پورے طور پر اس خیال کے حامی ہیں کہ اردو کا پورا ماحول اور مزاج غیر ملکی ہے، ہندستانی نہیں ہے۔ لیکن ان کے مطابق آج کی ہندی کا دعویٰ بھی اتنا ہی ناقابلِ قبول ہے کیونکہ "حالیہ برسوں میں ہندی مصنفین کا رجحان یہ رہا ہے کہ زبان مصنوعی نمائشی اور پنڈتانہ ہو جائے۔ وہ سنسکرت کے غیر مانوس، مشکل اور کتابی الفاظ اپنی تحریروں میں داخل کر رہے ہیں۔ وہ ابتدائی دور کے ہندی شعرا اور کویوں کے اسلوب کو ترک کرتے جا رہے ہیں۔ وہ زبان کو عوام الناس سے دور لے جا رہے ہیں جن کے درمیان یہ نموپذیر ہوئی۔" اس کے باوجود ان کا یقین ہے کہ "ہندستانی اصل کی کوئی بھی زبان اگر پورے ملک کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے تو وہ وہی زبان ہو سکتی ہے جو سنسکرت آمیز ہو۔" لیکن پروفیسر جھا اس بات کے زبردست قائل ہیں کہ انگریزی کو بین صوبائی روابط کے لیے باقی رکھا جانا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ "ہندستانیوں نے سو سال تک اس زبان کا قابلِ قدر علم حاصل کیا ہے اور رہنما اسے آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ عوام کی زبان تو نہیں بن سکتی لیکن مرکزی قانون سازیہ، وفاقی عدالت اور دیگر بین صوبائی اجتماعات میں اس کا استعمال اس وقت تک جاری رہ سکتا ہے جب تک یہ اظہار کا آسان ذریعہ بنی رہے"۔

اب ہم ہندستانی کے حامی مصنفین کے متعدد نقطہ ہائے نظر پر اجمالی نظر ڈالیں گے۔

زبان کے سوال پر مہاتما گاندھی کے خیالات نے کئی طرح کے اندیشوں کو جنم دیا ہے۔ اردو کے جوشیلے حامیوں نے انھیں سنسکرت آمیز ہندی کا حامی اور مبلغ قرار دیتے ہوئے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس میں رتّی برابر شبہ نہیں کہ اکثر ان کے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے خیالات سے متعلق اردو کے سخت گیر قسم کے حامیوں کے دلوں میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں،

وہ اس حقیقت کے تناظر میں کچھ جائز نظر آتے ہیں کہ کانگریس کے ہندستانی نواز موقف کی رسمی طور پر تائید کرنے کے باوجود وہ ملک کی ہندی نواز مہم کے تئیں اپنے گہرے قرب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 1935ء میں انھوں نے ناگ پور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی صدارت کی، جس میں انھوں نے قومی زبان کے لیے مناسب نام ہندی یا ہندستانی کی منظوری دی۔ اس کے خلاف مولوی عبدالحق اور اردو کے دوسرے اہم مصنفین کی قیادت میں احتجاج کا ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ گذشتہ تین یا چار برسوں کے درمیان مہاتما گاندھی نے زبان کے مسئلے پر بہت کچھ لکھا ہے اور اگرچہ ان کی تحریریں جگہ جگہ خود ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد میں اس معاملے پر انھوں نے سنجیدگی سے غور کیا ہے اور اب اپنے خیالات کو ممکنہ حد تک اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے مشترکہ زبان کے لیے "ہندستانی" نام کی حمایت کی ہے ہندی کی نہیں۔ جہاں تک خود زبان کا سوال ہے ان کی اول تجویز یہ ہے کہ اس کا کسی بھی مذہب سے رشتہ نہیں جوڑا جانا چاہیے۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ کسی بھی لفظ کے لیے "غیر ملکی" یا "دیسی" کی اصطلاح نہیں استعمال کی جانی چاہیے، لفظ کا اصل معیار یہ ہونا چاہیے کہ وہ مروج ہو۔ تیسری بات یہ کہ اردو مصنفین کی جانب سے استعمال کیے جانے والے ہندی کے تمام الفاظ اور ہندی مصنفین کے استعمال کردہ تمام تر اردو الفاظ کو مروجہ تسلیم کیا جانا چاہیے۔ چوتھی تجویز یہ ہے کہ تکنیکی اصطلاحات کے لیے سنسکرت کو خصوصی ترجیح نہیں دی جانی چاہیے اور آخری بات یہ کہ عربی اور دیوناگری دونوں رسم خطوں کو مروجہ اور سرکاری تسلیم کیا جانا چاہیے۔

پنڈت جواہر لال نہرو اردو اور ہندی کو ہندستانی کے دو خاص پہلو مانتے ہیں کیونکہ "دونوں کی بنیاد ایک ہے، دونوں کی ایک ہی قواعد اور عام الفاظ کا ذخیرہ بھی ایک ہی ہے۔" ہندستانی والے علاقوں میں ہندی اور اردو کو الگ الگ خطوط پر فروغ دیے جانے کے رجحان کو بھی وہ کوئی خطرہ نہیں تصور کرتے کیونکہ دونوں کا فروغ ہماری زبان کو مالا مال کرے گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے قومی شعور بیدار ہوگا اور تعلیم عام ہوگی یہ معاملہ بھی خود

بخود سمجھ جائے گا۔ پنڈت نہرو کے مطابق "بیسک انگلش" کے طرز پر "بیسک ہندستانی" وضع کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک آسان زبان ہونی چاہیے جس میں صرف ایک ہزار کے قریب الفاظ ہوں اور قواعد بھی بہت مختصر ہو۔ اس "بیسک ہندستانی" کو عام گفتگو اور تحریر کا معقول ذریعہ ہونا چاہیے۔ اس سے قطع نظر ہندستانی میں استعمال کرنے کے لیے سائنسی، تکنیکی، سیاسی اور تجارتی اصطلاحات کی وسیع تر فہرستیں مرتب کرکے انھیں مقبول بنایا جانا چاہیے۔ دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ قومی زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں اور بولیوں کو بھی ترقی کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے اور پرائمری سے یونیورسٹی سطح تک صوبائی زبان میں تعلیم دی جانی چاہیے۔ غیر ہندستانی، علاقوں میں قومی زبان کی تعلیم صرف ثانوی سطح پر دی جانی چاہیے یونیورسٹیوں میں ہندستانی اور ایک غیر ملکی زبان کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال ہے کہ اس وقت بھی اس دوری کو جو ہندی اور اردو میں پیدا کردی گئی ہے، بہت حد تک کم کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ مصنفین درباری اور مصنوعی زبان سے گریز کریں اور عوام کے لیے اور عوامی مسائل پر آسان زبان میں اپنی تخلیقات پیش کریں۔

بابو راجندر پرساد کا خیال ہے کہ قومی زبان کے طور پر ہندستانی کو فروغ دینے اور ہندی اردو تنازعے کو ختم کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی تقریروں اور تحریروں میں عربی اور فارسی کے وہ تمام الفاظ شامل کریں جنھیں ہندی کے اچھے ادیب استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح ہندی کے وہ تمام الفاظ شامل کریں جنھیں اردو کے اچھے ادیب استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک قواعد کا تعلق ہے ہندی اور اردو ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ صرف لفظیات کے اعتبار سے ان میں فرق ہے۔ "لہٰذا اگر دونوں کے ذریعے استعمال کیے جانے والے الفاظ کو وسیع پیانے پر قبول کرلیا جاتا ہے اور ایک مشترکہ ذریعۂ اظہار کو اپنا لیا جاتا ہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ مجموعی ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوگا بلکہ یہ بھی ممکن ہو سکے گا کہ اظہار کے لیے خوبصورت اور نرم ونازک معانی کے نئے دروازے

واہو جائیں گے"۔ اس مقصد کے لیے ایک معیاری فرہنگ ترتیب دینے کی بھی ان کی تجویز ہے جس میں سنسکرت، فارسی اور عربی کے ان تمام الفاظ کے معانی دیے جائیں جنھیں ہندی اور اردو کے ادیب عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بابو راجندر پرساد اس خیال کے حامی ہیں کہ اگر ہندستانی کو ایک حقیقی قومی زبان کے طور پر فروغ پانا ہے تو بنیادی طور پر اسے اپنی غذا اس روزمرّہ کی زبان سے حاصل کرنا ہوگی جو عام آدمیوں کے گھروں میں بولی جاتی ہے۔

بابو پرشوتم داس ٹنڈن کا خیال یہ ہے کہ ہندستان کی تحریکِ آزادی کا مفاد اس میں ہے کہ انگریزی کو لازمی طور پر قومی اور بین صوبائی سطح پر خارج کر دیا جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندستان کے حقیقی وقار کی بحالی پر اصرار کیا جائے اور یہ کام بطورِ خاص اُس زبان کے ذریعے انجام دیا جائے جسے تقریباً پچیس کروڑ ہندستانی سمجھتے ہیں اور جسے ہندی، اردو یا ہندستانی جیسے کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قومی زبان کے لیے جو نام زیادہ موزوں ہے وہ ہندی ہے کیونکہ "اس کے رابطہ پرانے اور خوشگوار ہیں اور یہ ہندو اور مسلم تہذیبوں کے امتزاج کی علامت ہے" اس کے علاوہ لفظ ہندی کے پیچھے وہ عظیم روایات پوشیدہ ہیں جو عظیم ادبی کارناموں کی دین ہیں اور یہ کارنامے صرف ہندو مصنفین کے نہیں بلکہ خسرو، کبیر، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خان خاناں، انیس، رس کھان اور دوسرے بہت سے مشہور و معروف مسلمان مصنفین کے بھی ہیں۔ جہاں تک قومی زبان کی شکل اور رسم خط کا سوال ہے، بابو پرشوتم داس یہ اصول تجویز کرتے ہیں "وہ زبان اور رسم خط استعمال کیجیے جس میں ان لوگوں کو کوئی پیچیدگی نہ ہو جنھیں آپ مخاطب کر رہے ہیں۔" تاہم ان کا خیال ہے کہ "ناگری رسم خط اردو رسم خط کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ کہیں زیادہ آسان اور فطری ہے بلکہ ہندستانی زبانوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل ان کا خیال ہے کہ "ناگری رسم خط جتنے بڑے پیمانے پر ہندستان میں سمجھا جاتا ہے اتنے بڑے پیمانے پر کوئی اور رسم خط نہیں سمجھا جاتا"۔ لہٰذا بہتر مشورہ یہ ہوگا کہ اسی کو قومی رسم خط بنایا جائے۔ اردو رسم خط کو بھی جس کی شمالی ہند کے مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت ہے، باقی رکھا

جائے۔ مثال میں ناگری کے ساتھ ساتھ اسے بھی تسلیم کیا جائے۔ بابو پرشوتم داس زبان کے مسئلے پر معقولیت پسندی کا رویہ اختیار کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔ وہ مستقبل سے پُر امید ہیں اور انھیں نہ صرف ہندی اور اردو کے درمیان بلکہ ہندو اور مسلمان تہذیبوں کے درمیان بھی مکمل ہم آہنگی کا نقشہ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ہندستانی کو ایک ایسی زبان قرار دیتے ہیں جس کا استعمال شمالی ہند میں عام ہے اور جسے لاکھوں ہندو اور مسلمان یکساں طور پر بولتے ہیں۔ اسے ہندی اور اردو بولنے والے اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ اس میں عربی اور فارسی حتیٰ کہ ترکی، پرتگالی اور انگریزی کے الفاظ بھی شامل ہیں اور ان تمام الفاظ کو اس نے اپنے اندر جذب کر کے اپنا بنالیا ہے۔

زبان کو "خالص" بنانے کے جنون نے ہندی اور اردو کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ گویا جب لوگوں نے "عربی اور فارسی کے الفاظ کو قبول نہ کرنے کی قسمیں کھانا شروع کیں اور عام زبان میں سنسکرت مترادفات کو داخل کرنا شروع کیا تبھی سے اس مشترکہ زبان کا زوال شروع ہوا۔ کچھ لوگ خالص ہندی لکھنے لگے اور کچھ لوگ عربی اور فارسی کے محاوروں سے زبان کو بوجھل بنانے لگے "ڈاکٹر ذاکر حسین کا خیال ہے کہ اس معاملے میں اردو ادیبوں کے مقابلے میں ہندی ادیب زیادہ قصور وار ہیں کیونکہ جو لوگ اردو بولتے ہیں وہ کوشش کے باوجود ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ وہ اس لڑائی میں جو ابھی ابھی شروع ہوئی ہے، صدیوں کے کارناموں کو ایک دم برباد نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان کا ڈھانچہ ہندستانی ہے قواعد ہندستانی ہے اور انھوں نے کبھی بھی اس بنیاد پر کسی لفظ سے نفرت نہیں کی کہ وہ "ملیچھ" ہے یا "کافر"۔ پھر بھی جوابی کارروائی کے طور پر یا پھر کسی اور مقصد کے تحت انھوں نے اپنی زبان میں عربی اور فارسی کے چھنٹے ہوئے غیر مانوس الفاظ کی "رنگ آمیزی" شروع کر دی۔ وہ عربی اور فارسی الفاظ کو ہندستانی سے خارج کرنے کی کوششوں کو محض ایک جنون قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان عناصر کو ناپاک اور گردن

زرنی تصور کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے باہمی اشتراک و تعاون کے نتیجے میں وجود میں آئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ مشترکہ زبان کے لیے الفاظ کا انتخاب کرتے وقت ماخذ سے قطعی کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی یہ بھی تجویز ہے کہ ہندستانی کو فروغ دینے کے لیے جس نئے ذخیرۂ الفاظ کی ضرورت ہے اس کے لیے پہلے مرحلے میں ہمیں گاؤوں کی زبانوں اور بولیوں کے الفاظ آزادانہ طور پر استعمال کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد ان اصطلاحات پر غور کرنا چاہیے جنھیں ہمارے کاریگروں اور کامگاروں نے ایجاد کیا ہے۔ اور آخر میں ہمیں ان غیر ملکی ناموں اور اصطلاحات پر نظر دوڑانا ہوگی جنھیں ہماری زبان آسانی سے جذب کر سکتی ہے۔ نئے ذخیرۂ الفاظ میں اگر ہندی اور اردو کے ادیب آپس میں اشتراک کریں تو ایسی کوئی وجہ نہیں کہ ہم مستقبل قریب میں ایک مشترکہ زبان وضع کرنے کے اہل نہ ہو سکیں۔

کاکا کالیلکر محسوس کرتے ہیں کہ قومی زبان کا مسئلہ شاید ان لوگوں کے ذریعے حل ہوگا جن کی مادری زبان نہ ہندی ہے اور نہ اردو۔ وہ ان روابط کی اہمیت پر زور دیتے ہیں جو زبان کو عوام کے مذہب، تہذیب اور سیاست سے جوڑ دیتے ہیں۔ ان کے مطابق ہندستانی مسلمان عمومی طور پر اردو کو اسلامی تہذیب کی ایک علامت تصور کرتے ہیں۔ دوسری طرف سنسکرت ہندوؤں کی مذہبی زبان ہے اور ہندستان کی تمام زبانوں کا منبع ہونے کی وجہ سے اسے "ہندستان کی وحدت کی شاندار علامت سمجھا جاتا ہے"۔ اردو چونکہ سنسکرت سے دور سے دور تر ہوتی گئی اس لیے دوسری ہندستانی زبانوں سے اس نے اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیا۔ ایک مشترکہ زبان کے ارتقائی عمل کے نقطۂ نظر سے یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ ہندستانی، ہندی اور اردو کے اختلاط سے ہی جنم لے سکتی ہے اور شروع میں آسان ہندی اور آسان اردو کو ہندستانی کہا جائے گا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب تعلیم عام ہوگی اور قومی کلچر کو فروغ حاصل ہوگا تو بڑی تعداد میں الفاظ اور محاورے سنسکرت، عربی، اور فارسی جیسی کلاسیکی زبانوں سے ہندستانی میں شامل ہوتے جائیں گے اور اسے زیادہ

مالدار اور کشادہ بنائیں گے۔ اس طرح جو قومی زبان وجود میں آئے گی وہ پنڈتوں اور مولویوں کی مصنوعی زبان نہیں ہوگی بلکہ صحیح معنوں میں عام آدمیوں کی فکر، ان کی خواہشات اور ولولوں کے اظہار کا ذریعہ ہوگی۔ اس صورت میں وہ دوسری زبانوں سے ہر وہ چیز لے گی جس کی اسے ضرورت پیش آئے گی اور ہر اس چیز کو ترک کر دے گی جو غیر ضروری محسوس ہوگی۔ قدرتی طور پر وہ ان الفاظ کو بڑے پیمانے پر قبول کرے گی جو ملک بھر میں آسانی سے سمجھے اور استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا سلیمان ندوی اس بات کے قائل ہیں کہ نہ تو موجودہ سنسکرت آمیز ہندی اور نہ ہی عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے بوجھل اردو ممکنہ قومی زبان بن سکتی ہے۔ وہ اردو اور ہندی دونوں کو آسان بنانے کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندستانی کا تصور آسان اردو ہے جس میں ان سنسکرت الفاظ کی آمیزش ہو جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

بابو سمپورنانند کا خیال ہے کہ شمالی ہند کے تعلیم یافتہ اور شائستہ حلقے میں جو زبان رائج ہے، وہی قومی زبان بنائے جانے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ وہ ہندی اور اردو کو الگ الگ زبانیں نہیں مانتے کیونکہ ان کے افعال، ضمائر اور حرف ربط وغیرہ ایک ہی ہیں۔ دراصل یہ ایک ہی زبان کے دو اسلوب ہیں۔ لیکن قومی زبان کے لیے اردو کا نام مناسب نہیں ہوگا۔ ہندی یا ہندستانی زیادہ مناسب اصطلاحیں ہیں۔ جہاں تک قومی زبان کے خد وخال کا تعلق ہے، بابو سمپورنانند اس بات کے پورے طور پر قائل ہیں کہ جب ہندستانی کو مزید فروغ حاصل ہوگا تو یقینی طور پر اس میں سنسکرت کے عناصر زیادہ شامل ہوں گے۔ کلیتاً اردو تحریر وسیع پیمانے پر عوام کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں ایسی تلمیحات، استعارات اور تشبیہات کی بھرمار ہوتی ہے جن کے ماخذ غیر ہندستانی ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں —— ''میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ ہمارے جیسے ملک میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ایسی زبانیں بولتے ہیں جن کا ماخذ سنسکرت ہے یا جن کی تہذیبی لفظیات میں سنسکرت کے الفاظ بہت بڑی تعداد میں ہیں' وہاں

زبان کا وہی ادبی اسلوب زیادہ شاندار ہوگا جس میں سنسکرت کے 'تدبھو' اور 'تتسم' الفاظ شامل ہوں گے۔ یہی اسلوب ان لوگوں کے لیے آسانی سے قابل قبول ہوگا جن کی مادری زبان ہندستانی نہیں ہے اور صرف اسی اسلوب میں وہ زیادہ بہتر طور پر اپنی خدمات پیش کر سکیں گے لیکن اس سے عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔"

ڈاکٹر تاراچند کی دلیل یہ ہے کہ ہندی اردو اور ہندستانی۔ یہ تینوں نام، ایک ہی زبان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کیونکہ تینوں کی آوازوں کا نظام ایک جیسا ہے اور ان کی قواعد بھی کم و بیش ایک ہی ہے۔ جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے ایسے لا تعداد اصل الفاظ ہیں (خاص طور سے افعال، ضمائر، حرفِ ربط، حرفِ عطف اور حرفِ ندا وغیرہ) جو ان سب میں مشترک ہیں۔ یہی چیز قومی زبان یعنی ہندستانی کے لیے آوازوں کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یہ زبان مصنوعی طور پر نہیں وضع کی گئی ہے بلکہ اس کی تاریخ کوئی ایک ہزار سال پر محیط ہے۔ جدید ہندی اور اردو محض ہندستانی کے دو اسلوب ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند ہندی اور اردو کے درمیان حائل فاصلے کو مٹانے کے لیے کچھ عملی اقدام کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کی تجویز ہے کہ اردو بولنے والوں کی، جدید ہندی سیکھنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ اسی طرح ہندی بولنے والوں کو اردو کا اطمینان بخش علم حاصل کرنا چاہیے۔ اردو اور ہندی کے ادیب جو الفاظ استعمال کرتے ہیں ان کی ایک اچھی فرہنگ ترتیب دی جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ مشترکہ تکنیکی اصطلاحات کی بھی ایک ڈکشنری ہونی چاہیے۔ ہندی اور اردو کے صوتی اور صوریاتی نظام نیز ان کی ترکیب بندی کے اصولوں سے متعلق ایک جدید قواعد نئے ڈھنگ سے ترتیب دی جانی چاہیے۔ آسان ہندی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب شائع کر کے اسے مقبولِ عام بنانا چاہیے۔ اگر یہ سب کچھ ہوتا ہے اور سائنسی اور تکنیکی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ کے سلسلے میں ہندی اور اردو ادیبوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو زبان کا مسئلہ آسانی سے سلجھایا جا سکتا ہے۔

مسٹر آصف علی آج کے دور کے کچھ اردو مصنفین کے طرز تحریر کو اردو کے زوال کی ایک بدترین مثال مانتے ہیں کہ ان کی زبان فارسی ہوتی ہے، صرف افعال اردو کے ہوتے ہیں۔ وہ مشکل اور حد درجہ سنسکرت آمیز ہندی کے بھی اتنے ہی بڑے مخالف ہیں۔ ہندستانی کا ان کا تصور یہ ہے کہ یہ زبان آسان اردو کے قریب ہو۔

مسٹر کے ایم منشی کا ماننا ہے کہ اردو کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ہندی نام کی ایک زبان، جس کا ذخیرہ الفاظ سنسکرت عناصر سے لبریز تھا، ادب کی زبان بن چکی تھی اور اسے بہت سے مسلمان ادیبوں نے مالا مال کیا تھا۔ اردو بعد میں ارتقا پذیر ہوئی اور اس کا جنم اس ہندی کے بطن سے ہوا جو مغل شہنشاہوں کی فوج میں بولی جاتی تھی۔ وہ آج کی ہندی اور اردو کو دو الگ الگ زبانیں نہیں مانتے لیکن وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دونوں اسلوب دو مخصوص ادبی دھاروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ صوبۂ متحدہ (یوپی) میں سماجی سطح پر ہندستانی عام رابطے کی زبان تو ہو سکتی ہے لیکن ابھی یہ اتنی مستحکم نہیں ہو سکی ہے کہ ادب کی زبان بن سکے۔ یوپی کی ہندستانی کو شعوری کوشش کے ذریعے ادبی زبان بنایا جاسکتا ہے اگرچہ ہندستانی کو ملک کی اکثریت کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ سنسکرت کے عناصر میں کسی حد تک اضافہ کیا جائے۔ اگر ہندی اور اردو کی تخلیقات کو زیادہ بڑے پیمانے پر ترجمہ کیا جائے اور ایک دوسرے میں ڈھالا جائے اور اردو اور ہندی کے ادیب بہترین اور مقبول عام الفاظ کو بغیر کسی تعصّب کے استعمال کریں تو اس کام کو قابل ذکر حد تک آسان بنایا جاسکتا ہے۔ مسٹر منشی دیوناگری رسم خط کے بہت بڑے حامی ہیں۔

مسٹر راج گوپال آچاریہ قومی زبان کے لیے ہندی یا اردو کے مقابلے میں ہندستانی کا نام دینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات کے خلاف ہیں کہ قومی زبان سے کسی بھی لفظ کو اس بنیاد پر خارج کر دیا جائے کہ وہ بیرونی یا غیر ہندستانی ہے۔ جیسا کہ ان کا خیال ہے کہ "وہ تمام الفاظ جو فارسی اور عربی سے لیے گئے وہ تمام الفاظ جو سنسکرت سے اخذ کیے گئے اور وہ تمام الفاظ جنھیں ڈکشنریوں میں اصل ہندی قرار دیا گیا ہے، زبان کو مالدار بنانے کے لیے ضروری

ہیں"۔ اگر چہ وہ دیوناگری رسم خط کو اردو رسم خط پر فوقیت دیتے ہیں لیکن قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے وہ چاہتے ہیں کہ دونوں کو مروجہ اور سرکاری حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔

خواجہ غلام السیدین کا خیال ہے کہ "کسی بھی ایسی زبان کے مشترکہ زبان بننے کا معمولی امکان بھی موجود نہیں ہے جو دو اہم فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی ارتباط کے نتیجے میں پیدا نہ ہوئی ہو اور جس کی دونوں نے بھرپور آبیاری نہ کی ہو۔" ان کا خیال ہے کہ ہندستانی ان دونوں شرطوں کو پورا کرتی ہے۔ حد درجہ سنسکرت آمیز موجودہ ہندی ہماری قومی زبان نہیں بن سکتی۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ کہیں بھی عوام کا بہت بڑا طبقہ اسے نہیں بولتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ہندو مسلم اشتراک کی پیداوار نہیں ہے۔ اسی طرح حد درجہ فارسی آمیز یا عربی آمیز اردو بھی اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ اصل ہندستانی جو ہماری قومی بولی کا نچوڑ ہے "ابتدائی دور کی ہندی کے کافی قریب اور آسان اردو کے قریب تر ہے"۔ سیاسی زندگی ناگزیر طور پر جب تنوع اور جمہوریت پسندی سے آشنا ہوگی تو ہندستانی قدرتی طور پر اہمیت حاصل کرے گی اور فروغ پائے گی کہ اس طور پر وہ "اس عظیم ملک کے شیرازے کو مربوط کرنے کا باعث بنے گی"۔ ہندی اور اردو ہندستانی کے ہاتھوں ناپید نہیں ہو جائیں گی بلکہ در حقیقت ان کا دائرۂ کار شعر و ادب تک محدود رہے گا۔

پنڈت سمترانندن پنت مشترکہ زبان کے قائل تو ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ اس وقت اس مسئلے کو اٹھانا قبل از وقت ہوگا۔ ان کے مطابق "لسانی یکجہتی کا مسئلہ تہذیبی یکجہتی کے وسیع تر مسئلے کا ایک حصہ ہے۔" اور جب تک کہ موخر الذکر مسئلہ حل نہیں ہو جاتا اس وقت تک اول الذکر پر قابو پانے میں مشکلات پیدا ہوتی رہیں گی۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی کے درمیان جو ٹکراؤ ہے وہ حقیقی اور سنگین نوعیت کا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندستانی ابھی غیر ترقی یافتہ بولی ہے۔ ان حالات میں انھیں یہ بات مشکوک نظر آتی ہے کہ مشترکہ قومی زبان بنانے کی کوششیں بار آور ثابت ہوں گی۔ چنانچہ ان کی تجویز ہے کہ اس وقت عارضی طور پر قومی

زبان کا خیال دل سے نکال دیں اور اس کی بجائے مقامی زبانوں اور بولیوں کو فروغ دینے اور انھیں مالامال کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہمارا مقصد عوام کو باشعور بنانا اور صحیح سمت رہنمائی کرنا ہے۔ اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے ممکنہ حد تک آسان ترین طریقہ اختیار کرنا ہے اور اس کے لیے اس زبان کو وسیلہ بنانا ہے جو ان کے بہت قریب ہے یعنی ان کی مادری زبان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انھیں جد وجہد آزادی کے لیے تیار کیا جائے۔ ایک مشترکہ زبان کو فروغ دے کر ہندستان کے کروڑوں ناخواندہ عوام تک پہنچنے کے لیے اچھا خاصا وقت درکار ہوگا۔ ظاہر ہے اتنی مدت تک ہم آزادی کا انتظار نہیں کر سکتے اور ایک بار جب آپ کو آزادی مل گئی تو زبان کے مسئلے پر تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔" ڈاکٹر تاثیر کا خیال ہے کہ ہندستان کی مختلف زبانوں اور متنوع کلچر کے مسئلے کو بالآخر یو ایس ایس آر (یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک) کے خطوط پر سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔

ڈاکٹر پٹھبی سیتار میا کا کہنا ہے کہ زبان کے مسئلے کو اب صرف شمالی ہند تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ اس معاملے میں جنوبی ہند کے لوگ بھی کچھ کہنے کے دعویدار ہیں، ہندی یا ہندستانی کا قومی زبان بننا اب کسی بھی تنازعے سے بالاتر ہے۔ اس قومی زبان کو ہمہ گیر طور پر مقبول بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ "بنیادی الفاظ کے علاوہ کم از کم ایسے ایک ہزار الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی جائے جو دونوں حلقوں کی کلاسیکی زبانوں سے تعلق رکھتے ہوں اور ہندو اور مسلمان دونوں لازمی طور پر انھیں سیکھیں کیونکہ آدھے آدھے الفاظ دونوں کے لیے اجنبی ہیں"۔

پروفیسر ہمایوں کبیر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قومی زبان وضع کرنے کے لیے ایک مشترکہ رسم خط کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندی اور اردو کے سوال پر جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں ان میں سے بیشتر اس صورت میں ختم ہوسکتی ہیں اگر ہم اب سے دونوں زبانیں ایک ہی رسم خط میں لکھنا شروع کردیں۔ وہ اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ

قومی اور بین صوبائی مقاصد کے لیے فوری طور پر رومن رسم خط کو اپنا لیا جائے۔

ڈاکٹر بھگوان داس کی رائے ہے کہ "ہندستانی کو ایک بالکل نئی زبان کے طور پر فروغ دینا ضروری ہے اور اس صورت میں اردو اور ہندی کے تقریباً تمام عناصر کو تو شامل کرنا ہی چاہیے لیکن ساتھ ہی بعض دوسری زبانوں بالخصوص انگریزی کے بھی کچھ الفاظ شامل کیے جانے چاہئیں"۔

اس سمپوزیم کے لیے مقالے لکھنے والوں کے نقطۂ نظر پر مبنی مندرجہ بالا جائزے سے قارئین کو زبان کے مسئلے سے متعلق مختلف آرا سے واقفیت ہو سکے گی۔ یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ متعدد متضاد آرا کے باعث یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ پھر بھی اگر ہم اس مسئلے کو اطمینان بخش طور پر حل کرنا چاہتے ہیں تو ہر نقطۂ نظر کا غیر جذباتی طور پر صبر و سکون سے جائزہ لینا ہوگا۔ سونا بہر حال سونا ہے نمائشی ٹرک بھڑک کو اس سے علاحدہ کرنا ہی پڑے گا۔ اگر یہ کتاب غور و فکر کے لیے قارئین کو کچھ مواد فراہم کرتی ہے اور ان میں سے کچھ کو بھی اس بات کے لیے اکساتی ہے کہ وہ مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے صورت حال کا جامع اور سائنسی انداز سے جائزہ لیں تو اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری نے از روئے عنایت زبان کے مسئلے پر پنڈت جواہر لال نہرو کے مضمون کو یہاں دوبارہ شائع کرنے کے لیے مجھے اجازت دی۔ میں آل انڈیا ریڈیو کا شکر گزار ہوں کہ اس نے بابو راجندر پر ساد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے مضامین شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ مسٹر کے ایم منشی کا مضمون ان کی کتاب "آئی فالو دی مہاتما" (الائیڈ پبلشرز اینڈ اسٹیشنری مینو فیکچرز بمبئی) سے لیا گیا ہے اور اس کے لیے مصنف اور پبلشر سے اجازت لے لی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر میں ان لوگوں کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے اس سمپوزیم کے لیے گرانقدر مقالے تحریر کیے۔

زیڈ اے احمد

الہ آباد 3/ نومبر 1940ء

مہاتما گاندھی

ہمارے زمانے کی ہندستانی تہذیب تشکیل کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ان تمام تہذیبوں کا ایک آمیزہ بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں جو آج ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتی ہیں۔ وہ تہذیب جو اپنے آپ کو سب سے الگ رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ہندستان میں آج خالص آریائی تہذیب نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ آریائی، ہندستان کے اصل باشندے تھے یا ناپسندیدہ درانداز، مجھے دلچسپی اس حقیقت سے ہے کہ ہمارے اجداد کا میل جول ایک دوسرے سے انتہائی آزادانہ طور پر ہوا اور ہم موجودہ نسل کے لوگ اسی آمیزش کے مرہون منت ہیں۔ اس سوال کا جواب تو مستقبل ہی دے گا کہ ہم اپنی جنم بھومی اور اس چھوٹے سے کرۂ ارض کے بھلے کے لیے کچھ کر رہے ہیں جس نے ہمیں سنبھال رکھا ہے یا یہ کہ ہم محض ایک بوجھ ہیں۔

ہندستانی

میں شروع ہی میں اپنی بات کہوں گا:

گذشتہ کئی برسوں سے کانگریس اس بات کی وکالت کرتی رہی ہے کہ مشترکہ سیاسی ولولوں کے شانہ بشانہ ایک مشترکہ زبان بھی ضروری ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس بات نے ایک ایسا رخ اختیار کیا کہ جا دبے جا قسم کے مباحث میں عوامی مقررین ملوث ہوگئے۔ لیکن یہ بات میرے علم میں ہے کہ اردو کے ادبی حلقوں میں اس نے سادگی اور اپنائیت کا ایک معیار قائم کیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی جیسے عالم نے بھی، جنھوں نے اپنی پوری زندگی عربی کتابوں کے مطالعے میں صرف کی ہے اور جن کا

سابقہ ایسے مضامین و موضوعات سے متعلق لفظیات سے رہا ہے جن میں لغزش کے بغیر ترمیم کی گنجائش پیدا ہی نہیں ہو سکتی، اپنی زبان کو آسان اور ہندستانی عناصر کا آئینہ دار بنانے کی دلی خواہش کا اظہار کیا ہے کیونکہ مشترکہ ہندستانی زبان کا تصور انھیں بے حد عزیز ہے۔

اس مشترکہ زبان کو کانگریس کے حلقوں نے "ہندستانی" کا نام دیا ہے۔ اگرچہ اس نام کے سوال پر کانگریس اردو اور ہندی کے حامیوں کے ساتھ قطعی مفاہمت کی منزل تک نہیں پہنچ سکی ہے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اپنی وابستگیوں کی وجہ سے نام، سیاسی اور سماجی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا ہماری مشترکہ قومی زبان کو جو نام دیا جانا ہے وہ اس زاویے سے بہت اہم کام ہے۔ ابھی تک اردو وہ واحد زبان رہی ہے جو کسی صوبے یا فرقے تک محدود نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ پورے ہندستان میں بولی جاتی ہے اور شمالی ہند میں اردو بولنے والے ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اگر ہماری مشترکہ زبان اردو نہیں کہلا سکتی تو کم از کم ایک ایسا نام تو اس کا ہونا ہی چاہیے جس سے اندازہ ہو کہ اس زبان کو وضع کرنے میں مسلمانوں کا بھی خاص حصہ ہے اور یہ کم و بیش مشترکہ عناصر کی حامل ہے۔ لفظ "ہندستانی" یہ شرط پوری کر سکتا ہے "ہندی" نہیں۔ ماضی میں مسلمانوں نے اسے پڑھا اور اسے ادبی زبان کا درجہ دلانے میں ان کی خدمات اگر اپنے ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اس سے کچھ مذہبی اور تہذیبی وابستگیاں بھی ہیں اس لیے مسلمان مجموعی طور پر اسے اپنی شناخت نہیں بنا سکتے۔ اس کے علاوہ اب جو یہ اپنا ذخیرہ الفاظ وضع کر رہی ہے وہ خصوصی طور پر اس کا اپنا ہے اور عام طور پر ان لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا جو صرف اردو جانتے ہیں۔ اس نقطے پر زور دینا یہاں ضروری نہ ہوتا اگر ہندی اور ہندستانی کے درمیان الجھاؤ پیدا کرنے کا رجحان پروان نہ چڑھتا۔ اردو اور ہندستانی کے درمیان کوئی الجھاؤ نہیں ہوا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ تکنیکی اصطلاحات کے اعتبار سے عربی اور سنسکرت دونوں طاقتور زبانیں ہیں لیکن ایک مشترکہ ہندستانی زبان کا انحصار خصوصی طور پر ان میں

سے کسی ایک پر نہیں ہو سکتا کیونکہ عربی اگر ایک غیر ملکی زبان ہے تو سنسکرت بھی عام طور پر کبھی نہیں بولی گئی اور کوئی بھی شخص اگر عام بول چال کی ہندی سیکھنا چاہے تو اسے اندازہ ہوگا کہ اس میں سنسکرت کے جو الفاظ ہیں ان میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں کیونکہ ان کا تلفظ نہ صرف یہ کہ مسلمان آسانی سے ادا نہیں کر سکتے بلکہ ہندستان کے عام آدمیوں کو بھی دشواری پیش آئے گی۔ یہاں تک کہ بعض چھوٹے موٹے الفاظ مثلاً "گرام" اور "ورش" بھی "گاؤں" اور "برس" بن گئے ہیں۔ ہندی کے بہت سے حامی ان حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں کیوں کہ انھوں نے اس طرح کے بہت سارے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے اصل الفاظ داخل کر دیے ہیں۔ اب اسے علمیت بگھارنا کہا جائے، لاعلمی سے تعبیر کیا جائے یا تعصب کا نام دیا جائے، کیونکہ جہاں تک اردو کا سوال ہے اس نے سنسکرت کے بول چال کے تمام تر الفاظ کو اپنا لیا ہے۔ یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہندی کے ان دوستوں کو زندہ بول چال کی زبان کے فروغ سے براہ راست کوئی تعلق یا دلچسپی نہیں ہے۔ انھیں زیادہ دلچسپی ہندستانی معاشرت پر آریائی رنگ چڑھانے سے ہے۔ اگر ہندو بھائی اصلاح یا ردعمل کے لیے اپنے درمیان کام کریں تو یہ مسلمانوں کے لیے کسی طرح کی تشویش کا باعث نہیں بنے گا لیکن مشترکہ ایمانداری کا تقاضہ ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کو سختی سے لسانی مسائل سے دور رکھا جائے۔

عادل صاحب کے ایک خط کے جواب میں کے ایم منشی کہتے ہیں کہ گجراتیوں، مراٹھیوں، بنگالیوں اور کیرالا والوں نے "ایسی تحریری روایات کو فروغ دیا ہے جن میں خالص اردو عناصر تقریباً ناپید ہیں۔ اگر اسی طور پر ہم ہندی کو فروغ دیں تو ہمیں سنسکرت آمیز ہندی کا سہارا لینا پڑے گا۔" پہلی بات تو میں یہاں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ گجراتی، مراٹھی اور بنگالی میں فارسی کے الفاظ کی تعداد قابل ذکر ہے اور میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ گجرات اور بنگال کے ہندوؤں کو ایک دوسرے کے اور مسلمانوں کے قریب

آنے کے لیے اپنی زبان کو لازمی طور پر سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں " خالص اردو عناصر " سے کوئی سروکار نہیں بلکہ ہم شمالی ہند کی رائج اور زندہ زبان اور محاوروں کی بات کر رہے ہیں۔ اگر اس زندہ زبان کو ہم مشترکہ زبان کی اساس بناتے ہیں تو مسلمان اس میں بھرپور تعاون کریں گے۔ اس کے بجائے اگر سنسکرت کی جانب مراجعت کی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے ہندی بنگالی اور گجراتی زبانوں کی ماضی میں جو خدمت کی ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر اس طرح کی کوشش میں ہم سے تعاون مانگا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم سے خود اپنی خودکشی کی تدبیر کرنے کو کہا جا رہا ہے۔

میں ذیل میں ایسے کچھ نکات کی نشاندہی کر رہا ہوں جو میری ناچیز رائے میں خاصی معقولیت پسندی پر مبنی ہیں اور قومی زبان کے فروغ کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ وہ نکات یہ ہیں ——

(1) ہماری مشترکہ زبان " ہندستانی " کہلائے گی نہ کہ " ہندی "۔

(2) ہندستانی کو کسی بھی فرقے کی مذہبی روایات سے وابستہ نہیں تصور کیا جائے گا۔

(3) کسی بھی لفظ کے لیے " غیر ملکی " یا " دیسی " جیسی اصطلاح استعمال نہیں کی جائے گی بلکہ ہر لفظ کو مروجہ تصور کیا جائے گا۔

(4) ان تمام الفاظ کو جو اردو کے ہندو ادیب اور ہندی کے مسلمان ادیب استعمال کرتے ہیں، مروج تصور کیا جائے گا لیکن اس کا اطلاق اردو اور ہندی زبانوں کی مخصوص شکلوں پر نہیں ہوگا۔

(5) تکنیکی اصطلاحوں، خاص طور سے سیاسی اصطلاحات کا انتخاب کرتے وقت نئی سنسکرت اصطلاحوں کو ترجیح نہیں دی جانی چاہیے بلکہ ممکنہ حد تک اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ اردو ہندی اور سنسکرت کی قدرتی اور رائج اصطلاحات کو بروئے کار لایا جائے۔

(6) دیوناگری اور عربی دونوں رسم خط کو مروج اور سرکاری تصور کیا جانا چاہیے نیز یہ کہ ان تمام اداروں میں، جن کی پالیسی ہندستانی کو فروغ دینے والے سرکاری حلقے طے کریں گے، دونوں رسم خط سیکھنے کی سہولیات مہیا کی جانی چاہئیں۔

ہندی۔اردو تنازعہ

یہ بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ ہندی اور اردو کے سوال پر ایک تلخ قسم کا تنازعہ پیدا ہو گیا ہے اور اب بھی برقرار ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے، ہندستانی اس کی تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے جسے کل ہند زبان کے طور پر بین صوبائی رابطوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ صوبائی زبانوں کو نکال باہر نہیں کرے گی بلکہ ان کی معاونت کرے گی۔ ورکنگ کمیٹی کی حالیہ قرارداد سے تمام شبہات دور ہو جانے چاہئیں۔ اگر کانگریس کے وہ رکن جو کل ہند پیمانے پر کام کر رہے ہیں دونوں رسم خط میں ہندستانی سیکھنے کی زحمت گوارا کریں تو ہم بہت ساری رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اپنی مشترکہ زبان کی منزل کی جانب کامیابی سے قدم بڑھا سکیں گے۔ اصل مقابلہ ہندی اور اردو میں نہیں بلکہ ہندستانی اور انگریزی میں ہے۔ یہ لڑائی بڑی شدید ہے اور میں یقیناً بڑی گہری تشویش کے ساتھ اس کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔

ہندی اردو تنازعے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ کانگریس کے تصور والی ہندستانی کی شکل ابھی طے نہیں ہو پائی ہے۔ یہ کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ کانگریس اپنی تمام تر کارروائیوں میں خصوصی طور پر ہندستانی کا استعمال نہیں کرتی۔ کانگریس کو چاہیے کہ اپنے اراکین کے استعمال کے لیے لغات مہیا کرے۔ ایک ایسا شعبہ بھی ہونا چاہیے جس کے ذمے لغت سے باہر کے نئے الفاظ فراہم کرنے کا کام ہو۔ یہ بہت اہم کام ہے۔ یہ کام اس لائق ہے کہ اس پر محنت صرف کی جائے بشرطیکہ ہم حقیقتاً ایک زندہ اور فروغ پذیر ملک گیر زبان کے خواہاں ہیں۔ مجوزہ شعبہ اس بات کو طے کرے گا کہ موجودہ ادب کے کس حصے کو

ہندستانی تصور کیا جائے اور ہندستانی کے تحت کن کتابوں، رسائل، ہفتہ وار اور روزناموں کا احاطہ کیا جائے، خواہ وہ دیوناگری رسم خط میں ہوں یا اردو رسم خط میں۔ یہ ایک سنجیدہ کام ہے اور اگر ہمیں اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو سخت محنت کی ضرورت پیش آئے گی۔

ہندستانی کی شکل متعین کرتے وقت ہندی اور اردو کو منبع تصور کیا جا سکتا ہے جہاں سے اسے خوراک حاصل ہوگی اسی لیے ہر کانگریسی کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ دونوں سے گہرا تعلق رکھے اور جس حد تک ممکن ہو دونوں زبانوں سے رابطہ قائم رکھے۔

اس ہندستانی کے پاس ایسے بہت سے متبادل الفاظ اور محاورے ہونگے جو صوبائی زبانوں سے مالا مال اس ملک کی متنوع ضرورتیات پوری کریں گے۔ بنگالی اور جنوبی ہند کے عوام کے سامنے جو ہندستانی بولی جائے گی اس میں قدرتی طور پر سنسکرت اصل کے الفاظ زیادہ ہوں گے۔ لیکن وہی تقریر جب پنجاب میں ہوگی تو اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوگی۔ یہی صورتِ حال اس وقت بھی پیش آئے گی جب سامعین میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگی جو سنسکرت اصل کے بہت سے الفاظ نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا کل ہند پیمانے کے رہنماؤں کو ہندستانی کے ایسے ذخیرۂ الفاظ پر قدرت حاصل کرنا ہوگی جو انھیں اس کا اہل بنا سکے کہ ہندستان کے ہر خطے کے سامعین کے سامنے انھیں اپنائیت کا احساس ہو۔ اس ضمن میں پنڈت مالویہ جی کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اردو اور ہندی بولنے والے سامعین کے سامنے یکساں روانی کے ساتھ تقریر کر سکتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ انھیں کسی مناسب لفظ کی تلاش ہے۔ یہی بات بابو بھگوان داس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو اکثر ایک ہی تقریر میں متبادل الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ تقریر کا وقار مجروح نہ ہونے پائے۔ اس مقالے کو قلمبند کرتے وقت مسلمان رہنماؤں میں صرف مولانا محمد علی کا نام میرے ذہن میں آیا جن کی لفظیات دونوں طرح کے سامعین کے معیار پر پوری اترتی تھی۔ بڑودہ سروس کے لیے مطلوب گجراتی کا علم انھوں نے اچھی طرح حاصل کر لیا تھا۔

کانگریس سے قطع نظر ہندی اور اردو آزادانہ طور پر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں تک اور اردو مسلمانوں تک محدود رہے گی۔ حقیقتاً اگر تقابل کے ساتھ بات کی جائے تو چند ہی مسلمان اتنی ہندی جانتے ہیں کہ انھیں اسکالر کہا جاسکے۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ ہندی کے علاقوں میں جو مسلمان پیدا ہوتے ہیں وہاں ان کی مادری زبان ہندی ہی ہوتی ہے۔ ہزاروں ہندو ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور سینکڑوں ایسے ہیں جنھیں بجا طور پر اردو کا اسکالر کہا جاسکتا ہے۔ پنڈت موتی لال جی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اس طرح کی دوسری مثال تھے۔ اس طرح کی مثالیں بڑھتی ہی جائیں گی۔ لہٰذا ان دونوں بہنوں کے درمیان لڑائی جھگڑے یا منفی انداز کی مقابلہ آرائی کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ البتہ صحت مند قسم کی مقابلہ آرائی ہمیشہ رہنی چاہیے۔

ہر اعتبار سے مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی لائق رہنمائی میں عثمانیہ یونیورسٹی اردو کی گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے پاس اردو کی بہت بڑی فرہنگ موجود ہے۔ اردو میں سائنس کے رسالے تیار کیے جارہے ہیں اور چونکہ بڑی ایمانداری سے یونیورسٹی میں اردو کے ذریعے تعلیم دی جارہی ہے اس لیے اس کا ترقی کرنا یقینی ہے۔ اگر بے وجہ کے تعصب کی بنا پر ہندی بولنے والے تمام ہندو اس ادب سے فیض یاب نہیں ہوتے جو وہاں فروغ پارہا ہے تو یہ قصور انھی کا ہے۔ لیکن تعصب کو بہر حال ختم ہونا ہے اس وقت دونوں فرقوں میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ بیماریوں جیسا ہے، محض عارضی! اب اسے اچھا کہیے یا بُرا دونوں فرقے ہندستان ہی سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ اس زمین کے فرزند ہیں۔ وہ جس طرح یہاں پیدا ہوئے اسی طرح پیوند خاک بھی یہیں ہونگے۔ اگر وہ رضاکارانہ طور پر مل جل کر نہیں رہ سکتے تو قدرت انھیں مجبور کرے گی کہ وہ امن کے ساتھ رہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف اردو یا صرف ہندی کا خواب دیکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ محض ایک خواب ہی ہوگا ایک نامبارک خواب! اسلام کا اپنا

مخصوص کلچر ہے اور ہندو مت کا اپنا۔ مستقبل کا ہندستان ان دونوں کی مکمل اور خوشگوار آمیزش کا نمونہ ہوگا۔ جب وہ مبارک دن آئے گا تو مشترکہ زبان ہندستانی ہوگی۔ لیکن اردو اپنے طور پر ترقی کرے گی جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اسی طرح ہندی بھی اپنے طور پر ترقی کرے گی جس میں سنسکرت الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوگی۔ تلسی داس اور سور داس کی زبان کبھی نہیں مر سکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح شبلی کی زبان نہیں مر سکتی۔ لیکن ان دونوں کے بہترین عناصر ہندستانی زبان کے لیے مانوس رہیں گے۔

ایک نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اردو کے تئیں میرے رویے کے تعلق سے اردو پریس میں میرے خلاف بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ حالانکہ میں ہمیشہ ہندو مسلم یکجہتی کی بات کرتا ہوں لیکن میرے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ میں ہندوؤں میں سب سے زیادہ فرقہ پرست ذہنیت کا حامل ہوں۔ نامہ نگار نے میرے بارے میں ظاہر کی جانے والی جس رائے کا حوالہ دیا ہے اس کے خلاف میں اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس سلسلے میں خود میری زندگی گواہی دے گی کہ ہندو مسلم اتحاد کے تئیں میرا رویہ کیا رہا ہے۔

لیکن ہندی اردو مسئلہ "سدا بہار" قسم کا ہے۔ اس سوال پر میں نے بارہا اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے پھر بھی انھیں دوہرانے کی ضرورت ہے۔ میں کسی دلیل کے بغیر سیدھے سادے انداز میں اپنے خیال کا اظہار کرتا ہوں میرا یقین ہے کہ ـــــ

(1) ہندی ہندستانی اور اردو ایسے الفاظ ہیں جو شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذریعے بولی جانے والی ایک ہی زبان کی نشاندہی کرتے ہیں جو دیوناگری یا فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔

(2) اردو نام پڑنے سے پہلے اس زبان کو ہندو اور مسلمان دونوں ہندی کہتے تھے۔

(3) بعد میں اسی بولی کے لیے ہندستانی کا لفظ بھی استعمال کیا جانے لگا (اس کا زمانہ مجھے معلوم نہیں)

(4) ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یہ زبان بولنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ شمالی ہند کے عوام کی بھاری اکثریت اسے سمجھتی ہے۔

(5) اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سے ہندو اور بہت سے مسلمان بالترتیب سنسکرت الفاظ اور فارسی یا عربی الفاظ کے استعمال پر خصوصی طور پر اصرار کرتے رہیں گے۔ یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ باہمی عدم اعتماد اور علاحدگی پسندی کی فضا قائم رہے گی۔ وہ ہندو جو مسلم فکر کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں وہ فارسی رسم خط میں اردو کا مطالعہ کریں گے۔ اسی طرح وہ مسلمان جو ہندو فکر کے کسی گوشے کو سمجھنا چاہیں گے وہ دیوناگری رسم خط میں ہندی کا مطالعہ کریں گے۔

(6) بالآخر جب ہمارے دل ایک ہو جائیں گے اور ہم سب اپنے اپنے صوبوں کی بجائے ہندستان پر بطور وطن فخر کرنے لگیں گے اور ایک ہی سوتے سے پھوٹنے والے مختلف مذاہب کو سمجھنے اور ماننے لگیں گے، جس طرح ہم ایک ہی پیڑ کے متعدد پھلوں کو سمجھتے ہیں اور ان کے ذائقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تب ہم ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ رسم خط کے قریب پہنچ جائیں گے جبکہ صوبائی زبانوں کو ہم صوبائی مقاصد کے لیے برقرار رکھیں گے۔

(7) ایک ہی رسم خط یا ایک قسم کی ہندی یا ایک صوبے یا ضلع یا ایک علاقے یا فرقے کے عوام کو برتری دینے کی کوشش ملک کے بہترین مفاد کے لیے ضرر رساں ثابت ہوگی۔

(8) مشترکہ زبان کے سوال کو مذہبی اختلاف سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔

(9) رومن رسم خط ہندستان کا مشترکہ رسم خط نہ تو ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ مقابلہ صرف فارسی اور دیوناگری رسم خط کے درمیان ہو سکتا ہے۔ موخر الذکر (دیوناگری) کی جو

اپنی اندرونی خصوصیت ہے اس سے قطع نظر اسی کو کل ہند مشترکہ رسم خط ہونا چاہیے
کیونکہ بیشتر صوبائی رسم خط کا دیوناگری سے اصل تعلق ہے اور ان کے لیے اسے سیکھنا بہت
آسان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اسے مسلمانوں پر یا ان
لوگوں پر جو اسے نہیں جانتے جبراً تھوپنے کی کوشش نہ کی جائے۔

(10) اردو کو اگر ہندی سے مختلف تصور کیا جائے تو میں نے اس وقت اردو کے موقف
کی حمایت کی جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمّیلن نے میرے ایما پر شق میں موجود
مشترکہ زبان کی تعریف کو تسلیم کیا اور پھر ناگپور میں میرے ہی ایما پر بھارتیہ ساہتیہ
پریشد نے بین صوبائی روابط کو فروغ دینے کے لیے ہندی یا ہندستانی کا نام
مشترکہ زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ گویا اس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں
کو اس بات کا پورا موقع ملتا ہے کہ وہ ان کوششوں کے ساتھ اپنے آپ
کو جوڑیں جو مشترکہ زبان کو مستحکم بنانے کے لیے کی جارہی ہیں کہ اسی مشترکہ
زبان میں بہترین صوبائی فکر کی ترجمانی بھی ہو سکتی ہے۔

رسمِ خط کا سوال

اب باقی رہا رسم خط کا سوال۔ موجودہ صورت حال میں یہ بات بعید از قیاس ہے کہ
مسلمان دیوناگری رسم خط کے لیے اصرار کریں گے اور یہ سوچنا کہ ہندوؤں کی بڑی تعداد
عربی رسم خط اختیار کرنے پر اصرار کرے گی بالکل ہی امکان سے باہر ہے۔ اس صورت میں
ہندی یا ہندستانی کی تعریف وضع کرنے کے لیے میں نے جو تجویز پیش کی وہ یہ ہے کہ "یہ وہی
زبان ہو سکتی ہے جسے شمالی ہند کے ہندو اور مسلمان عام طور سے بولتے ہیں خواہ اسے دیوناگری
میں لکھا جائے یا اردو رسم خط میں۔" اس تجویز کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے اس کے باوجود
میں اسی موقف پر اٹل ہوں۔ لیکن بلا شبہ دیوناگری کے سلسلے میں ایک تحریک چل رہی ہے
جس کے ساتھ میں پورے طور پر جڑا ہوا ہوں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں جو

زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا ایک مشترکہ رسم خط ہو، خاص طور سے ان زبانوں کا جن کے ذخیرۂ الفاظ میں سنسکرت کو بالادستی حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ کوشش اس بات کی کی جارہی ہے کہ تمام ہندستانی زبانوں کے بہترین عناصر کو دیوناگری رسم خط میں ڈھالا جائے۔

وہ مختلف زبانیں جو سنسکرت سے نکلی ہیں یا اس سے قریبی تعلق رکھتی ہیں ان کا ایک رسم خط ہونا چاہیے اور وہ رسم خط یقیناً دیوناگری ہی ہو سکتا ہے۔ ایک صوبے کے لوگ اگر دوسرے صوبے کی زبان پڑھنا چاہیں تو مختلف رسم خط غیر ضروری رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ یہاں تک کہ یوروپ نے ایک ہی رسم خط کو اختیار کیا ہے حالانکہ وہ ایک قوم بھی نہیں ہے۔ تو پھر ہندستان ایک رسم خط اختیار کیوں نہیں کر سکتا جو کہ ایک قوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ہے بھی ایک قوم۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس اعتبار سے مستقل مزاج نہیں ہوں کہ ایک ہی زبان کے لیے دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط اختیار کرنے کی بات کرتا ہوں لیکن میری یہ "غیر مستقل مزاجی" نری بے وقوفی نہیں ہے۔ اس وقت ہندو مسلم ٹکراؤ کا ماحول ہے۔ لہٰذا تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دانشمندی اور حالات کا تقاضہ ہے کہ ممکنہ حد تک باہمی احترام اور رواداری کو فروغ دیا جائے۔ اسی لیے دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط کی بات کہی جاتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ صوبوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اسی لیے اصلاحی اقدامات کی وکالت کی جارہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کی بجائے مختلف سطحوں پر صوبوں کے درمیان آپسی روابط استوار کیے جائیں۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ عوام کی بہت بڑی اکثریت ناخواندہ ہے۔ ان پر مختلف رسم خط کا بوجھ ڈالنا خودکشی کرنے کے مترادف ہوگا اور اس کی وجہ جھوٹی جذباتیت اور غور و فکر سے گریز کرنے کی ذہنیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آسام کے کچھ قبائل کو دیوناگری رسم خط کے بجائے رومن رسم خط کے ذریعے پڑھنا لکھنا سکھایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں، میں اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں کہ ہندستان میں ایک ہی رسم خط ہمہ گیر طور پر قابل قبول ہو سکتا ہے اور وہ ہے دیوناگری رسم خط خواہ وہ

موجودہ شکل میں ہو یا اصلاح شدہ شکل میں۔ اردو اور فارسی ساتھ ہی ساتھ رائج رہیں گی جب تک کہ مسلمان خود اپنی مرضی سے خالص سائنسی اور قومی نقطہ نظر سے دیوناگری کی برتری کو تسلیم نہیں کر لیتے۔ لیکن موجودہ مسئلے کے پیش نظر یہ بحث ہی فضول ہے۔ ان دو رسم خط کے ساتھ رومن رسم خط کو بہر حال رائج نہیں کیا جا سکتا۔ رومن رسم خط کے جوشیلے حامی ان دونوں کو بے دخل کر دیں گے۔ سائنسی حقیقت اور جذبات۔ یہ دونوں چیزیں رومن رسم خط کے خلاف ہیں۔ اس کی ایک چیز قابل ذکر ضرور ہے۔ یعنی چھپائی اور ٹائپ میں آسانی رہتی ہے لیکن اس بات کو اگر ذہن میں رکھا جائے کہ اسے سکھانا لاکھوں افراد پر جبر کرنے کے مترادف ہو گا تو اس کے مقابلے میں اُن آسانیوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ وہ لاکھوں کروڑوں افراد جو اپنا ادب اپنے صوبائی رسم خط یا دیوناگری میں پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لیے رومن رسم خط قطعی معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ دیوناگری سیکھنا لاکھوں ہندوؤں بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی آسان ہے کیونکہ بیشتر صوبائی رسم خط دیوناگری ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو میں نے قصداً شامل کیا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کی مادری زبان بنگالی ہے جس طرح تمل مسلمانوں کی تمل ہے۔ اردو کو رائج کرنے کی موجودہ مہم کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پورے ہندستان کے مسلمانوں کو اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو کو ایک اضافی زبان کے طور پر پڑھنا پڑے گا۔ جبکہ قرآن شریف پڑھنے کے مقصد سے عربی انھیں یوں بھی سیکھنا پڑتی ہے۔ لیکن لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو رومن رسم خط سیکھنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہ ضرورت صرف اسی وقت پیش آئے گی جب وہ انگریزی سیکھنا چاہیں گے۔ اسی طرح ہندو جب اپنے مذہبی گرنتھ کا اصل شکل میں مطالعہ کرنا چاہیں گے تو انھیں دیوناگری رسم خط سیکھنا ہی پڑے گا۔ گویا دیوناگری رسم خط کو ہمہ گیر بنانے کی مہم کے پیچھے ایک مضبوط بنیاد ہے۔ رومن رسم خط رائج کرنا ایک غیر ضروری بوجھ لادنے کے مترادف ہے جو کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جبراً بوجھ لادنے کی مہم اس وقت خس و خاشاک کی طرح اڑ جائے گی جب عوامی بیداری پیدا ہو گی۔ اور یہ بیداری آ رہی ہے۔ یہ بیداری اس سے بھی

جلدی آئے گی جتنی جلدی ہم میں سے کچھ لوگ بعض وجوہ سے امید کرتے ہیں۔ پھر بھی کروڑوں عوام کو بیدار ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اسے ڈھالا نہیں جاسکتا۔ یہ پراسرار طور پر آتی ہے یا آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ قومی کارکن تو عوام کی نبض پہچان کر اس عمل میں محض تیزی لانے کا باعث بن سکتے ہیں۔

☆☆☆

جواہر لال نہرو

حالیہ مہینوں میں ہم نے ہندی اور اردو کے پرانے تنازعے کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جوش کی ایک۔ زدسی آئی اور الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ایک ایسے موضوع کو گھسیٹ کر بازار کی سطح پر لایا گیا جو سنجیدہ اور عالمانہ غور و فکر اور علمی مباحث کا متقاضی تھا۔ اس کے گرد مذہبی جذبات امنڈ آئے ہیں۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ سامنے آیا کہ زبان کے وہ علمبردار جو اس میدانِ جنگ میں اتر آئے ہیں انھیں نہ تو علمی مباحث سے کوئی سروکار ہے اور نہ کسی زبان سے محبت۔ انھیں بنیادی طور پر صرف سرکاری احکام اور عدالتی کارروائیوں سے دل چسپی ہے۔ جو لوگ زبان کو تہذیب کا آئینہ سمجھ کر اس سے محبت کرتے ہیں، جو زبان کو الفاظ اور محاوروں میں گندھی ہوئی کھلی فکر کا محور تصور کرتے ہیں، جو اُسے خیالات کا وہ منبع سمجھتے ہیں جو معانی کی خوبصورت پرتیں کھولتا ہے، جو اسے موسیقی اور نغمے کا آہنگ خیال کرتے ہیں اور تاریخ کے سحر انگیز اوراق کو لفظوں کا اعجاز سمجھتے ہیں اور جو اس کے ذریعے زندگی کی تصویر ہر رنگ میں دیکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جن لوگوں کو ان عوامل کی وجہ سے کوئی زبان عزیز ہوتی ہے، وہ اس بھونڈے مظاہرے پر انگشت بدنداں ہیں اور اس پوری بحث سے انھوں نے اپنے آپ کو الگ کر رکھا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم، اس سے بے تعلق رہ سکتے ہیں اور نہ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ زبان کا مسئلہ ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ یہ اہم اس شور شرابے کی وجہ سے نہیں ہے کہ ہندستان بھانت بھانت کی بولیوں کا ایک جنگل ہے جہاں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے ارد گرد دیکھے تو اسے نظر آئے گا کہ رقبے اور وسعت کے اعتبار سے ہندستان میں بہت سی زبانیں ہیں جو ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ ہندستان

میں ایک ایسی بڑی اور ہمہ گیر زبان بھی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ تک پہنچتی ہے۔ پھر بھی یہ مسئلہ باقی ہے اور اس کا سامنا کرنا ہی ہے۔

اس وقت اس کا سامنا اس کے فرقہ وارانہ اور سیاسی مضمرات کی وجہ سے کرنا ہے۔ لیکن یہ ایک عارضی مرحلہ ہے جو بہر حال گذر جائے گا۔ اصل مسئلہ باقی رہے گا۔

عوام الناس میں تعلیم کو عام کرنے اور تہذیبی زندگی کو فروغ دینے کے لیے ہمیں کون سی حکمتِ عملی اختیار کرنا ہوگی؟ ہم کن خطوط پر ہندستان کی یکجہتی کو فروغ دیں کہ ہمارے شاندار تہذیبی ورثے کا تنوع بھی قائم رہے؟

زبان کا مسئلہ کسی بھی قوم کے لیے بڑے اہم مضمرات کا حامل ہوتا ہے۔ اب سے تقریباً ٹھیک تین سو سال قبل ملٹن نے فلورنس سے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اسی بات پر زور دیا تھا اور کہا تھا "کسی بھی قوم کی اُس زبان کو کمتر نہیں سمجھنا چاہیے جو وہ بولتی ہے خواہ وہ خالص ہو یا ملی جلی۔ اس بات کو بھی کم اہمیت نہیں دی جانی چاہیے کہ اسے بولتے وقت لوگ اپنی ریت کے مطابق کس قدر باوقار سمجھتے ہیں۔ ۔ ۔ کسی بھی ملک کی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ بھلے ہی بھدا دکھائی دیتا ہو، بھلے ہی اس کا ایک حصہ فرسودہ ہو کر مسخ ہو گیا ہو اور وہ کچھ بھی کہتے ہوں۔ ۔ ۔ لیکن اسے اس بات کا ہلکا سا بھی اشارہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہاں کے باشندے سست اور نکتے ہو گئے ہیں اور ان لوگوں میں کاہلی سرایت کر گئی ہے۔ کیا لمبے عرصے تک کا ان کا ذہنی ارتقا کسی طرح کی غلامی یا سپردگی کا مظہر تھا؟ بلکہ اس کے برعکس ہم نے کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی بھی سلطنت یا ریاست کو اس مدت تک کم از کم معمول کے مطابق ترقی حاصل نہ ہوئی ہو جب تک اس نے اپنی زبان کو پسند کیا اور اس کا خیال رکھا"۔

زندہ زبان دل کی دھڑکن ہوتی ہے، ایک طاقتور عنصر ہوتی ہے اور ہمیشہ تبدیلی اور ارتقا کے عمل سے گزرتی ہے اور ان لوگوں کی زندگی کا آئینہ دار بن جاتی ہے جو اسے لکھتے اور بولتے ہیں۔ اس کی جڑیں عوام میں پیوست ہوتی ہیں اگرچہ اس کا شائستہ ڈھانچہ ان لوگوں کی تہذیب کا ترجمان ہوتا ہے جن کی تعداد بہت معمولی ہوتی ہے۔ تو پھر ہم قرار داد پاس

کر کے یا اوپر کے دباؤ کے تحت کس طرح اسے اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں؟ پھر بھی میں ایک عام رجحان یہ دیکھ رہا ہوں کہ کچھ لوگ ایک زبان کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے مخصوص طریقے سے لوگوں پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ حالات میں پریس، کتابوں، سینما اور ریڈیو کا سہارا لے کر عوامی بیداری اور عوامی پروپگنڈے کے ذریعے کسی بھی زبان میں گذشتہ دور کے مقابلے زیادہ تیزی اور آسانی سے تبدیلی لائی جا سکتی ہے لیکن اس تبدیلی یا تنوع کو اس تیز رفتار تبدیلی کا آئینہ دار ہونا چاہیے جو اُن لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جو اسے بولتے ہیں۔ جس زبان کا رابطہ عوام سے کٹ جاتا ہے اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک مصنوعی اور بے جان سی شے بن جاتی ہے بجائے اس کے کہ زندگی کے استحکام اور انبساط کی ترجمان بنے۔ کسی بھی زبان کو جبراً ایک خاص طرز پر فروغ دینے کی کوشش اس کی شکل مسخ کرنے کا باعث بن سکتی ہے اور اس سے اس کی اصل روح بھی مجروح ہو سکتی ہے۔

زبان کے معاملے میں ریاست کی کیا پالیسی ہونی چاہیے؟ کانگریس نے مختصراً لیکن واضح اور قطعی طور پر اسے بنیادی حقوق سے متعلق قرارداد میں پیش کر دیا ہے۔ "اقلیتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی تہذیب، زبان اور رسم خط کا تحفظ کیا جائے گا"۔ کانگریس اپنے اس اعلان کی پابند ہے اور کسی بھی اقلیت یا لسانی گروپ کو اس سے زیادہ یقین دہانی کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی۔ اس کے علاوہ کانگریس نے اپنی قراردادوں کے علاوہ اپنے دستور میں بھی یہ بات واضح کر دی ہے کہ اگر چہ ملک کی مشترکہ زبان ہندستانی ہوگی لیکن صوبائی زبانوں کو اپنے اپنے علاقوں میں بالادستی حاصل ہوگی۔ کسی بھی زبان کو قرارداد کے ذریعے نہیں لادا جا سکتا اور کانگریس کی مشترکہ زبان کو فروغ دینے کی اور اپنے بیشتر کاموں کو صوبائی زبانوں میں انجام دینے کی خواہش، ایک مقدس خواہش یا کوشش ہوگی اور اگر یہ کوشش، صورت حال اور وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوگی تو عوام کی اکثریت اسے نظر انداز کر دے گی۔ اس طرح ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہماری کوششیں کس حد تک صورتِ حال سے مطابقت پیدا

کر سکتی ہیں۔

ہماری عظیم صوبائی زبانیں محض بولیاں یا زبان کی ذیلی شاخیں نہیں ہیں جیسا کہ نادان قسم کے لوگ کبھی کبھی کہتے ہیں۔ یہ سب قدیم زبانیں ہیں جن کا شاندار ورثہ ہے۔ ہر زبان بولنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ہر زبان عوام و خواص کی زندگی، تہذیب اور طرز فکر سے اٹوٹ طور پر جڑی ہوئی ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ عوام اپنی ہی زبان کے وسیلے سے تعلیمی اور تہذیبی سطح پر اپنی شخصیت کو فروغ دے سکتے ہیں لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ ہم صوبائی زبانوں پر توجہ مرکوز کریں اور اپنے بیشتر کام انہی کے توسط سے انجام دیں۔ کسی اور زبان کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چھوٹا سا تعلیم یافتہ حلقہ عوام سے کٹ جائے گا اور اس سے عوامی زندگی کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ جب سے کانگریس نے اپنا کام صوبائی زبانوں میں انجام دینا شروع کیا ہے تب سے ہمارے رابطے عوام سے تیزی سے بڑھے ہیں اور پورے ملک میں کانگریس کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ کانگریس کا پیغام انتہائی دور دراز علاقوں میں واقع چھوٹے چھوٹے گاؤں تک پہنچا ہے اور عوام کا سیاسی شعور بیدار ہوا ہے لہٰذا ہمارے نظامِ تعلیم اور مفادِ عامہ کے کاموں میں صوبائی زبانوں کا استعمال ہونا چاہیے۔

یہ زبانیں ہیں کون کون سی؟ بلاشبہ اپنے خاص ہندی اور اردو اسلوب نیز اپنی متعدد بولیوں سے آراستہ ہندستانی۔ اس کے بعد بنگالی، مراٹھی اور گجراتی زبانیں ہیں جو ہندی کی بہنیں ہیں اور اس سے ان کا قریبی تعلق ہے۔ جنوب میں تمل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانیں نظر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ اڑیہ اور آسامی اور سندھی اور پنجابی زبانیں ہیں۔ شمال مغرب میں پشتو بولی جاتی ہے۔ یہ تمام زبانیں مل کر پورے ہندستان کا احاطہ کرتی ہیں اور ان میں ہندستانی کا علاقہ سب سے بڑا ہے اور کسی حد تک کل ہند پیمانے کی زبان بننے کی یہ دعویدار بھی ہے۔

صوبائی زبانوں کی قلمرو میں دراندازی کیے بغیر ذریعہ اظہار کے طور پر ہمیں ایک

کل ہند مشترکہ زبان کی بھی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزی یہ کام انجام دے سکتی ہے اور کسی حد تک اس نے ہمارے اعلیٰ طبقے اور ملک گیر پیمانے پر سیاسی مقاصد کے لیے وہ کام انجام بھی دیا ہے۔ لیکن جب ہم عوام کی اکثریت کو ذہن میں رکھتے ہیں تو یہ بات قطعی ناممکن نظر آتی ہے۔ ہم کروڑوں عوام کو پورے طور پر غیر ملکی زبان کے ذریعے باشعور نہیں بنا سکتے۔ یوں انگریزی ناگزیر طور پر ہمارے گذشتہ رابطوں کی وجہ سے اور عالمی پیمانے پر اپنی موجودہ اہمیت کی وجہ سے ایک اہم زبان کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ بیرونی دنیا سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے یہ سب سے بڑا ذریعہ ہوگی اگرچہ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس مقصد کے لیے یہ واحد ذریعہ نہیں ہوگی۔ میں سوچتا ہوں کہ ہمیں فرانسیسی، جرمن، روسی، ہسپانوی، اطالوی، چینی اور جاپانی جیسی دوسری غیر ملکی زبانوں کو بھی فروغ دینا چاہیے۔ لیکن انگریزی کو کل ہند پیمانے پر اس طور پر فروغ نہیں دیا جاسکتا کہ اسے لاکھوں کروڑوں افراد سمجھ لیں۔

تنہا ہندستانی ہی ممکنہ طور پر کل ہند زبان بن سکتی ہے۔ کوئی بارہ کروڑ باشندے اسے باقاعدہ بولتے ہیں اور بیسیوں لاکھ افراد اسے جزوی طور پر سمجھ لیتے ہیں حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جنھیں ابھی تک یہ زبان بالکل نہیں آتی، وہ کسی غیر ملکی زبان کے مقابلے میں آسانی سے اسے سیکھ سکتے ہیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو تمام ہندستانی زبانوں میں مشترک ہیں لیکن جو چیز کہیں زیادہ اہم ہے وہ ہے ان زبانوں کا مشترکہ تہذیبی پس منظر، خیالات کی مماثلت اور زبانوں کے آپسی رشتے۔ ان حقائق کے پس منظر میں کسی بھی ہندستانی کے لیے دوسری ہندستانی زبان کا سیکھنا نسبتاً آسان ہوگا۔

ہندستانی ہے کیا؟ مبہم طور پر ہم کہتے ہیں کہ ہندی اور اردو دونوں جس طرح بولی جاتی ہیں اور جس طرح دونوں اپنے رسم خط میں لکھی جاتی ہیں، ہندستانی میں شامل ہیں۔ اس طرح ہم ان دونوں کے مابین ایک خوبصورت معنوی ربط تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں

اور اپنے اس خیال یا اختراع کو ہندستانی کا نام دیتے ہیں۔ کیا یہ محض ایک خیال یا اختراع ہے جس کی حقیقتاً کوئی بنیاد نہیں ہے یا اس سے زیادہ بھی کچھ ہے؟

ہندستانی میں تنوع بھی اچھا خاصا ہے کہ یہ شمالی اور وسطی ہندستان کے مختلف علاقوں میں لکھی اور بولی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے علاقائی بولیوں کے بہت سے الفاظ اس میں شامل ہوگئے ہیں لیکن یہ صورتِ حال تعلیم کے فقدان کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ تعلیم جب عام ہوگی تو اس طرح کے الفاظ خود بخود غائب ہو جائیں گے اور کسی حد تک معیار بندی عمل میں آئے گی۔

سوال باقی رہ جاتا ہے رسم خط کا۔ دیوناگری اور اردو رسم خط ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں اور اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے میں ضم ہو سکے۔ لہٰذا ہم نے دانشمندی سے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں کو پورے طور پر برقرار رکھا جائے گا۔ یہ ان لوگوں پر ایک اضافی بوجھ ہوگا جنھیں دونوں رسم خط سیکھنا پڑیں گے اور اس سے کسی حد تک علاحدگی پسندی کی بھی حوصلہ افزائی ہوگی لیکن اس منفی صورت حال کو ہمیں برداشت کرنا ہی پڑے گا کیونکہ ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ ہی موجود نہیں ہے۔ دونوں رسم خط ہماری زبان کے گرانقدر سرمایے کا حصہ ہیں اور ان کے گرد نہ صرف یہ کہ رسم خط کی رعایت سے خصوصی قسم کے ادب پارے اکٹھا ہوگئے ہیں بلکہ جذبات کی ایک دیوار بھی کھڑی ہوگئی ہے جو بہت ٹھوس اور غیر حرکت پذیر ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مستقبل بعید میں کیا صورتِ حال سامنے آئے گی لیکن موجودہ صورت حال میں تو دونوں کو ہر حال میں رہنا ہے۔

ہماری کچھ لسانی مشکلات کو حل کرنے کے لیے لاطینی رسم خط کی بھی وکالت کی گئی ہے۔ تیزی سے کام نمٹانے کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقتاً یہ ہندی یا اردو کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ ٹائپ رائٹر، ڈپلی کیٹر اور بعض دوسرے مشینی آلات کے اس زمانے میں لاطینی رسم خط کو ہندستانی رسم خط پر فوقیت حاصل ہے کیوں کہ ہندستانی رسم خط

ان نئی مشینوں سے پورے طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن لاطینی رسم خط کو اس اعتبار سے برتری حاصل ہونے کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ اس بات کا رتی برابر بھی امکان ہے کہ یہ دیوناگری یا اردو رسم خط کی جگہ لے سکے گا۔ یہاں جذبات کی دیوار اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے کہ لاطینی رسم خط ہمارے اجنبی آقاؤں سے تعلق رکھتا ہے لیکن اسے رد کرنے کی کچھ اور بھی ٹھوس وجوہ ہیں۔ رسم خط ہمارے ادب کے لازمی جزو ہوتے ہیں۔ان کے بغیر ہم اپنے قدیم ورثے سے کٹ کر رہ جائیں گے۔

لہٰذا یہی ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم کسی حد تک اپنے رسم خط میں اصلاح کریں۔اردو اور ہندی کے علاوہ اس وقت ہمارے پاس تین اور رسم خط ہیں۔ بنگلہ، مراٹھی اور گجراتی۔ یہ تینوں دیوناگری کے بہت قریب ہیں۔ یہ بات آسانی سے ممکن بنائی جاسکتی ہے کہ ان چاروں زبانوں کے لیے ایک رسم خط اپنالیا جائے اور اس کے لیے ضروری نہیں کہ دیوناگری کو اس کی موجودہ شکل میں تسلیم کیا جائے۔اس میں معمولی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ہندی، بنگلہ، گجراتی، اور مراٹھی کے لیے مشترکہ رسم خط اختیار کرنا یقیناً سود مند ثابت ہوگا۔اس سے چاروں زبانیں ایک دوسرے کے بہت قریب آجائیں گی۔

مجھے نہیں معلوم کہ جنوب کی دراوڑی زبانوں کے لیے کس حد تک یہ ممکن ہوگا کہ وہ شمالی ہند کے کسی رسم خط سے مطابقت پیدا کرسکیں یا خود اپنی زبانوں کے لیے ایک مشترکہ رسم خط کو فروغ دے سکیں۔ جن لوگوں نے اس موضوع کا مطالعہ کیا ہے وہ ہمیں اپنے گرانقدر خیالات سے واقف کرا سکیں گے۔

اردو اسکرپٹ جوں کا توں برقرار رہے گا اگرچہ اسے تھوڑا سا آسان بنانے کی کوشش کی جاسکتی ہے تاکہ اس میں سندھی رسم خط کے لیے گنجائش پیدا کی جاسکے کیونکہ یہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔

اس طرح بعد میں ہمیں دو رسم خط کی ضرورت پڑے گی ایک تو دیوناگری، بنگلہ، مراٹھی اور گجراتی کا مشترکہ رسم خط اور دوسرا اردو کا رسم خط۔اور اگر

ضروری ہوا تو ایک جنوبی ہند کا رسم خط۔ان میں سے کسی ایک کو دبانے کی کوشش نہیں کی جانی چاہیے تاوقتیکہ اس بات کا امکان نہ پیدا ہو جائے کہ متعلقہ حلقوں کے درمیان اس بات پر عام اتفاق ہو جائے گا کہ جنوبی ہند کی زبانوں کے لیے شمالی ہند کا کوئی رسم خط اختیار کیا جائے جو ہندی رسم خط ہو سکتا ہے یا معمولی سی تبدیلی کے ساتھ اس کی کوئی دوسری شکل۔

اب ہم ہندستانی کے بارے میں غور کریں: شمالی اور وسطی ہندستان کی مادری زبان کی حیثیت سے بھی اور ایک کل ہند زبان کی حیثیت سے بھی۔یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دونوں پر الگ الگ طور سے غور کیا جانا چاہیے۔

اس زبان کے دو اہم پہلو ہیں اردو اور ہندی۔واضح طور پر ان دونوں کی بنیاد ایک ہے۔ایک ہی قواعد اور عام الفاظ کا ذخیرہ بھی ایک ہے۔در اصل بنیادی زبان ایک ہی ہے۔پھر بھی موجودہ اختلافات قابل غور ہیں۔ایک اکتساب فیض کے لیے سنسکرت کی طرف دیکھتی ہے تو دوسری کسی حد تک فارسی کی طرف۔ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا ایک بھونڈی بات ہے۔رسم خط سے قطع نظر اردو ہندستان ہی کی مٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ہندستان سے باہر اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔آج بھی یہ شمالی ہند کے بہت سے ہندوؤں کی گھریلو زبان ہے۔

ہندستان میں مسلم حکمرانوں کی آمد فارسی کو دربار کی زبان کے طور پر لائی اور مغلیہ دور کے اختتام تک یہ اسی طور پر استعمال ہوتی رہی۔شمالی اور وسطی ہندستان کے لوگوں کی زبان اس پورے عرصے میں ہندی ہی تھی۔ایک زندہ زبان کے طور پر اس نے فارسی کے بہت سے الفاظ اپنے اندر جذب کیے۔گجراتی اور مراٹھی نے بھی یہی کیا لیکن بنیادی طور پر ہندی،ہندی ہی رہی۔ہندی کی ایک انتہائی فارسی آمیز شکل شاہی درباروں کے آس پاس ارتقا پذیر ہوئی جسے "ریختہ" کہا گیا۔ایسا لگتا ہے کہ لفظ اردو کا استعمال مغلیہ عہد میں مغلوں کے فوجی کیمپوں میں ہونے لگا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسی زبان کو ہندی بھی کہا جاتا رہا۔اسے ہندی

کی معمولی تبدیل شدہ شکل بھی نہیں تصور کیا جاتا تھا۔ 1857ء کی بغاوت تک رسم خط سے قطع نظر اردو سے مراد ہندی ہی ہوتی تھی۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ ہندی کے بعض بہت اچھے شاعر مسلمان ہوئے ہیں۔ بغاوت تک بلکہ اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک اس زبان کے لیے جو عام اصطلاح استعمال ہوتی تھی،وہ ہندی ہی تھی۔ یہ حوالہ رسم خط کے لیے نہیں بلکہ زبان کے لیے ہوتا تھا یعنی ہند کی زبان ہندی ۔وہ مسلمان جو اردو رسم خط میں لکھتے تھے وہ اسے ہندی ہی کہتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں اردو اور ہندی کی نشاندہی دو مختلف زبانوں کے لیے ہونے لگی۔اس علاحدگی پسندی کو فروغ حاصل ہوا۔ شاید یہ ابھرتے ہوئے قومی شعور کی علامت تھی جس نے پہلے ہندوؤں کو متاثر کیا جنھوں نے خالص ہندی اور دیوناگری رسم خط کے فروغ پر اصرار کرنا شروع کیا۔ ان کی قوم پرستی شروع میں ناگزیر طور پر ہندو قومیت ہی کی ایک شکل تھی۔اس کے کچھ ہی دن بعد مسلمانوں نے اپنے طرز کی قومیت کو فروغ دیا جو مسلم قوم پرستی تھی اور اسی نے اردو کو اپنا خصوصی ورثہ سمجھا۔ تنازعہ اس بات پر پیدا ہو گیا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں کون سا رسم خط استعمال ہو۔ اس طرح زبان کے سوال پر بڑھتی ہوئی علاحدگی پسندی اور رسم خط کا تنازعہ سیاسی اور قومی بیداری کے فروغ کا نتیجہ تھا جس نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔ چونکہ قومیت کے تصور نے بعد میں حقیقی قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی جس کے تحت کسی خاص فرقے کی بجایے پورے ہندستان کے بارے میں غور کیا جانے لگا لہٰذا اس کے ساتھ زبان میں علاحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے کی خواہش نے انگڑائی لی اور باشعور لوگوں نے ہندی اور اردو کے لاتعداد مشترکہ عناصر پر زور دینا شروع کیا۔ نتیجے کے طور پر ہندستانی کی بات ہونے لگی ،صرف شالی اور وسطی ہند کی زبان کے طور پر نہیں بلکہ پورے ملک کی قومی زبان کے طور پر بھی لیکن اس کے باوجود بدقسمتی سے ہندستان میں فرقہ پرستی کافی مضبوط ہے لہٰذا یکجہتی کو فروغ دینے کے رجحان کے ساتھ ساتھ علاحدگی پسندی کا رجحان بھی پروان چڑھ رہا

ہے۔ زبان کے مسئلے پر پیدا ہونے والی علاحدگی پسندی قومی شعور کے پورے طور پر بیدار ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس صورت میں ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ برائی کی اصل جڑ کیا ہے؟ زبان کے معاملے میں کسی علاحدگی پسند کو کھرچ کر دیکھیے وہ آپ کو خالص فرقہ پرست نظر آئے گا اور سیاسی طور پر رجعت پسند بھی۔

اگرچہ ہندی اور اردو کی اصطلاحیں مغل دور میں متبادل کے طور پر ایک ہی زبان کے لیے ایک لمبے عرصے تک استعمال ہوئیں لیکن اردو کا اطلاق مغلوں کی ملی جلی فوجی زبان پر بطور خاص ہوتا تھا۔ مغل دربار اور فوج میں فارسی کے بہت سے لفظ رائج تھے جو اردو زبان میں بھی داخل ہو گئے۔ مغلوں کے درباری مراکز کی زندگی سے دور جب آپ جنوب کی جانب بڑھتے ہیں تو اردو خالص ہندی میں ضم ہوتی جاتی ہے۔ دربار کا اثر ناگزیر طور پر دیہی علاقوں کے مقابلے میں شہروں پر کہیں زیادہ پڑا۔ اور اسی طرح یہ اثر وسطی ہند کے شہروں کے مقابلے میں شمالی ہند کے شہروں پر کہیں زیادہ مرتب ہوا۔ اور اسی سے ہمیں اردو اور ہندی کے اصل فرق کا آج اندازہ ہوتا ہے۔ اردو شہروں کی زبان ہے اور ہندی دیہی علاقوں کی۔ بلاشبہ شہروں میں ہندی بھی بولی جاتی ہے لیکن اردو پورے طور پر ایک شہری زبان ہے۔ اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا مسئلہ گویا گاؤں اور شہر کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے مسئلے سے بھی دشوار تر ہے۔ اس کے لیے جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ سطحی ثابت ہوگا جس کا کوئی پائیدار اثر نہیں مرتب ہو سکتا۔ زبانوں کی ساخت اسی وقت بدلتی ہے جب وہ لوگ بدلتے ہیں جو اسے بولتے ہیں۔

عام گھروں میں بولی جانے والی اردو اور ہندی میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا لیکن ادبی زبانوں میں بہت فاصلہ ہوتا ہے جو حالیہ برسوں کی دین ہے۔ تحریری ادبی تخلیقات میں

صورتِ حال بڑی بھیانک نظر آتی ہے اور اس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ اس کے پیچھے کچھ بد دماغ لوگوں کا ہاتھ ہے لیکن یہ ایک احمقانہ بات ہے، اگرچہ یہ بات بلا شبہ نظر آتی ہے کہ کچھ لوگ انفرادی طور پر علاحدگی پسندی کے رجحان کو ہوا دے کر لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن زندہ زبانیں اس طرح فروغ نہیں پاتیں اور نہ ہی چند افراد کے ذریعے ان کی ساخت میں کوئی خاص تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ ہمیں اس بظاہر معاندانہ رویے کے اسباب پر گہرائی سے غور کرنا پڑے گا۔

مخالف سمتوں کو جانے کا یہ رجحان اگرچہ اپنے آپ میں بدبختانہ ہے لیکن یہ ایک مثبت رویے کی بھی علامت ہے۔ ہندی اور اردو دونوں ایک لمبے عرصے کے جمود کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور آگے قدم بڑھا رہی ہیں۔ وہ نئے خیالات کے اظہار کے لیے سرگرداں نظر آتی ہیں اور پرانی اور فرسودہ ڈگر کو چھوڑ کر ادبی اظہار کے نئے طریقے ڈھونڈ رہی ہیں۔ جہاں تک نئے خیالات کا سوال ہے ان کے لیے دونوں زبانوں کی لفظیات ابھی ناقص ہیں لیکن یہ دونوں بعض سرچشموں سے فیض اٹھا سکتی ہیں۔ ایک طرف یہ سرچشمہ سنسکرت کا ہے تو دوسری طرف فارسی کا۔ لہٰذا جیسے ہی ہم گھر اور بازار کی زبان کو چھوڑ کر باہر نکلیں گے اور تخیل کی دنیا میں پرواز کریں گے ویسے ہی یہ فاصلے بھی بڑھیں گے۔ ایک دوسرے کی خالص زبان کا حاسد ادبی سماج اس رجحان کو آخری حدوں تک لے جاتا ہے اور تب ایک دوسرے پر الزام لگاتا ہے کہ وہ علاحدگی پسندانہ رجحان کو ہوا دے رہا ہے۔ اسے اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا، دوسرے کی آنکھ کا تنکا آسانی سے دکھائی دے جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کا فوری نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اردو اور ہندی کے درمیان خلیج بڑھی اور کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے الگ زبان کے طور پر فروغ پانے پر تلی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سے خوف کھانا مناسب نہیں ہے۔ اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہندی اور اردو نئی زندگی کے راستوں سے گذر رہی ہیں اور ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے بھلے ہی اس کے باعث دونوں کے درمیان خلیج عارضی

طور پر کچھ اور بڑھ جائے۔ ہندی اور اردو دونوں کا موجودہ ذخیرۂ الفاظ خام ہے اور جدید سائنسی، سیاسی، اقتصادی، تجارتی اور کبھی کبھی ثقافتی خیالات کے مناسب اظہار کے لیے موزوں نہیں ہے اور دونوں کامیابی کے ساتھ اس بات کی سخت کوشش کر رہی ہیں کہ اپنے دامن کو اس قدر مالامال کر لیں کہ ایک جدید سماج کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ دونوں ایک دوسرے سے حسد کیوں کریں؟ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زبان ممکنہ حد تک مالا مال ہو جائے اور یہ اس صورت میں کیوں کر ممکن ہے اگر ہم ہندی یا اردو کے الفاظ کو محض اس لیے دبانے کی کوشش کریں کہ وہ ہمارے مخصوص پس منظر سے لگا نہیں کھاتے۔ ہمیں دونوں کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہمیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ہندی کی ترقی کا مطلب ہے اردو کی ترقی اور اردو کی ترقی کا مطلب ہے ہندی کی ترقی۔ دونوں ایک دوسرے کو بھرپور انداز سے متاثر کریں گی لیکن دونوں کو خیالات اور الفاظ کے لیے اپنے دروازوں اور کھڑکیوں کو بالکل کھلا رکھنا ہوگا۔ دراصل میں چاہوں گا کہ ہندی اور اردو غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کا خیر مقدم کریں، انھیں اپنے اندر جذب کریں اور انھیں اپنا بنالیں۔ یہ بات بہت بری ہے کہ سنسکرت اور فارسی سے نئے الفاظ اخذ کرنے کی دھن میں انگریزی فرانسیسی یا کسی اور غیر ملکی زبان کے مانوس اور عام استعمال کے الفاظ کو نظر انداز کر دیا جائے۔

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اردو ایک دوسرے کے قریب آئیں گی اور اگر چہ ان کے لباس مختلف ہوں گے لیکن زبان بنیادی طور پر ایک ہی ہوگی۔ جو حلقے ان دونوں کو ایک کرنے کے حق میں ہیں وہ اتنے طاقتور ہیں کہ چند افراد مزاحمت نہیں کر پائیں گے۔ ہم میں قوم پرستی ہے اور ہندستان کو متحد رکھنے کا شدید جذبہ ہمارے دل میں موجود ہے اور یہ خواہش بار آور ثابت ہوگی۔ لیکن اس سے زیادہ مضبوط ہیں تیز تر ترسیل اور رسل و رسائل کے ذرائع اور ان کے اثرات، خیالات کے تبادلے کی رَو اور وہ انقلابی تبدیلیاں جو ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں رونما ہو رہی ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ عالمی پیمانے پر تبدیلی کی موج ہمارے پاس سے گذر رہی ہے، ہم اپنے تنگ خول میں بند نہیں رہ سکتے۔ تعلیم

جب عوام کے درمیان عام ہوگی تو لازمی طور پر اس سے معیار بندی بھی ہوگی اور نقش دوئی بھی مٹے گا۔

ہندی اور اردو کا جو الگ الگ ارتقا ہو رہا ہے اسے بھی ہمیں شک کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اردو کے پر جوش حامیوں کو اس نئی اسپرٹ کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو ہندی میں پیدا ہو رہی ہے اور ہندی کے عاشقوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس محنت کی یکساں طور پر قدر کریں جو اردو کو ترقی دینے کے لیے جاری ہے۔ وہ متوازی خطوط پر چلتے ہوئے کام کریں۔ دونوں ایک دوسرے سے کسی حد تک الگ ہو کر کام کریں گے لیکن ایک منزل پر پہنچ کر دونوں مل جائیں گے۔ بہر حال اگرچہ موجودہ علاحدگی پسندی کو ہم جان بوجھ کر برداشت کر رہے ہیں لیکن ہمیں ایک دوسرے سے مل جانے کے عمل میں معاونت کرنی چاہیے۔ اس یکجہتی کی بنیاد کیا ہوگی؟ یقیناً عوام۔ ہندی اور اردو کے درمیان عوام ہی کو مشترکہ عامل بننا پڑے گا۔ ہماری موجودہ مشکلات کی اصل وجہ وہ مصنوعی ادبی زبان ہے جو عوام سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ جب ادیب کچھ لکھتے ہیں تو آخر وہ کس کے لیے لکھتے ہیں؟ ہر ادیب کے ذہن میں شعوری یالاشعوری طور پر قارئین کا ایک حلقہ ضرور ہوتا ہے جسے وہ متاثر کرنا چاہتا ہے یا اس کے نقطۂ نظر میں تبدیلی لانا چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں بڑے پیمانے پر جو ناخواندگی ہے اس کے باعث افسوسناک طور پر ادبی حلقہ بہت محدود ہے لیکن اس کے باوجود وہ خاصا بڑا ہے اور اس میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ میں اس معاملے میں کوئی ماہر نہیں ہوں لیکن میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ ہندی اور اردو کا اوسط ادیب موجودہ قارئین کا بھی فائدہ نہیں اٹھا پا رہا ہے۔ وہ اس ادبی گروہ کے بارے میں زیادہ سوچتا ہے جس کے درمیان وہ گھومتا ہے۔ وہ انھی لوگوں کے لیے اسی زبان میں لکھتا ہے جس کی وہ داد دے سکیں۔ اس کی آواز اور اس کے الفاظ عوام کے بڑے حلقے تک نہیں پہنچ پاتے۔ اور اگر پہنچ بھی گئے تو سمجھ میں نہیں آتے۔ کیا اس میں حیرت کی کوئی بات ہے کہ اردو اور ہندی کتابوں کی فروخت بہت محدود پیمانے پر ہوتی ہے؟ حتیٰ کہ

ہمارے ہندی اور اردو کے اخبارات بھی اخبار پڑھنے والے بڑے حلقے کا احاطہ نہیں کر پاتے کیونکہ ان میں بھی جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ عام طور سے ادبی حلقے ہی کی ہوتی ہے۔

لہٰذا ہمارے ادیبوں کو سامعین یا قارئین کے وسیع تر حلقے کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے گویا وہ موکل یا خریدار ہوں اور قصداً انہی کے لیے لکھنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان خود بخود آسان ہوتی جائے گی اور مصنوعی سجاوٹ والی تراکیب اور بندشیں، جو ہمیشہ زبان کے زوال کا باعث بنتی ہیں، نئے، توانا اور موثر الفاظ کے لیے جگہ خالی کرتی جائیں گی۔ ہم اب بھی اس تصور سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکے ہیں کہ تہذیب اور زبان کی عظمتیں درباری حلقوں کی سرپرستی کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ اگر ہم اسی انداز سے سوچیں گے تو ہم اسی محدود دائرے کے اسیر رہیں گے اور عوام الناس کے ذہن اور دل تک ہماری رسائی نہیں ہو پائے گی۔ آج کی تہذیب کی جو عمارت ہے اس کی بنیاد عوام الناس ہوں گے اور زبان جس کی حیثیت تہذیب کے جسم جیسی ہوتی ہے' وہ بھی اسی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے۔

عوام دوستی کے اس رویے کا تعلق صرف آسان الفاظ اور محاوروں ہی سے نہیں بلکہ ان الفاظ اور محاوروں سے جڑی فکر اور گہرے متن سے بھی اتنا ہی ہے۔ وہ زبان جسے عوام تک رسائی حاصل کرنا ہے اسے عوامی مسائل کا غماز ہونا پڑے گا۔ ان کی خوشیوں اور غم' ان کی امیدوں اور آرزووں کی ترجمانی کرنا پڑے گی۔ اسے پوری عوامی زندگی کی آئینہ داری کرنے کا کام انجام دینا پڑے گا نہ کہ اعلا طبقے کے ایک چھوٹے سے حلقے کا۔ صرف اسی صورت میں زبان کی جڑیں اپنی مٹی میں پیوست ہو سکتی ہیں اور اسی سے اسے غذا بھی مہیا ہو سکتی ہے۔

اس بات کا اطلاق صرف ہندی اور اردو پر نہیں ہوتا بلکہ تمام ہندستانی زبانوں پر ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان تمام زبانوں میں یہ خیال گھر کرتا جا رہا ہے اور ان کا جھکاؤ زیادہ سے زیادہ عوام کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ اس عمل کو آگے بڑھنا ہے اور ہمارے ادیبوں کو دانستہ طور پر اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

میرے خیال میں یہ بات بھی مناسب ہوگی کہ ہماری زبانیں غیر ملکی زبانوں سے

بھی بڑے پیمانے پر ان کے قدیم ادب اور جدید کتابوں کے تراجم کے ذریعے رابطہ رکھیں۔اس کی وجہ سے ہم دوسرے ملکوں کی تہذیبی،ادبی اور سماجی تحریکوں سے واقف ہو سکیں گے اور خود ہماری زبانیں بھی تازہ خیالات کی آمیزش سے توانائی حاصل کر سکیں گی۔

ذار غور کیجیے۔ تمام ہندستانی زبانوں میں شاید تنہا بنگلہ ہی وہ واحد زبان ہے جس نے عوام سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ادبی بنگلہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو عام زبان سے کچھ زیادہ مختلف ہے یا بنگال کی عوامی زندگی سے دور ہے۔ایک رویندر ناتھ ٹیگور کی دانشوری نے اعلا طبقے کے چند افراد اور عوام کے درمیان حائل فاصلے کو ختم کرنے کا کام انجام دیا اور آج ان کے خوبصورت گیت اور نغمے غریبوں کی جھونپڑیوں میں بھی سنائی دیتے ہیں۔ان لوگوں نے نہ صرف بنگلہ ادب کو مالامال کیا بلکہ بنگال کی عوامی زندگی کی بھی تربیت کی اور اپنی زبان کو اتنا طاقتور ذریعہ اظہار بنایا کہ آسان لفظیات میں بہترین ادب پارے تخلیق کیے جانے لگے۔ یہ سب کچھ پوچھنے کے لیے ہم کوئی نابغۂ روزگار نہیں پیدا کر سکتے لیکن اس مثال سے سبق حاصل کر سکتے ہیں اور اسی کے مطابق زبان کو ایک خاص شکل میں ڈھال سکتے ہیں۔اس ضمن میں گجراتی کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ گاندھی جی کی آسان اور طاقتور زبان کا جدید گجراتی تحریروں پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔

اب ہم ہندستانی کے کل ہند زبان ہونے کے دوسرے پہلوؤں پر غور کریں اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ یہ عظیم صوبائی زبانوں کی حریف نہیں ہے۔اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ ان کی قلمرو میں دراندازی کرے گی۔اس لیے ہم رسم خط کے سوال کو زیر بحث نہ لائیں کیوں کہ دونوں رسم خط کا پورے طور پر استعمال ہوگا۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم ہر شخص کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ دونوں رسم خط سیکھے۔یہ عوام پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوگا۔ریاست دونوں رسم خط کی حوصلہ افزائی کرے گی اور متعلقہ طلبہ یا ان

کے والدین کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ اب ہم رسم خط سے قطع نظر اس زبان کی خوبی پر غور کریں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہندستانی بہت بڑے علاقے کا احاطہ کرتی ہے، کل ہند زبان کی حیثیت سے اس کی کچھ اور بھی خوبیاں ہیں۔ اسے سیکھنا تو نسبتاً آسان ہے ہی اس کی قواعد بھی آسان ہے سوائے اس کے کہ تذکیر و تانیث کے سلسلے میں تھوڑی الجھن ہوتی ہے۔ کیا ہم اسے کچھ اور آسان بنا سکتے ہیں؟

ہماری رہنمائی کے لیے قابل ذکر حد تک کامیاب ایک تجربہ "بیسک انگلش" کا ہے۔ متعدد اسکالرز نے برسوں کی محنت کے بعد ایک آسان سی انگریزی وضع کی جو بنیادی طور پر انگریزی ہی ہے' اور اسے عام انگریزی سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود اسے سیکھنا حیرت انگیز حد تک آسان ہے۔ چند آسان سے اصولوں کے سوا قواعد اس میں سرے سے غائب ہے اور الفاظ کے بنیادی ذخیرے کو کم کر کے 980 الفاظ تک محدود رکھا گیا ہے۔ ان میں سائنسی، تکنیکی اور تجارتی اصطلاحات شامل نہیں ہیں۔ پورے ذخیرۂ الفاظ اور قواعد کو کاغذ کے ایک ہی ٹکڑے پر سمیٹا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی ذہین آدمی دو یا تین ہفتوں میں اسے سیکھ سکتا ہے۔ البتہ نئی زبان کے استعمال میں مشق کی ضرورت پیش آئے گی۔

اس تجربے کو "وولاپک" اور "ایسپرنٹو" وغیرہ کے نام سے ایک عالمی زبان وضع کرنے کی پچھلی کوششوں سے خلط ملط نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس طرح کی تمام زبانیں ہر چند کہ آسان تھیں لیکن حددرجہ مصنوعی تھیں اور انھیں سیکھنا ایک اضافی بوجھ تھا۔ انھیں جینے کے لیے سانس میسر نہ آسکی اور وہ عوام کے بڑے طبقے کی زبانیں نہ بن پائیں۔ بنیادی انگریزی ان زبانوں کی تمام خوبیوں سے تو آراستہ تھی لیکن ان کی خامیوں سے بچی رہی کیوں کہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ جو لوگ بنیادی انگریزی سیکھتے ہیں، ان کے پاس نہ صرف یہ کہ دوسروں سے رابطہ قائم کرنے کا ایک آسان اور بہتر وسیلہ ہوتا ہے بلکہ وہ معیاری انگریزی کے بھی قریب پہنچ جاتے ہیں اور اگر چاہیں تو اس جانب مزید پیش رفت کر سکتے ہیں۔

بنیادی انگریزی کے تئیں میری اس موافقانہ رائے کے پیش نظر کچھ لوگ یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ پھر اسی کو کیوں نہ کل ہند زبان بنادیا جائے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ تمام تر خوبیوں کے باوجود یہ ہمارے عوام کے لیے اجنبی ہے۔ اگر ہم ان پر اسے کل ہند زبان کے طور پر لادنا چاہیں گے تو یہ قدم انھیں ایک جگہ سے جڑ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ جمانے کے مترادف ہوگا۔ عملی دشواریاں بھی ہندستانی کے نافذ کیے جانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوں گی کیوں کہ ہندستانی پورے ہندستان میں پہلے ہی سے بڑے پیانے پر مقبول ہے۔

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ انگریزی کو جہاں بھی ہم غیر ملکی زبان کے طور پر پڑھائیں (اور یہ کام ہمیں بڑے پیانے پر کرنا ہوگا) وہاں بنیادی انگریزی ہی کی تعلیم کا بندوبست کریں البتہ جو لوگ انگریزی زبان کا خصوصی مطالعہ کرنا چاہیں گے وہ معیاری انگریزی کی جانب قدم بڑھا سکتے ہیں۔

ہندستان کی قومی زبان

کیا ہم "بیسک انگلش" کے طرز پر "بیسک ہندستانی" وضع کر سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اگر ہمارے اسکالرز اس جانب توجہ دیں تو اسے بہ آسانی ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ قواعد کو اس حد تک آسان بنایا جائے جس حد تک ممکن ہو: تقریباً نہیں کے برابر۔ پھر بھی زبان کی موجودہ قواعد کے لیے اسے ضرر رساں نہیں ثابت ہونا چاہیے۔ بنیادی بات یہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ اگرچہ یہ بنیادی زبان تمام غیر تکنیکی خیالات کے اظہار کے لیے اپنے آپ میں مکمل ہے لیکن زبان کے مزید مطالعے کے لیے اسے ابتدائی سنگِ میل سمجھنا چاہیے۔ ذخیرۂ الفاظ کم و بیش ایک ہزار الفاظ پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ الفاظ ہندستانی زبانوں میں مشترکہ ہیں اور بے ترتیب نہیں چنے گئے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے آپ

میں مکمل ہیں اور عام بول چال اور لکھائی میں کسی باہری سہارے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔

ایسی ہی بنیادی ہندستانی کو کل ہند زبان ہونا چاہیے ریاست کی معمولی کوشش سے یہ انتہائی تیزی سے پورے ملک میں پھیلے گی اور قومی یکجہتی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ یہی ہم سب کی خواہش بھی ہے۔ یہ ہندی اور اردو کو قریب لائے گی اور ملک گیر پیمانے پر لسانی یکجہتی کو فروغ دینے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ جب اس طرح کی ٹھوس اور مشترکہ بنیاد پڑ جائے گی تو بھلے ہی تھوڑا بہت اختلاف رہے یا کہیں کوئی کمی بیشی ہو جائے، ،اس سے علاحدگی پسندی کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی۔ جو لوگ اپنے ہندستانی کے علم میں اضافہ کرنا چاہیں گے وہ آسانی سے ایسا کر سکیں گے لیکن جن کا علم بنیادی ہندستانی تک محدود رہے گا وہ بھی قومی زندگی میں وسیع پیمانے پر شریک ہو سکیں گے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ہندی اور اردو کی ترقی الگ الگ خطوط پر ہونے کے باوجود ہمیں اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ کسی بھی سمت سے آنے والے نئے الفاظ ہمارے ورثے کو توانا بنائیں گے بشرطیکہ وہ کار آمد اور زندہ الفاظ ہوں اور حالات نے ہماری زبان میں داخل کر دیا ہو یا خود عوام کی طرف سے آئے ہوں۔ لیکن ان مصنوعی الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی جنھیں حقیقتاً شرف قبولیت حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں بڑے پیمانے پر سیاسی، اقتصادی، سائنسی اور تجارتی اصطلاحات کے لیے مصنوعی الفاظ بھی وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایسے الفاظ وضع کرتے وقت ہمیں نقالی اور علاحدگی پسندی سے بچنا چاہیے۔ میرے خیال میں ہمیں اتنی جرأت پیدا کرنی چاہیے کہ اُن غیر ملکی الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں عمومی طور پر رائج ہو چکے ہیں۔ انھیں ہم ہندستانی الفاظ کے طور پر تسلیم کر لیں، میرا تو خیال ہے کہ ایسے الفاظ کو تمام تر ہندستانی زبانوں میں داخل کر لیا جائے، اس سے ہمارے عوام کو یہ آسانی ہوگی کہ وہ تکنیکی اور سائنسی موضوعات کو مختلف ہندستانی اور غیر ملکی زبانوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ اس کی بجائے کوئی دوسرا راستہ اختیار

کرنے سے ذہنی انتشار اور الجھن کی کیفیت پیدا ہوگی اور طلبہ کو بڑے پیانے پر تکنیکی اصطلاحات سیکھنے میں پریشانی ہوگی کیوں کہ انھیں اکثر اہم کتابیں دوسری زبانوں میں پڑھنا پڑتی ہیں۔ ایک الگ اور مخصوص سائنسی لفظیات وضع کرنے کی کوشش ہماری سائنسی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے گی اور اس سے نہ صرف پڑھنے والوں پر بلکہ پڑھانے والوں پر بھی یکساں طور پر ناقابلِ برداشت بوجھ پڑے گا۔ عوامی زندگی اور عالمی معاملات سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک ہی کل کے جزو ہیں۔ ہمیں اپنے عوام کے لیے انھیں آسان بنانا ہوگا تاکہ وہ سمجھ سکیں اور پورے عمل میں شریک ہو سکیں۔ اسی طرح غیر ممالک کے لوگ بھی ہماری عوامی زندگی سے باخبر ہو سکیں۔

بہت سے غیر ملکی الفاظ لیے جا سکتے ہیں اور لیے جانے چاہئیں، لیکن بہت سے تکنیکی الفاظ ہمیں اپنی زبان سے بھی لینے چاہئیں۔ مناسب تو یہ ہوگا کہ لسانیات اور تکنیکی اصطلاحات کے ماہرین عام استعمال کے لیے ایسے الفاظ کی ایک فہرست مرتب کریں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اُن مراحل میں پہنچ کر یکسانیت اور فصاحت نظر آئے گی جہاں مبہم قسم کے الفاظ سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں بلکہ بے تکے محاوروں اور روزمرہ کے استعمال پر بھی روک لگائی جا سکے گی۔ ہمارے صحافی دوستوں کو معنی و مفہوم سے بے نیاز ہو کر غیر ملکی الفاظ اور محاوروں کا لفظی ترجمہ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کے بعد بھی کمزور الفاظ کھرے سکے کی طرح استعمال میں آنے لگتے ہیں اور خیالات کی سطح پر الجھن پیدا کر دیتے ہیں۔ ٹریڈ یونین کا ترجمہ کبھی کبھی "وپاپار سنگھ" کیا جاتا ہے جو پورے طور پر لفظی ترجمہ ہے لیکن یہ حقیقی معنی سے بہت دور ہے۔ لیکن منتخب تراجم میں ایک ترجمہ Imperial preference کا ہے اس کا ترجمہ ایک سلیقہ مند صحافی نے "شاہی پسند" کیا ہے۔

تو پھر زبان کے تئیں ریاست کی پالیسی کیا ہوگی؟ ریاست اس کا فیصلہ عدالت، دفاتر اور تعلیم سے متعلق ضروریات کو سامنے رکھ کر کرتی ہے۔ ریاست سے متعلق امور کے

لیے ہر صوبے کی سرکاری زبان، صوبائی زبان ہی ہونی چاہیے لیکن ہر جگہ ہندستانی کو بھی کل ہند زبان کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے اور اس میں جو دستاویزات ہوں انھیں دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط میں قبول کیا جانا چاہیے۔ جن صوبوں میں ہندستانی بولی جاتی ہے وہاں دونوں رسم خط کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے اور ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی عدالت یا دفتر کو، ان دونوں میں سے کسی بھی رسم خط کے توسط سے مخاطب کرے۔ اس پر یہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے کہ وہ دوسرے رسم خط میں بھی ایک نقل فراہم کرے۔ دفتر یا عدالت موقعے موقعے سے کسی بھی ایک رسم خط کا استعمال کر سکتے ہیں لیکن یہ اصول نافذ کرنا بے تکی سی بات ہوگی کہ ہر کام دونوں رسم خط میں ہوگا۔ جس علاقے میں دفتر یا عدالت واقع ہو وہاں اسی رسم خط کو بالادستی حاصل ہونی چاہیے جو اُس علاقے میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن سرکاری احکام دونوں رسم خط میں جاری ہونے چاہئیں۔

ریاست کا تعلیمی نظام اس اصول کا پابند ہونا چاہیے کہ طلبہ کو انھی کی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس طرح ہر لسانی علاقے میں اسی علاقے کی زبان کو "ذریعۂ تعلیم" ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ جہاں کہیں بھی کسی لسانی گروپ کے لوگوں کی تعداد معقول ہو، بھلے ہی وہ دوسرے لسانی علاقے میں رہتے ہوں، وہاں وہ ریاست سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ایسا خصوصی انتظام کیا جائے جس کے تحت وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن اس کا انحصار بلاشبہ اس بات پر ہوگا کہ ایسے طلبہ ایک خاص مرکز سے آسانی سے رابطہ قائم کر سکیں۔ اس کا اطلاق ابتدائی تعلیم پر ہوگا اور اگر طلبہ کی تعداد قابل ذکر ہو تو ثانوی تعلیم کا بھی احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کلکتے میں ذریعۂ تعلیم بنگلہ ہوگی لیکن وہاں ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑی ہے جن کی مادری زبان ہندستانی، تمل، تیلگو اور گجراتی وغیرہ ہے۔ ان میں سے ہر گروپ ریاست سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ ان کے پرائمری اسکول انھی کی زبان میں چلانے کی اجازت دی جانی چاہیے لیکن اس کا اطلاق ثانوی تعلیم پر کس حد تک ہوگا اس کے بارے میں میرا کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کا انحصار طلبہ

کی تعداد اور بعض دوسرے عوامل پر ہوگا۔ان طلبہ کو بنگلہ بہر حال سیکھنا پڑے گی کیونکہ یہ اس لسانی علاقے کی زبان ہے جہاں وہ رہ رہے ہیں لیکن اس کا اطلاق ثانوی سطح کے ابتدائی مرحلے میں اور اس کے بعد ہونا چاہیے۔

جن صوبوں میں ہندستانی بولی جاتی ہے وہاں اسکولوں میں ہندی اور اردو دونوں رسم خط سکھائے جائیں گے۔ طلبہ یا ان کے والدین کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ پرائمری سطح پر صرف ایک ہی رسم خط کا استعمال ہونا چاہیے لیکن ثانوی سطح پر دوسرا رسم خط سیکھنے کے لیے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ جن صوبوں میں ہندستانی نہیں بولی جاتی وہاں بنیادی ہندستانی ثانوی سطح پر سکھائی جانی چاہیے۔رسم خط کا انتخاب متعلقہ طلبہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

یونیورسٹی سطح کی تعلیم لسانی علاقے کی زبان میں ہونی چاہیے اور ہندستانی (کسی ایک رسم خط میں)اور ایک غیر ملکی زبان لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جانی چاہیے لیکن اس لازمی مضمون کا اطلاق ٹکنکل اسکولوں اور اعلا تکنیکی نصاب پر نہیں ہونا چاہیے۔ غیر ملکی اور اپنی کلاسکی زبانیں پڑھانے کا انتظام ثانوی اسکولوں میں ہونا چاہیے لیکن انھیں لازمی مضمون کی حیثیت نہیں دی جانی چاہیے۔البتہ کچھ خاص نصابوں یا یونیورسٹی سطح کی تیاری کے لیے انھیں لازمی بنایا جاسکتا ہے۔

صوبائی زبانوں کے ضمن میں پشتو اور پنجابی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم تو ان زبانوں میں دی جاسکتی ہے لیکن اعلا تعلیم کس سطح تک ان زبانوں کے ذریعے دی جاسکتی ہے یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔اس امر پر غور کرنا پڑے گا کیوں کہ یہ زبانیں ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ان علاقوں میں شاید ہندستانی ،اعلا تعلیم کے لیے بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔

میں نے ہمہ گیر قیاس سے پرائمری سے لے کر یونیورسٹی سطح کی تعلیم تک کے لیے تجاویز پیش کر دیں لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر آسانی سے تنقید ہوسکتی ہے اور یہ

اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں کس طرح کی دشواریاں پیش آسکتی ہیں کیوں کہ میں نہ تو تعلیمی امور کا ماہر ہوں اور نہ زبان کا۔ لیکن میرا غیر ماہرانہ مشاہدہ شاید میرے حق میں جاتا ہے اور میں اس مسئلے پر ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے غور کر سکتا ہوں۔۔۔ میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مقالے میں تعلیم سے متعلق اہم اور مشکل مسائل پر مجموعی طور سے بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف زبان سے متعلق پہلو پر گفتگو کر رہا ہوں۔ جب ہم تعلیم کے مسئلے پر مجموعی طور پر غور کریں گے تب ہم اُس ریاست اور سماج کے تعلق سے بات کریں گے جو ہمارے پیش نظر ہے۔ ہمیں اُس جانب اپنے عوام کی رہنمائی کرنی ہوگی۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ہمارے شہری کیسے ہوں اور کون سا پیشہ اختیار کریں۔ ہمیں تعلیم سے ان کی زندگی اور روزگار کو جوڑنا پڑے گا۔ ہمیں ان کی ذاتی ،سماجی اور عوامی زندگی کے درمیان ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا پڑے گا۔ اگر جدید دنیا میں ہمیں کوئی مقام بنانا ہے تو ہمیں تکنیکی اور سائنسی تربیت پر زور دینا ہوگا۔ ہمیں یہ سب کچھ تو کرنا ہی ہے،اس سے زیادہ بھی کچھ کرنا ہے اور ایسا کرتے وقت ہمیں تعلیم کے موجودہ خام، ناقص اور حد سے زیادہ بوجھل نظام کو ڈھا کر نئے سرے سے ایک ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالنا ہوگی جو زیادہ بہتر اور محفوظ ہو۔

لیکن سردست تو زبان کے مسئلے تک ہم اپنے آپ کو محدود رکھیں اور اس سلسلے میں عام اتفاق رائے قائم کرنے کی کوئی صورت نکالیں۔ میں نے یہ مقالہ اس ارادے سے لکھا ہے کہ ایک وسیع تر زاویے سے اس مسئلے پر غور وخوض کرنے کی دعوت دی جائے۔ میں نے جن عام اصولوں سے بحث کی ہے ان پر اگر ہم اتفاق کرلیں تو انھیں بروے عمل لانا دشوار نہ ہوگا۔ نام نہاد صوبائی خود اختیاری کے باوجود ہم آج اس حالت میں نہیں ہیں کہ ان میں سے بیشتر اصولوں کو نافذ کر سکیں۔ ہمارے پاس مالی وسائل نہیں ہیں اور ہمارے ہاتھ کئی اعتبار سے بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن جس حد تک ہم انھیں بروے عمل لا سکتے ہیں،اس حد تک تو ہمیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔

ممکن ہے کہ میں نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں سے کچھ پر عام اتفاق ہو جائے اور کچھ پر نہ ہو۔ کم از کم اتنی بات تو ہماری سمجھ میں آجائے گی کہ ہم کن کن باتوں پر متفق ہیں۔ اس کے بعد بحث و مباحثہ کے لیے جو نکات رہ جائیں گے ان کی تعداد محدود ہو گی اور ان پر ہم الگ سے غور کر سکتے ہیں۔

ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ میں نے کئی بار جو "لسانی علاقوں" اور "صوبے کی زبان" کے حوالے دیے ہیں، وہ اس بات کے لازماً متقاضی ہیں کہ صوبائی اکائیاں، اس طرح کے لسانی علاقوں سے مطابقت پیدا کریں۔

اس بات کو آسان بنانے کے لیے میں ذیل میں اپنی خاص تجاویز پیش کر رہا ہوں:

(1) ہمارا سرکاری کام کاج لسانی علاقے کی زبان میں ہونا چاہیے اور ریاست کو تعلیم بھی اسی زبان میں دینی چاہیے۔ یہ زبان وہ ہو، جسے اس علاقے میں بالادستی حاصل ہو۔ جو زبانیں اس مقصد کے لیے سرکاری طور پر تسلیم کی جائیں گی ان کے نام ہیں: ہندستانی (ہندی اور اردو دونوں) بنگلہ، گجراتی، مراٹھی تمل، تیلگو، کنڑ، ملیالم، اڑیہ، آسامی، سندھی اور کسی حد تک پشتو اور پنجابی۔

(2) ہندستانی کے علاقوں میں جہاں ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہو گی وہاں دونوں رسم خط کو تسلیم کیا جانا چاہیے ۔ سرکاری اعلانات واحکامات دونوں رسم خط میں جاری ہونے چاہئیں۔ عدالت یا سرکاری دفاتر سے رجوع کرنے کے لیے کوئی بھی شخص دونوں میں سے کسی بھی رسم خط کو استعمال کر سکتا ہے اور اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ دوسرے رسم خط میں بھی نقل فراہم کرے۔

(3) ہندستانی کے علاقوں میں چونکہ ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہو گی اس لیے دونوں رسم خط کو تسلیم اور استعمال کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہر طالب علم یا اس کے والدین کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ کسی بھی رسم خط کا انتخاب کریں۔ بچوں کو دونوں رسم خط سیکھنے پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیے لیکن ثانوی سطح پر ایسا کرنے کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔

(4) ہندستانی (دونوں رسم خط) کو کل ہند زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔ اس کی اس حیثیت کی وجہ سے پورے ہندستان میں اس بات کی اجازت ہوگی کہ کوئی بھی شخص عدالت یا سرکاری دفاتر سے ہندستانی (دونوں رسم خط) میں خطاب کر سکتا ہے اور اس کے لیے اسے دوسرے رسم خط یا کسی دوسری زبان میں نقل فراہم کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔

(5) اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ دیوناگری، بنگلہ، گجراتی اور مراٹھی کو کسی ایک رسم خط میں ڈھالا جاسکے اور وہ مشترکہ رسم خط ایسا ہو کہ چھپائی اور ٹائپنگ نیز جدید میکانیکی آلات کے استعمال میں موزوں ثابت ہو۔

(6) سندھی رسم خط کو اردو رسم خط میں ضم کر دینا چاہیے اور اسے ممکنہ حد تک آسان بنانا چاہیے تاکہ چھپائی اور ٹائپنگ میں بھی دشواری پیش نہ آئے۔

(7) ایک ایسا راستہ تلاش کیا جانا چاہیے کہ جنوبی ہند کی زبانوں اور دیوناگری کے درمیان مطابقت پیدا ہو سکے۔ اگر اسے ناممکن تصور کیا جائے تو اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ جنوبی ہند کی زبانوں تمل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم کے لیے کوئی مشترکہ رسم خط وضع کیا جاسکے۔

(8) ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ اپنی زبانوں کے لیے لاطینی رسم خط کے استعمال کی بات سوچ سکیں، کم از کم اس وقت تو بالکل ہی نہیں سوچ سکتے اور اس حقیقت کے باوجود نہیں سوچ سکتے کہ اس رسم خط کو کئی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ گویا ہمیں دو رسم خط کی ضرورت ہے: دیوناگری بنگلہ، گجراتی اور مراٹھی کا مخلوط اور اردو اور سندھی کا مشترکہ رسم خط اور جب تک کہ جنوبی ہند کی زبانوں کی اول الذکر سے مطابقت نہیں پیدا ہو جاتی اس وقت تک کے لیے اگر ضروری ہو تو ان زبانوں کا بھی ایک مشترکہ رسم خط وضع کر لیا جائے۔

(9) ہندستانی کے علاقے میں ہندی اور اردو کو الگ الگ زبان کے طور پر فروغ دینے کے رجحان کو خطرے کی گھنٹی نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی ان میں سے کسی کی ترقی کی راہ

میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ عمل کسی حد تک فطری ہے کہ اس طور پر نئے اور زیادہ بلیغ خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں کی ترقی زبان کو توانائی عطا کرے گی۔ یہ بات یقینی ہے کہ آگے چل کر مطابقت پیدا ہو جائے گی کیوں کہ عالمی عوامل اور قوم پرستی کا جذبہ اسی سمت چلنے پر مجبور کرے گا اور عام تعلیم معیار بندی اور یکسانیت پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔

(10) ہمیں زبانوں (ہندی، اردو، نیز دوسری ہندستانی زبانوں) پر یہ زور دینا چاہیے کہ وہ عوام کی طرف دیکھیں اور ان سے رشتہ استوار کریں۔ ادیبوں کو چاہیے کہ وہ عوام کے لیے آسان زبان میں لکھیں تاکہ وہ سمجھ سکیں۔ تخلیق کاروں کو ان مسائل پر قلم اٹھانا چاہیے جو براہِ راست عوام کو متاثر کرتے ہیں۔ درباری اور مصنوعی طرزِ تحریر اور آرائشی جملوں اور محاوروں کی حوصلہ شکنی کر کے آسان طرزِ تحریر کو فروغ دینا چاہیے۔ اس سے جو دوسرے فائدے ہوں گے ان سے قطع نظر، ہندی اور اردو کے درمیان یکسانیت بھی پیدا ہو گی۔

(11) "بیسک انگلش" کے طرز پر ہندستانی سے ایک "بیسک ہندستانی" وضع کی جانی چاہیے۔ یہ ایک آسان زبان ہونی چاہیے جس میں قواعد بہت کم ہو اور ذخیرۂ الفاظ ایک ہزار کے قریب الفاظ پر مشتمل ہو۔ اسے ایک مکمل زبان ہونا چاہیے، ایسی زبان جس کا ذخیرہ بول چال کے لیے معقول ثابت ہو پھر بھی وہ ہو "ہندستانی" ہی کے دائرے میں اور اس زبان کے مزید مطالعے کے لیے پہلا سنگ میل ثابت ہو۔

(12) بیسک ہندستانی سے قطع نظر ہمیں سائنسی، تکنیکی، سیاسی اور تجارتی اصطلاحات کی ایک فہرست بھی مرتب کرنی چاہیے تاکہ انھیں "ہندستانی" (ہندی اردو) میں استعمال کیا جا سکے اور ممکن ہو تو دوسری ہندستانی زبانوں میں بھی۔ جہاں ضروری ہو یہ الفاظ غیر ملکی زبانوں سے لے کر اپنی زبان میں جذب کر لینا چاہیے۔ ایسے الفاظ کی بھی فہرست مرتب کی جانی چاہیے جس میں ہماری اپنی زبانوں کے الفاظ ہوں تاکہ تکنیکی اور اس طرح کے دوسرے معاملات کے لیے ہمارے پاس ایک مختصر اور یکساں فرہنگ موجود رہے۔

(13) ریاست کی تعلیمی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ بچوں کو تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی

جائے۔اس طرح کے لسانی علاقوں میں پرائمری سے لے کر یونیورسٹی سطح تک کی تعلیم صوبائی زبان میں دی جائے گی۔اور اگر ایک لسانی علاقے کے اندر بھی ایسے طلبہ کی معقول تعداد موجود ہے جن کی مادری زبان کوئی دوسری ہندستانی زبان ہے تو انھیں یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ پرائمری تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں بشرطیکہ کسی ایسے مخصوص مرکز تک ان کی رسائی آسانی سے ممکن ہو۔مزید برآں اگر طلبہ کی تعداد خاصی معقول ہو تو ثانوی تعلیم کا انتظام بھی ان کی مادری زبان میں کیا جاسکتا ہے۔لیکن ایسے تمام طلبہ کو اس لسانی علاقے کی زبان بھی لازمی مضمون کے طور پر سیکھنا ہوگی جہاں وہ رہتے ہیں۔

(14) غیر ہندستانی علاقوں میں بنیادی ہندستانی پڑھانے کا انتظام ثانوی سطح پر ہونا چاہیے۔البتہ رسم خط کے انتخاب کا معاملہ متعلقہ امیدوار پر چھوڑ دینا چاہیے۔

(15) یونیورسٹی کی سطح پر ذریعۂ تعلیم ،لسانی علاقے کی زبان ہوگی۔ہندستانی (دونوں میں سے کوئی بھی رسم خط)اور ایک غیر ملکی زبان لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے گی لیکن اضافی زبان سیکھنے کی یہ شرط اعلا تکنیکی نصاب پر عائد نہیں ہوگی اگرچہ زبان کا علم وہاں بھی مناسب تصور کیا جائے گا۔

(16) غیر ملکی زبانیں نیز اپنی کلاسیکی زبانیں پڑھانے کے لیے ثانوی سطح پر انتظام کیا جانا چاہیے لیکن انھیں لازمی مضمون بنانے کی شرط نہیں ہوگی البتہ کسی خصوصی نصاب یا یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تیاری کے مرحلے میں لازمی قرار دیا جاسکتا ہے۔

(17) غیر ملکی کلاسیکی اور جدید ادب کا بڑے پیمانے پر ہندستانی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ ہماری زبانیں دوسرے ممالک کی تہذیبی ادبی اور سماجی تحریکوں سے آشنا ہوں اور استحکام حاصل کریں۔

راجندر پرساد

میں ہندستانی اس زبان کو کہوں گا جسے شمالی ہند کے تمام باشندے سمجھتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ یہ ناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ کانگریس اسے ہندستان کی قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے اور کوشش اس بات کی کی جارہی ہے کہ اسے ملک کے ان حصوں میں مقبول بنایا جائے جہاں اسے نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وجہ سے اس کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

اس زبان کا حقیقی کردار کیا ہونا چاہیے ؟ اس سوال پر بہت کچھ لکھا اور کہا جارہا ہے۔ بہر حال ہم یہ تو مانتے ہی ہیں کہ ہندستانی کے دو روپ ہیں۔ ایک ہندی کہلاتی ہے جس میں سنسکرت کے بہت زیادہ الفاظ ہیں۔ دوسری کا نام اردو ہے جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی افراط ہے۔ اگرچہ دونوں کی قواعد ایک ہی ہے لیکن جب یہ لکھی جاتی ہیں تو ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہو جاتی ہیں اور یہ فرق بڑھتا ہی جارہا ہے کیونکہ سنسکرت الفاظ کو اکثر ہندی قواعد کے بجائے سنسکرت قواعد کے اصولوں کے تحت استعمال کیا جاتا ہے جبکہ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرتے وقت کبھی کبھی انہی زبانوں کی قواعد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ کچھ قدامت پسند ادیب ایسے ہیں جو بعض تعصبات کے زیر اثر، اگر خالص ہندی کے پرستار ہیں تو وہ عربی اور فارسی کے تمام تر الفاظ کو اپنی تحریروں سے خارج کر دیتے ہیں۔ اسی طرح خالص اردو کا دم بھرنے والے ادیب سنسکرت کے تمام الفاظ کو نکال باہر کرتے ہیں۔ سو اس طرح کے ادیب اصولی طور پر سنسکرت، عربی اور فارسی کے الفاظ سے زبان کو بوجھل بنا رہے ہیں۔ یہی وہ اصل رجحان ہے جو ہندی اور اردو کے درمیان فاصلہ بڑھاتا جارہا ہے جس کے باعث دونوں زبانیں ایک دوسرے سے دور ہو گئی ہیں۔ ہندستانی درمیانہ راستہ اختیار کرتی ہے۔ یہ نہ تو سنسکرت الفاظ سے پرہیز کرتی ہے اور نہ عربی

اور فارسی کے الفاظ سے کتراتی ہے۔اس کی اپنی قواعد ہے اور غیر ضروری طور پر یہ عربی فارسی یا سنسکرت قواعد کے اصولوں کو نہیں مانتی۔نہ صرف یہ کہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو یہ قبول کر لیتی ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنا رنگ روپ بھی عطا کرتی ہے۔

اپنے طور پر مجھے ہندی۔اردو تنازعے کا ایک ہی حل نظر آتا ہے۔وہ یہ کہ ہمیں دانستہ طور پر ہندستانی میں ان تمام فارسی اور عربی الفاظ کو شامل کر لینا چاہیے جو ہندی کے اچھے ادیب استعمال کرتے ہیں۔اسی طرح ان تمام سنسکرت الفاظ کو ہندستانی کا حصہ بنالینا چاہیے جو اردو کے اچھے ادیب استعمال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ہندستانی میں نئے الفاظ شامل کرنے کا پیمانہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی ایک خاص زبان سے الفاظ اخذ کیے جائیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتنی آسانی سے عوام کسی لفظ کو قبول کر لیتے ہیں۔اگر وہ کسی لفظ کو آسانی سے رائج کر کے اسے عام فہم بناسکتے ہیں تو اسے زبان سے خارج کرنا ایک غلطی ہو گی کیونکہ یہ عمل ہندستانی زبان کو کمزور بنانے کے مترادف ہوگا۔

آج کل نئے خیالات کے زیر اثر بہت سے نئے الفاظ داخل ہوتے جارہے ہیں۔بعض معاملات میں ہندی اور اردو کے موجودہ الفاظ اظہار خیال کا مناسب وسیلہ نہیں ثابت ہو رہے ہیں لہٰذا سنسکرت، عربی یا فارسی سے نئے الفاظ لینا ہی پڑیں گے۔اس صورت میں دیکھنا یہ چاہیے کہ کیا نئے الفاظ عوام آسانی سے سمجھ لیں گے اور انھیں استعمال بھی آسانی سے کر سکیں گے۔ہمیں انگریزی کے بعض الفاظ بھی لینے چاہئیں۔ہمیں اپنی زبان کو کنگال بہر حال نہیں بنانا ہے لیکن اتنا خیال ضرور رکھنا ہے کہ اپنی قواعد کے اصولوں کی سختی سے پابندی کریں ۔اس طرح اسٹیشن کی جمع ہمیں Stations(اسٹیشنس) نہیں بلکہ اسٹیشنوں یا اسٹیشنیں بنانا چاہیے۔اسی طرح رائے دینے والا کی جگہ اگر ہم رائے دہندہ استعمال کریں تو کسی بھی حال میں اس کی جمع "رائے دہندگان" نہ بنائیں بلکہ "رائے دہندوں" یا "رائے دہندے" استعمال کریں۔

چنانچہ میرا خیال یہ ہے کہ اپنی قواعد کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے ہمیں کسی

بھی زبان کا لفظ آزادانہ طور پر ہندستانی میں شامل کرنا چاہیے بشرطیکہ وہ مقبول ہو چکے ہوں یا جن کے بارے میں امید ہے کہ بہ آسانی سمجھ لیے جائیں گے اور مقبول ہو جائیں گے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو مختلف زبانوں کے الفاظ لے کر ہم ہندستانی کو مالا مال کریں گے۔ شروع شروع میں تو ایک معنی کے کئی لفظ ہوں گے لیکن رفتہ رفتہ جب ہماری زبان کا ذخیرہ وقیع ہو جائے گا تو یہی الفاظ مختلف معانی کے حامل ہو جائیں گے اور خیالات کے خوبصورت طرزِ اظہار سے آشنا کرائیں گے۔ اسی وجہ سے میں ایسی کسی بھی کوشش کے خلاف ہوں جس کا مقصد بعض الفاظ کو دانستہ طور پر زبان سے خارج کرنا ہے۔

جہاں تک ادبی زبان کا تعلق ہے یہ عام بول چال کی زبان سے خاصی مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا مشترکہ قواعد کے باوجود ہندی اور اردو کا ادبی سرمایہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے اور یہ فاصلہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ یہ بات بالکل واضح طور پر نظر آتی ہے کہ جن لوگوں نے سنسکرت یا انتہائی سنسکرت آمیز ہندی کا مطالعہ کیا ہے ان کا رجحان ایک ایسی زبان کی طرف ہوگا جس میں سنسکرت کے عناصر زیادہ ہوں گے۔ اسی طرح جن لوگوں نے فارسی اور عربی کا زیادہ مطالعہ کیا ہوگا ان کی تحریروں میں ان دونوں زبانوں کے الفاظ نظر آئیں گے۔ یہ رجحان قدرتی نوعیت کا ہوگا جس پر آسانی سے روک نہیں لگائی جاسکتی۔ لیکن اس کے باوجود ہندستانی جو قومی زبان بننے کی دعویدار ہے اس شکل میں باقی رہے گی کہ اسے سب لوگ تسلیم کر سکیں اور اپنا سکیں نیز یہ کہ اس کی ترقی کے لیے ہر شخص اپنی خدمات پیش کر سکے۔

ہم ہندستانی کو ہندی یا اردو سے مختلف نہیں تصور کرتے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ کسی بھی زبان کی اصل خصوصیت اس کی قواعد ہوتی ہے۔ ہندی اور اردو کے درمیان آج قواعد کا جو فرق ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہندی اور اردو کا بنیادی فرق صرف ذخیرۂ الفاظ ہے۔ اگر ان دونوں زبانوں میں استعمال ہونے والے تمام تر الفاظ ہمہ گیر پیمانے پر تسلیم کر لیے جاتے ہیں اور اس طرح دونوں کا سرمایہ مشترکہ ہو جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ مجموعی ذخیرۂ الفاظ توانا ہوگا بلکہ یہ بھی ممکن ہو سکے گا کہ اظہار و معانی کی نئی دھوپ چھانو دکھائی دے

۔ ہندستانی، جس کا رویہ ہمیشہ درمیانہ روی کا رہا ہے ان لفظوں کو قابل قبول بنانے کی کوشش کرتی ہے جو آسانی سے عوام میں مقبول ہو جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گانوں کی بولیوں میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم ہندی یا اردو میں آسانی سے ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو صرف گانوں میں استعمال ہوتی ہیں اور ان کے مخصوص دیہاتی نام ہوتے ہیں۔ ایسے الفاظ کا آسانی سے ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ تعلیم یافتہ افراد گانووں میں استعمال ہونے والے الفاظ اور محاوروں کو عموماً غیر شائستہ تصور کرتے ہیں اور ان کے استعمال کو شایان شان نہیں سمجھتے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان الفاظ کے سنسکرت، عربی اور فارسی مترادفات استعمال کریں۔ لیکن ایسے تراجم عام طور سے اطمینان بخش نہیں ہوتے اور ان کے معانی واضح نہیں ہوپاتے۔ ہمیں اس رجحان سے احتراز کرنا ہے اور ہندستانی، ہندی یا اردو میں قابل ذکر تعداد میں دیہی الفاظ اور محاوروں کو بھی شامل کرنا ہے۔

اگر ہندستانی کو ایک چھوٹے سے تعلیم یافتہ طبقے تک محدود رہنے کی بجایے گانوں کی وسیع تر ناخواندہ آبادی تک پہنچنا ہے، اگر اسے درباروں اور محلات کی چمک دمک والی محدود دنیا سے نکل کر غریبوں اور کسانوں کی جھونپڑیوں تک جانا ہے تو اسے اپنی پرورش و پرداخت کے لیے سنسکرت، فارسی اور عربی پر تکیہ نہیں کرنا ہے بلکہ روز مرہ استعمال میں آنے والی زبان پر بھروسہ کرنا ہے جو عام آدمیوں کے گھروں میں بولی جاتی ہے۔

میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ ہندستانی کو اب ہماری قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندستان ایک بڑا ملک ہے جس میں کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے کی اپنی ایک زبان ہے۔ کئی صوبائی زبانیں ایسی ہیں جن میں سنسکرت عناصر کو بالا دستی حاصل ہے۔ مثال کے طور پر بنگالی زبان کو لے لیجیے جسے بنگال میں رہنے والے ہر فرقے کے لوگ بولتے ہیں۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ یقیناً عربی اور فارسی کے الفاظ سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر اس صوبے میں ایسی ہندستانی کو فروغ دیا جائے جس کا غالب

رجحان فارسی یا عربی کی جانب ہو تو وہاں کے لوگ اس کو نہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہاں وہ ہندستانی زیادہ آسانی سے سیکھی جاسکتی ہے جس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں گے۔ اسی طرح شمال مغربی صوبہ سرحد میں سنسکرت آمیز زبان مقبول نہیں ہوسکے گی۔ اس کے برعکس وہاں وہ ہندستانی زیادہ آسانی سے بولی، سمجھی اور سیکھی جاسکتی ہے جس میں فارسی یا عربی کے عناصر زیادہ ہوں گے۔ اس طرح دونوں طرز کی ہندستانی کے فروغ اور ارتقا کی پوری گنجائش موجود ہے۔

جو لوگ ہندستانی اچھی طرح جاننا چاہتے ہیں انھیں ہندی اور اردو دونوں میں یکساں طور پر دلچسپی لینا ہوگی اور سنسکرت، فارسی اور عربی کے الفاظ بھی استعمال کرنا ہوں گے تاکہ وہ جس حلقے کے عوام کو اپنی تقریر یا تحریر کے ذریعے مخاطب کریں وہ حلقے ان کی باتوں کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

اس سلسلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں سنسکرت، عربی اور فارسی کے ان تمام الفاظ کو شامل کیا جائے جو ہندستانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اردو ہندی کے ایسے دو یا تین ہزار عام الفاظ کا جو کہ مقبول ہیں اور انھیں سب جانتے اور سمجھتے بھی ہیں' اس مقصد سے انتخاب کیا جانا چاہیے کہ وہ اسکول اور کالج کی تعلیم کے لیے مفید ثابت ہوسکیں۔ مثال کے طور پر یہاں دو لفظوں کو سامنے رکھتے ہیں جو آج کل عام استعمال میں ہیں۔ "کاریہ کارنی سمیتی" اور "مجلس عاملہ"۔ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے (یعنی ایگزیکیوٹیو کمیٹی) لیکن پہلا ہندی کا ہے اور دوسرا اردو کا۔ ان دونوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر کسی مرحلے میں ان دونوں لفظوں کے مفہوم میں باریک سا فرق واقع ہوجائے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو ہندستانی اس اعتبار سے ایک مالدار زبان ہوگی کہ زیادہ نازک اور صحیح اظہار کے لیے اس کے پاس دو خوبصورت الفاظ ہوں گے۔ اسی طور پر ہم اس بات کے اہل ہوسکیں گے کہ موجودہ بہت سے/ تنازعات کی شدت کو کم کرکے ہندستانی کو ملک کی ایک زندہ اور طاقتور زبان کے طور پر فروغ دے سکیں۔

ہندستان ایک ایسا باغ ہے جس میں خوبصورت پھولوں والے پودوں کی بہتات ہے۔ اگر یہ تمام پودے ایک دوسرے کی نمو پر ضرب لگائے بغیر پھولتے پھلتے رہیں تو یہ باغ بے حد خوش نما بن سکتا ہے۔ اگر ان میں سے کچھ دوسروں کو نقصان پہنچا کر زندہ رہنا چاہیں گے تو یہ تو ممکن ہے کہ وہ زیادہ پھول دے سکیں لیکن بہت سی شاخوں کو وہ خشک اور بد نما کر دیں گے۔ اسی طرح اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زبانوں کا باغ شاداب اور سدا بہار رہے تو ہمیں اس کے اندر نئے پودے اور نئے پھول لاتے رہنا چاہیے اور ہر ایک کو اس کا موقع دینا چاہیے کہ وہ شانہ بشانہ اپنے حسن کو نکھارے، ہندستانی کا یہی مشن ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اس کے سر پر کامیابی کا تاج رکھیں۔

عبدالحق

زبان کا مسئلہ اس سیاست کی زد سے نہ بچ سکا جس نے آج ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے سے زبان سیاسی بے اعتمادی اور رقابت کا بہت بڑا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

1857ء کی بغاوت سے پہلے ہندی اردو تنازعے کا کوئی وجود نہ تھا۔اس طرح 1837ء میں جب فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنایا گیا تو اس کے خلاف احتجاج کی ایک آواز بھی نہیں سنائی دی۔ کسی نے ہندی کی برتری کا دعویٰ نہیں کیا۔اردو کو جو بڑے پیانے پر مقبولیت حاصل تھی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کوئی دوسری زبان ایسی نہیں تھی جو اس مقصد کو اچھی طرح پورا کر سکتی۔ لیکن 1857ء کے بعد زبان کے مسئلے پر رفتہ رفتہ ایک تنازعہ پیدا ہو گیا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے اور براہ راست برطانوی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ہندوؤں کے ایک حلقے میں قوم پرستی کا ایک نیا شعور بیدار ہوا۔اس نئے شعور نے انھیں قدیم تہذیب کے احیا کے لیے اکسایا۔اسی زمانے میں سوامی دیانند سرسوتی نے سنسکرت کا پرچار کرنے کے لیے ایک زبردست مہم چھیڑی تاکہ ویدوں کے زمانے والے کلچر کو زندہ کیا جائے۔ "گروکل" قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جہاں ویدوں کی تعلیم دی جانے لگی۔ ہندوؤں کے ایک حلقے کی ان کوششوں کی بعض یورپی افراد کی سرگرمیوں اور تحریروں سے قابل ذکر حد تک حوصلہ افزائی ہوئی۔ان میں پروفیسر میکس مولر، مادام بلیویٹسکی، مسز اینی بیسنٹ، اور کرنل الکاٹ جیسی یوروپی شخصیتیں شامل تھیں۔ یہ محسوس کیا گیا کہ قوم پرستی کا تقاضہ ہے کہ ایک مشترکہ زبان کو فروغ دیا جائے لیکن بدقسمتی سے جس مشترکہ زبان کو وہ فروغ دینا چاہتے تھے وہ انتہائی سنسکرت آمیز ہندی تھی جو نہ شہروں میں

سمجھی جاتی تھی اور نہ گانووں میں۔

زبان کے شعبے میں علاحدگی پسند تحریک کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس جانب پہلا قدم تھا جسے فرقہ پرستی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک نے منظم شکل پہلی بار بہار میں اختیار کی۔ اس کے بعد یہ یوپی میں پھیل گئی جہاں الہ آباد اور بنارس میں ہندی کو مقبول بنانے اور اسے ترقی دینے کے لیے تنظیمیں قائم کی گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اردو کو عدالتوں اور سرکاری دفاتر سے بے دخل کرنے کی باقاعدہ مہم بھی شروع کی گئی۔

سر سیّد نے ان ناپسندیدہ علاحدگی پسندانہ رجحانات کی زبردست مخالفت کی اور اردو کی حمایت میں اپنے مضبوط قلم کو متحرک بنایا۔ ایک بار انھوں نے شدید رنج اور مایوسی کے عالم میں لکھا — "گذشتہ تیس برسوں سے میری توجہ کا اصل محور ملک کے عوام کی فلاح رہا ہے۔ خواہ وہ مسلم عوام ہوں یا ہندو۔ میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ یہ دونوں فرقے اپنے مشترکہ مفاد کے لیے مل جل کر کام کریں لیکن جب سے کچھ ہندوؤں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مسلم دور حکومت کی پائیدار علامتوں اردو اور فارسی کو برباد کر دینا چاہیے، تب سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ملک کی ترقی اور عوام کی فلاح کے لیے مل جل کر کام کرنا ممکن نہیں رہا۔ میں یہ بات اعتماد اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اس ذہنی رویّے میں ہندو مسلم اختلافات کے آغاز کی نشاندہی ہو سکتی ہے"۔

کچھ دنوں تک صورت حال یہی رہی اگرچہ اس میں اتنی شدت نہیں تھی لیکن اس طرز فکر کو نئی زندگی سر انتھونی میک ڈونل کے زمانے میں ملی جب وہ یوپی کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ سر انتھونی بہار سے آئے تو انھیں ہندی اردو تنازعے سے بڑی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ ابھی وہ آئے ہی تھے کہ ہندی کے حامیوں نے پھر اپنی آواز بلند کی۔ یہ سب کچھ سر سیّد کی زندگی کے آخری دنوں میں ہوا۔ لیکن اس وقت بھی انھوں نے ایک مضمون لکھا جو شاید ان کا آخری مضمون تھا جس میں انھوں نے الہ آباد میں اردو کی ترقی کے لیے قائم ہونے والی ایک

تنظیم کی ہر طرح مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے جلد ہی ان کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی وجہ سے ہندی کے حامیوں کو میدان خالی مل گیا انھوں نے اپنی پوزیشن مضبوط بنائی اور عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی کو رائج کرانے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

اس کے بعد ایک ایسا مرحلہ آیا جس میں نواب محسن الملک نے سر سیّد کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور انھوں نے اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کی کوشش شروع کی۔ لکھنؤ میں ایک بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا جہاں نواب صاحب نے کافی زور و شور سے بیان دیا لیکن سر انتھونی ان کوششوں پر پانی پھیرنے کے درپے تھے۔ انھوں نے نواب صاحب کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی بلکہ باقاعدہ یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر وہ اردو کے حق میں احتجاج کرنے سے باز نہیں آئے تو انھیں ایم اے او کالج کے سکریٹری کے عہدے سے ہٹادیا جائے گا۔ چونکہ نواب صاحب کو یہ فکر تھی کہ کالج کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے اس لیے انھوں نے اس تحریک سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ اگر نواب صاحب نے سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہوتا اور اردو کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہوتا تو ممکن ہے کہ یہ صورت حال سامنے نہ آتی اور اردو کو یہ تاریک دن نہ دیکھنا پڑتے۔

اس کے بعد ہندی پروپگنڈا کچھ دن تک سست روی کا شکار رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زبان میں قابلِ ذکر ادب کا فقدان تھا۔ اس زمانے کی ہندی چند معمولی کتابوں اور کچھ افسانوں پر مشتمل تھی۔ بیشتر چیزیں اردو ہی سے دیوناگری میں منتقل کی گئی تھیں۔ لیکن جب پنڈت مالویہ نے "شدھی" اور "سنگھٹن" تحریک شروع کی تو ہندی کے احیا کے پروگرام پر کافی جامع انداز سے کام ہونے لگا اور چونکہ مذہبی جوش و جذبہ کی کار فرمائی تھی اس لیے ہندی نے زبردست ترقی کی۔ اب یہ مسئلہ ادب کا مسئلہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس پر مذہبی اور سیاسی رنگ چڑھ گیا تھا۔ یہ اعتراف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مالویہ جی اور ان کے حامیوں کی کوششیں ثمر آور ثابت ہوئیں اور اپنی تقریر و تحریر میں انھوں نے لگاتار جو ہندی کا استعمال کیا اس سے ہندی زبان و ادب میں قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی لیکن ہندی تحریک کو سب سے

زیادہ استحکام اس وقت حاصل ہوا جب گاندھی جی نے ہندی ساہتیہ سمیلن کی صدارت قبول کی اور خود ہی ہندی کو ہندستان کی قومی زبان بنانے کی تجویز پیش کر دی۔ اس کے باعث پورے ملک میں ہندی پروپگنڈا کے حق میں فضا سازگار ہو گئی، حتیٰ کہ صوبۂ سرحد، مدراس اور پنجاب جیسے صوبوں میں بھی' جہاں کی زبانوں کی ہندی سے کوئی مماثلت نہیں ہے، ہندی نے قدم جمانا شروع کر دیے۔ ان صوبوں کے ہندوؤں نے اپنی حکومتوں سے ہندی پڑھانے کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک ایسا مطالبہ تھا جو اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہندی نہ تو کبھی ان کی زبان تھی اور نہ ہے' سراسر ناجائز تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس جوش نے کانگریس کی قرارداد کو بھی بالائے طاق رکھ دیا، اس نئی مہم پر لاکھوں روپے خرچ کیے گئے۔ یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک قوم کی تعمیر کریں جس کی ایک مشترکہ زبان ہو لیکن دوسری طرف اردو' کو جو حقیقتاً ایک مشترکہ زبان ہے اور جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی مشترکہ کوششوں سے پروان چڑھایا تھا اسے دانستہ طور پر خارج کیا جا رہا ہے۔

ہندستان میں جو متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں ان سب میں اردو ایک بے مثال اہمیت کی حامل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ علاقہ، ذات یا نسل کی تنگ حد بندیوں میں محصور نہیں ہے۔ عملاً یہ ملک کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے اور کئی صوبوں میں تقریر و تحریر کا عام ذریعہ ہے۔ لہٰذا دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اس معیار پر پوری اترتی ہے کہ اسے مشترکہ زبان تسلیم کیا جائے۔ دراصل اردو اس کلچر کی ایک ٹھوس مظہر ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ طرز زندگی کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق اسی ملک سے ہے اور یہ ہندو مسلم تہذیبوں کے شاندار امتزاج کی آئینہ داری کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ دونوں فرقوں کا اس پر یکساں حق ہے۔

یہ سوچنا بہت بڑی غلطی ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اس ملک میں اس زبان کی سرپرستی کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے مشکل ہی سے اس پر کوئی توجہ دی۔ یہاں تک

کہ اس زمانے کے علما، فضلا اور ممتاز شخصیتوں نے "دوغلی" زبان تصور کر کے اسے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اردو کے ارتقا کی کڑیاں کسی مطلق العنان حکمراں کی ذہنی اختراعات میں نہیں تلاش کی جاسکتیں اور نہ کسی آسمانی دیوتا کی باریک چالوں میں۔ اسے کسی مفتی یا مہاتما کی روحانیت کا صدقہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ کانگریس کی قراردادوں اور کانفرنسوں کے ذریعے بھی نہیں وضع کی گئی۔ اس کے برعکس اس کی جڑیں اس مٹی میں بہت گہرائی تک پیوست ہیں اور اسے عوام کی روزمرہ زندگی کی ضروریات سے وابستہ اصولوں نے پروان چڑھایا ہے۔ اس زبان کی ہندستان کو جو دین ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس نے منقسم اور بکھرے ہوئے لوگوں کو متحد کیا ہے اور ملک کی مجموعی زندگی کو اشتراک اور یکجہتی کا لہجہ عطا کیا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو کے الفاظ میں یہ عوام کا مشترکہ ورثہ ہے جو ناقابلِ تقسیم ہے۔

اردو کی نشو ونما میں ہندوؤں نے قابلِ ذکر رول ادا کیا ہے۔ درحقیقت یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی خدمات مسلمانوں سے زیادہ ہی رہی ہیں۔ یہ جو عربی اور فارسی کے فاضل الفاظ اور ترکیبیں آگئی ہیں اس کی ذمہ داری بھی ہندوؤں ہی پر ڈالی جاسکتی ہے کیونکہ نوبت یہاں تک نہ پہنچتی اگر کچھ ہندوؤں نے منظم طریقے سے اس زبان کا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا۔ اگر ان کی وابستگی اس زبان سے باقی رہتی تو متنا ط رویہ بھی برقرار رہتا اور وہی توازن باقی رہتا جو پہلے تھا۔

ہندی اردو تنازعہ دن بدن شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ ہماری اس شکایت کا کہ زبان میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ سے زیادہ داخل کیے جارہے ہیں' توڑ موڑ کر اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ ہم بھی فارسی اور عربی کے زیادہ الفاظ استعمال کرنے کے اتنے ہی قصور وار ہیں۔ لیکن جہاں ہماری یہ نیت نہیں ہے کہ ہم عربی اور فارسی کے الفاظ سے زبان کو بوجھل بنائیں وہاں گاندھی جی، بابو راجندر پرساد، کاکا کالیلکر اور ان کے حامیوں کی یہ تسلیم شدہ پالیسی ہے کہ اس بنیاد پر سنسکرت کے الفاظ زیادہ سے زیادہ استعمال کیے جائیں کہ جنوبی ہند کے لوگ اسے آسانی سے سمجھ لیں گے کیونکہ ان کی مادری زبانیں سنسکرت سے بہت

قریب ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اول تو یہ کہنا غلط ہے کہ جنوبی ہند والوں کی عام بات چیت میں سنسکرت حاوی رہتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جنوبی ہند والوں نے ہندی پروپگنڈا پر کھلم کھلا اعتراض کیا ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ ان کے خصوصی کلچر پر ضرب لگانے کی ایک شاطرانہ چال ہے۔ جنوبی ہند والوں کی یہ مخالفت نامعقولیت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ ان کے اعتراض کی بنیاد بھی کم و بیش وہی ہے جو خود ہماری ہے۔

ہمارا اعتراض صرف یہی نہیں ہے کہ زبان میں سنسکرت کے غیر مانوس اور بے میل الفاظ داخل کیے جارہے ہیں بلکہ ہمیں اس بات سے بھی شدید اختلاف ہے کہ بہت سے ایسے الفاظ کو جو صدیوں سے رائج ہیں خارج کر کے ان کی جگہ ایسے نئے سنسکرت کے الفاظ لائے جا رہے ہیں جنھیں ابھی تک سنا بھی نہیں گیا تھا۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ ہندی کے ان عام الفاظ کو بھی ترک کیا جارہا ہے جن پر عوامی پسندیدگی کی مہر لگی ہوئی ہے اور ان کی جگہ سخت انوکھے اور نو وضع کردہ الفاظ داخل کیے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ایک بار کوئی لفظ عام استعمال میں آجاتا ہے تو اس کی "اجنبیت" ختم ہو جاتی ہے اور اسے زبان سے اس بنیاد پر خارج کرنا کہ یہ غیر ملکی ہے اتنا ہی ناجائز اور غیر منصفانہ عمل ہے جتنا ہٹلر کی جانب سے جرمنی کے یہودیوں کو نکال باہر کرنے کا فیصلہ تھا۔

کہا جارہا ہے کہ وقت تیزی سے بدل رہا ہے اور ہر جگہ نئے خیالات کی یلغار ہے لہٰذا نئے الفاظ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ کسی بھی زندہ زبان میں ہمیشہ نئے الفاظ کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تھوک کے حساب سے ڈکشنریوں سے نامانوس، کرخت اور انتہائی سخت الفاظ کا انتخاب کیا جائے۔ ہر زبان کا ایک مزاج اور کردار ہوتا ہے لہٰذا وہی لفظ عام طور سے قابلِ قبول ہوتا ہے جو انضمام کے عمل سے گذر کر زبان کا حصہ بن جاتا ہے۔

آج کل اکثر یہ بات سننے میں آتی ہے کہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان کا نام ہے صرف دونوں کے رسم خط مختلف ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ رائے بہت سے اسکالرز اور

صائب الرائے افراد لی ہے۔ موجودہ صورت حال کے پس منظر میں اس رائے سے میں متفق نہیں ہوں کہ یہ رائے میرے خیال میں یا تو سیاسی مقاصد کے تحت قائم کی گئی ہے یا پھر لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر ہندی جاننے والا آدمی مشکل ہی سے اردو کا اخبار یا رسالہ پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح اردو جاننے والے کے سامنے جب ہندی کا اخبار یا رسالہ آئے گا تو وہ اسی طرح کی معذوری کا شکار ہوگا۔ ایک وقت تھا جب ان دونوں زبانوں کو متحد کیا جاسکتا تھا لیکن اب دونوں الگ الگ سمتوں کو چل پڑی ہیں اور انھیں ایک جگہ واپس لانا اب ممکن نظر نہیں آتا۔ اس خلیج کو پاٹنے کے لیے ایک تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہندی کے ادیب سخت سنسکرت آمیز الفاظ کے استعمال سے گریز کریں اور اردو کے ادیب سخت عربی اور فارسی کے الفاظ سے بچنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس تجویز کو روبہ عمل لانے میں جو دشواریاں حائل ہوں گی وہ بالکل واضح ہیں۔ جب اس تجویز پر خود وہ لوگ عمل نہیں کر رہے ہیں جو اس کی وکالت کرتے ہیں تو پھر دوسروں سے یہ امید کرنا فضول ہے کہ وہ سنجیدگی سے اس پر غور کریں گے۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا الزام نہ تو اردو مصنفین کے سر ڈالا جاسکتا ہے اور نہ ہندی ادیبوں کے سر۔ مغربی تعلیم اور بدلتے ہوئے جدید حالات نئے خیالات کو جنم دے رہے ہیں اور ان خیالات کو اظہار کا وسیلہ چاہیے۔ اس ضرورت کے تحت ہندی ادیبوں کا جھکاؤ قدرتی طور پر سنسکرت کے ذخیرے کی طرف ہوتا ہے جبکہ اردو ادیب عربی اور فارسی لفظیات کا سہارا لیتے ہیں۔ انھیں موردِ الزام اس صورت میں ٹھہرایا جاسکتا تھا جب وہ اپنے لیے کوئی ذریعۂ اظہار پالینے میں ناکام رہتے۔ نام نہاد "ہندستانی" جس کا ذکر سیاسی تحریروں اور مباحثوں میں آج کل عام ہے صرف بات چیت یا معمولی کاروباری ضروریات کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔ آرٹ، ادب اور سائنس کے شعبے میں یہ اس بات کی قطعی اہل نہیں ہے کہ ہندی اور اردو کے ادیب اسے استعمال کر سکیں۔ ہماری روز مرہ گفتگو کی زبان علم اور ادب کی زبان نہیں بن سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی تک اس مسئلے پر اس زاویے سے غور ہی نہیں کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی منظم یا مشترکہ کوشش ایسی کی ہی نہیں گئی کہ ہندستانی

کو اس طور پر فروغ دیا جائے کہ وہ ادبی اور سائنسی خیالات کے اظہار کا وسیلہ بن سکے۔ میری رائے میں اس مسئلے سے نمٹنے کا ایک طریقہ ہے جسے میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک مشترکہ فرہنگ ترتیب دی جائے جس میں فارسی، عربی اور اردو کے وہ تمام الفاظ شامل کیے جائیں جو ہندی کی بولی اور ادب میں داخل ہو چکے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی کے وہ الفاظ بھی شامل کیے جائیں جنھیں اردو نے باقاعدہ اخذ کر لیا ہے۔ اس ڈکشنری کو ہندی اور اردو ادیبوں کے ایک نمائندہ ادارے کے سامنے رکھا جائے۔ اور جب وہ اسے منظوری دے دیں تو اسے ایک مشترکہ زبان کے مزید فروغ کے لیے ایک بنیاد سمجھ کر شائع کیا جائے۔ اسی ادارے یا اس کی نامزد کردہ کسی کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندی اور اردو کے ایسے الفاظ اور محاوروں کا اضافہ کرے جنھیں زبان کی ترقی اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے لازمی تصور کیا جائے۔ ان کوششوں کے جو نتائج سامنے آئیں ان کی مناسب انداز سے تشہیر کی جانی چاہیے۔

اس بات پر اعتراض بہر حال ہو سکتا ہے کہ ان خطوط پر کبھی کسی زبان کو فروغ نہیں دیا گیا لیکن یہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر اس طرح کی کوئی کوشش ہی نہ کی جائے۔ خاص طور سے اس صورت حال میں جب ہمارے ملک میں زبان کے مسئلے نے ایک عجیب رخ اختیار کر لیا ہے۔

یہ زمانہ نئی اختراعات اور تلاش و جستجو کا زمانہ ہے لہٰذا کسی طرح کا جرأت مندانہ تجربہ کرنے میں ہم یقیناً حق بجانب ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس طور پر ہم ایسے ادیبوں کا ایک حلقہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں جو اپنی ادبی کاوشوں سے ایک مشترکہ زبان کو مقبول بنانے کا عزم رکھتے ہوں۔ اگرچہ شاعروں اور ادیبوں کو کوئی خاص چیز لکھنے پر کبھی مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ اسکیم اگر کامیاب ہو گئی تو کسی حد تک ہماری ادبی شخصیتوں کو کوئی راستہ دکھا سکتی ہے، کم از کم دونوں زبانوں کی بڑھتی ہوئی دوریوں کو کم کرنے میں تو وہ معاون ثابت ہو ہی سکتی ہے۔ اسے مقبول بنانے کے لیے مشترکہ زبان میں اگر کچھ اخبارات اور جرائد شائع کیے

جائیں تو اس کے دوررس نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

اگر اس نوعیت کا کوئی کام ممکن نہ ہو تو پھر ہندی اور اردو کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنا راستہ خود تلاش کریں۔ اس سلسلے میں ان کے درمیان مخالفت یا رقابت کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں کہ دوسری کوئی دو زبانیں آپس میں اتنی قریب نہیں ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اردو کا کوئی بھی ادیب ہندی کے علم کے بغیر مہارت اور اہمیت حاصل نہیں کر سکتا اسی طرح ہندی کے اچھے ادیب کے لیے اردو کا علم بھی ضروری ہے۔ ہندی اور اردو کا رشتہ آپس میں اتنا گہرا ہے کہ ان کی آپسی رقابت دونوں کے لیے ضرر رساں ثابت ہو گی۔

مندرجۂ بالا سطور میں جو تجویز پیش کی گئی ہے اسے عملی جامہ پہنانے میں ایک بار ہم کامیاب ہو گئے تو رسم خط کا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ رسم خط کا مسئلہ صرف ہندی اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ملک کی دوسری زبانوں کا مسئلہ بھی ہے۔ ایک مشترکہ رسم خط کو روشناس کر کے ' بھلے ہی وہ رومن رسم خط کیوں نہ ہو، ابتدائی نوعیت کی رکاوٹ کو ' جو بدقسمتی سے ملک کی دوسری زبانیں سیکھنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی رہی ہے، فوراً دور کیا جا سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کا مطالعہ خود ہماری زبان کو فائدہ پہنچاتا ہے اور اتنی کشادگی عطا کرتا ہے کہ دوسروں کے تئیں ہماری ہمدردیاں اور مفاہمت بڑھتی ہے۔ وہ وقت یقیناً آئے گا جب زبان کا مسئلہ حل کرنا اتنا دشوار نظر نہیں آئے گا جتنا اب نظر آتا ہے۔

☆☆☆

پرشوتم داس ٹنڈن

میرا یہ یقین ہے کہ انگریزی زبان کی تہذیبی غلامی اور انگریزیت کے بطن سے سیاسی آزادی نہیں بر آمد ہو سکتی۔ لہٰذا میں نے کانگریس کے اندر اور اس سے باہر ہمیشہ اس بات کی حمایت کی ہے کہ ہمیں اپنے قومی اور بین صوبائی کام کاج میں انگریزی کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ہندستان کی حقیقی خودداری کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنے خیالات کا اظہار اپنی ہی زبانوں میں کریں، خاص طور سے اس زبان میں جسے پچیس کروڑ افراد سمجھتے ہیں اور جسے مختلف حلقوں کے لوگ ہندی، ہندستانی یا اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر "ہندی" نام کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس کے رابطے بڑے پرانے اور خوشگوار ہیں اور یہ ہندو اور مسلم تہذیبوں کے امتزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ "ہندی" ہند سے ماخوذ ہے جو ہمارے ملک کا نام ہے۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ یہ اصطلاح آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے۔ یہ اصطلاح اس زبان کے متعدد اسالیب اور بولیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اردو محض اس کا ایک مخصوص روپ ہے۔ لفظ ہندی امیر خسرو سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ کچھ مصنفین کا خیال ہے کہ لفظ "ہندی" اس زبان کے لیے پہلی بار امیر خسرو نے ہی استعمال کیا تھا۔ خسرو کے بعد کے بھی تمام مسلمان شاعروں اور ادیبوں نے نہ صرف اس زبان کے پرانے دیسی روپ کو بلکہ اس کے فارسی آمیز اسلوب کو بھی ہندی ہی کا نام دیا۔ ایلور (دکن) کے باقر آغا نے جو 1157ھ میں پیدا ہوئے تھے، اپنے شعری مجموعے کو "دیوانِ ہندی" کا نام دیا۔ یہ مجموعہ اس زبان میں لکھا گیا تھا جسے عام طور سے آج کے دور میں اردو ہی کہا جائے گا۔ مشہور شاعر میر تقی میرؔ دہلوی جس زبان میں شاعری کرتے تھے اسے "ہندی" کہتے تھے "سندھ" سے اخذ کردہ لفظ ہند کی طرح ہندی بھی کسی ایک فرقے یا مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس لفظ سے جو چیز وابستہ ہے یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کا شاندار ادبی کارنامہ وہ میرے نزدیک

مشترکہ قومی اثاثہ ہے۔ خسرو، کبیر، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں، انیس اور رس کھان جیسے مسلمان جنھوں نے زبان کے پرانے دیسی روپ میں لکھا وہ یقیناً اسی احترام کے مستحق ہیں جس کے مستحق غالب، ذوق اور آتش ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کا کبیر، جائسی اور رحیم سے دور رہنے کا جو رجحان ہے اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو انھیں کانگریس سے دور رکھتی ہے۔ ایک حقیقی محب وطن ان عظیم مسلمان شاعروں کو بھی فخر اور محبت و عقیدت کی اسی نظر سے دیکھے گا جس نظر سے وہ تلسی داس اور سور داس کو دیکھتا ہے۔ اسی طرز کے تہذیبی ارتقا پر میری نظر جاتی ہے اور مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ سماجی اور سیاسی سطح پر مشترکہ کوششوں کے طفیل ہی یہ صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔

جہاں تک زبان کے خط و خال کا یا اس بات کا سوال ہے کہ یہ کس طور پر لکھی جائے گی تو اس طرح کے سوالات پر نظریہ ساز حضرات تو آپس میں لڑ جھگڑ سکتے ہیں، لیکن جو لوگ اس جانب سرگرمی سے اپنے کام میں مصروف ہیں اور چاہتے ہیں کہ پورے ملک کے عوام تک رسائی حاصل کریں وہ ضرورت کے مطابق قدرتی طور پر اس مسئلے کو حل کر لیں گے۔ میں اس سلسلے میں یہی کہوں گا ــــــ "اس زبان اور اس رسم خط کو استعمال کیجئے جسے وہ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں جن سے آپ مخاطب ہیں۔" اس وقت بلاشبہ ہندستان کے عوام کی جتنی بڑی تعداد ناگری رسم خط سے واقف ہے اتنی کسی اور رسم خط سے نہیں۔ بنگال کے مسلمان عام طور سے بنگالی رسم خط، جنوبی ہند کے تمل، تیلگو، ملیالم یا کنٹر رسم خط میں اور گجرات کے گجراتی رسم خط میں لکھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر رسم خط کی عام بنیاد ناگری ہی ہے۔ اگر قومی پیمانے پر اس کا استعمال کیا جائے تو مذکورہ بالا صوبوں کے مسلمانوں کو یقیناً کوئی پریشانی نہ ہوگی کیونکہ اسی کی ایک شکل کا وہ استعمال کر رہے ہیں۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے لیے فارسی رسم خط خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور میرا کہنا یہ ہے کہ ناگری رسم خط کے ساتھ ہی ساتھ اسے بھی باقی رکھا جانا چاہیے۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حروف تہجی اور رسم خط کے سوال کو قومی نقطۂ نظر سے دیکھا

جانا چاہیے۔ اس کا کسی مذہبی اصول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے ذاتی طور پر چند برسوں تک اپنی زبان کو لکھنے کے لیے فارسی حروف کو آسان بنانے کی وکالت کی ہے۔ ناگری حروف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں آوازوں کی ادائیگی بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ ناگری رسم خط میں فارسی رسم خط کے مقابلے میں کہیں کم وقت میں صحیح لکھنا کوئی بھی سیکھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہندی ساہتیہ سمیلن اسے مزید آسان بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے اور ناگری کے کچھ حروف کی شکل بدل کر انھیں اور آسان بنانا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے اسکالرز ایسی کوئی کوشش نہیں کر سکتے؟ میرے خیال سے ایک ہی آواز کے لیے جو کئی حروف استعمال کیے جاتے ہیں وہ غیر ضروری ہیں اور انھیں خارج کر دینا چاہیے۔ اگر اردو کے ادیب اس پر گہرائی سے غور کریں اور اس سمت کوئی پیش رفت کریں تو ہندی اور اردو رسم خط کے درمیان جو موجودہ تنازعہ ہے اس کی شدت خود بخود کم ہو جائے گی۔

ان سوالات پر دوٹوک باتیں کرنے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ میں انھیں معقولیت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں اس صورت میں اپنے خیالات میں تبدیلی نہ لاؤں، جب مجھے اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ یہ تبدیلی انسانی ترقی کے لیے ضروری ہے اور آج کے سیاق میں ہمارے لیے قومی ترقی ہی انسانی ترقی کے مترادف ہے؛ یہاں تک کہ اچھے رسم ورواج اور اچھے خیالات بھی جن کا رول کسی زمانے میں اہم رہا ہوگا اگر حالات کی تبدیلی کے ساتھ ناموافق یا فرسودہ ہو جائیں تو انھیں دوسرے خیالات اور طور طریقوں کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے ورنہ ان کی موجودگی "دنیا کو نقصان" پہنچائے گی اسی کے ساتھ میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ کوئی بھی شخص یا قوم اپنے ماضی سے پورے طور پر اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکتی۔ ماضی ہاتھ پکڑ کر ہمیں مستقبل کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ دونوں اصول جو بظاہر ایک دوسرے سے متصادم ہیں، مل کر ہمارے مستقبل کی راہیں بھی متعین کر سکتے ہیں۔ مجھے اس مستقبل میں ایک خوبصورت ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ ایک ایسی آمیزش جو صرف ہندی اور اردو ہی کی نہیں بلکہ ہندو اور مسلم تہذیبوں

کی بھی ہوئی۔ آج ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تہذیبی رابطوں کے جو نکات ہیں وہ اختلاف کے نکات سے کہیں زیادہ ہیں۔ لہٰذا اگر ترقی پسندانہ اور قومی نقطۂ نظر کو اپنایا جائے تو اس سے ایک خوبصورت آمیزش کا ماحول نمودار ہو سکتا ہے اور یہ صورتِ حال دوسرے ممالک کے لیے قابلِ رشک اور دنیا کے مستقبل کی تعمیر کا ایک ٹھوس وسیلہ ثابت ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

ذاکر حسین

ہندستانی کے بارے میں ہم جس بحث میں مصروف ہیں وہ مجھے بے ساختہ مولیئر کے ایک کردار ایم جورڈین کی یاد دلاتی ہے۔ یہ حضرت جنون کی حد تک وہ سب کچھ جاننے کے لیے بے چین رہا کرتے تھے جس سے ایک شائستہ آدمی کو واقف ہونا چاہیے۔ انھیں اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب ان کے استاد نے بتایا کہ وہ جو کچھ بولتے ہیں وہ نثر ہے۔ ان کے لیے یہ ناقابل قیاس تھا کہ وہ چالیس سال تک نثر بولتے رہے اور انھیں خود اس کا علم تک نہیں تھا۔ اپنے آپ کو اطمینان دلانے کے لیے انھیں بار بار یہ پوچھنا پڑا۔ "یہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ سب نثر ہے؟ میرا جوتا یہاں رکھ دو۔ میرا نائٹ شرٹ دو۔ کیا یہ نثر ہے؟" اب اس کے بارے میں کیا کیا جا سکتا تھا؟ یہ سب کچھ تھا تو نثر ہی میں۔

کچھ یہی حال ہمارے ہم وطنوں کا بھی ہے جن کے لیے ہندستانی وہی کچھ ہے جو ایم جورڈین کے لیے نثر تھی۔ وہ اردو ہندی اور ہندستانی پر پڑا ہوا اسرار کا پردہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کام کو وہ اس طور پر انجام دے رہے ہیں کہ بنیادی نوعیت کے حقائق بھی انھیں پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہ گہرے غور و فکر میں ڈوب جاتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں اردو، ہندی یا ہندستانی کے تعلق سے کوئی سیدھا جواب دوں تو بہت سے لوگ ایم جورڈین کی طرح حیرت زدہ رہ جائیں گے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ جواب بالکل آسان اور سیدھا ہے۔ ہندستانی وہ زبان ہے جسے ہمارے ملک کے لاکھوں لاکھ ہندو اور مسلمان بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ شمالی ہند میں عام استعمال کی زبان ہے۔ ملک کے باقی حصوں میں ایسے بہت سے لوگ آپ کو ملیں گے جو اسے جانتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے بولتے تو نہیں لیکن سمجھ لیتے ہیں۔ شہری علاقوں میں اس کا استعمال زیادہ ہی ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی بڑے شہر میں چلے جایئے، بہت سے لوگ اسے بولتے ہوئے ملیں

گے اور بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو اسے سمجھتے ہیں۔

لیکن ایم جورڈین جیسے لوگ اس بات پر اعتراض کریں گے کہ میں جس زبان کا حوالہ دے رہا ہوں وہ ہندستانی نہیں بلکہ اردو ہے۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہندستانی اردو بھی ہے۔ ہندستانی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ نہ تو اردو بولنے والوں کو اس میں کوئی دشواری پیش آتی ہے اور نہ ہندی بولنے والوں کو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک زبان داں کے طور پر مولوی عبدالحق صاحب کا کیا مقام ہے۔ انھوں نے انشاء اللہ خاں کی تصنیف "رانی کیتکی" کا تعارف کراتے ہوئے ہندستانی کی بڑے خوبصورت انداز میں تعریف کی ہے۔ "اسے اردو بولنے والے بھی سمجھ لیتے ہیں اور ہندی بولنے والے بھی۔ یہ مروّجہ اور صاف زبان ہے اسے ہندستانی کہتے ہیں"۔

لیکن یہاں یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ انشاء اللہ خاں نے "رانی کیتکی" میں عربی اور فارسی اصل کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا جبکہ وہ لوگ جو ہندستانی بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں، ایسے بیسیوں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہم ان الفاظ کو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ وہ ہندستانی ہیں۔ ہندستانی میں عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ترکی، پرتگالی اور انگریزی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے اور کتنی زبانوں سے الفاظ لیے ہیں۔ کچھ ایسے پنڈت ہیں جو لفظوں کی اصل یا خاندانی رابطوں کے بارے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ میں ان سے ان کا یہ حق نہیں چھیننا چاہتا جس کے تحت وہ کسی لفظ کا رشتہ کسی خاص ملک یا خاص سماج میں تلاش کرتے ہیں۔ مجھے اور مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں افراد کو تو صرف اس بات سے سروکار ہے کہ وہ الفاظ جو خود بخود اور قدرتی طور پر ہماری زبان پر آجاتے ہیں اور جنھیں ہم ہر وقت استعمال کرتے ہیں وہ ہماری زبان کے الفاظ ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو ملے جلے پکوان کا مزہ نہیں لیتے۔ وہ کہتے ہیں۔ "یہ نہ ادھر کا ہے نہ ادھر کا، یہ نہ تو مچھلی ہے اور نہ مرغ۔ ہماری زبان تو ہماری ہی ہونی چاہیے، خالص جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو۔" میرا خیال ہے کہ اسی "طہارت پسندی" کے

جنون نے آج ہندی اور اردو کو ایک دوسرے کے خلاف لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا' جو بہت دور کا زمانہ بھی نہیں، جب لوگ ان دونوں کے فرق سے واقف بھی نہیں تھے۔ ممتاز اردو شعرا تک اپنی زبان کو ہندی کہتے تھے۔ یہ مسئلہ تو اُس وقت پیدا ہوا جب کچھ لوگوں نے عربی اور فارسی کے الفاظ کو ترک کرنا شروع کیا اور ان کی جگہ ان کے سنسکرت مترادفات تلاش کرنے لگے۔ اسی کے نتیجے میں مشترکہ زبان نے دو شکلیں اختیار کر لیں۔ ایک حلقے نے خالص ہندی لکھنا شروع کیا اور دوسرے نے عربی اور فارسی کے الفاظ سے زبان کو بوجھل بنانا شروع کیا۔ لیکن جو لوگ اردو بولتے ہیں، وہ ایک خاص حد سے آگے جا کر نامانوس الفاظ نہیں استعمال کر سکتے۔ اس جھگڑے میں پڑ کر جو ابھی شروع ہوا ہے' وہ صدیوں کے کارناموں کو تباہ نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان کا ڈھانچہ ہندستانی ہے، اس کی قواعد ہندستانی ہے اور کبھی اس نے اس بنیاد پر لفظوں سے نفرت کرنا نہیں سکھایا کہ فلاں لفظ بدیسی ہے یا کافروں کا ہے۔ پھر بھی جوابی کارروائی کے طور پر یا پھر کسی اور مقصد سے کچھ لوگ اپنی زبان کو عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے سجانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم روزمرہ بولی جانے والی زبان لکھنے کی کوشش کریں تو ہماری ادبی تخلیقات عام فہم، آسان، رواں دواں اور موثر، شائستہ اور دل کو لبھا لینے والی ہوگی۔ عام استعمال کے الفاظ سے دامن نہیں بچانا چاہیے بلاشبہ ناموزوں یا بے تکے الفاظ تھوپنا غلط ہوگا۔ اسی صورت میں ہم ہندستانی کو فروغ دے سکیں گے۔ لیکن زبان کو خالص بنانے کی یہ کوشش ہی کیوں کی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں ہندی اور اردو کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا؟ ان کوششوں کے پیچھے جو مقاصد کارفرما ہیں، ان پر ہمیں باقاعدہ غور کرنا چاہیے اور اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی نشاندہی بھی کرنی چاہیے۔ شاید یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگ اپنے تعلق سے اس طور پر سوچنے لگتے ہیں کہ صرف وہی چیزیں ان کی اپنی ہیں، جو خاص طور سے انھی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس صورت میں وہ ہر دوسری چیز کو غیر ملکی سمجھ کر نکال باہر کرتے ہیں۔ انھیں کچھ غیر ملکی عناصر سے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہے لہٰذا وہ ان تمام عناصر

کو، جن میں ذرا بھی غیر ملک کا شائبہ نظر آتا ہے، قابلِ نفرت تصور کرتے ہیں۔ اپنی اس بے صبری کے عالم میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ غیر ملکی چیزیں دیسی بن جاتی ہیں اور کچھ غیر ملکی ہی کے طور پر باقی رہتی ہیں۔ کچھ نے ہماری زندگی کو تنگ دیواروں کے اندر محصور کر دیا لیکن کچھ نے ہمارے اندر آزادی کا دوہرا ولولہ پیدا کیا۔ باہر سے آنے والی ہوائیں ہمیشہ بربادی کا باعث نہیں بنتیں بلکہ کچھ ایسی ہوائیں بھی آتی ہیں جو زرخیزی اور پھول بکھیرتی ہیں۔ ان دونوں کا فرق محسوس نہ کرنا ایسی لاعلمی ہے جو خودکشی کے مترادف ہے۔

جو لوگ ہندستانی سے غیر ملکی الفاظ کو چن چن کر باہر نکالنے کے درپے ہیں وہ میرے خیال میں اسی قسم کی غلطی کر رہے ہیں۔ انھوں نے ان ہواؤں کو جو زرخیزی اور پھول ہمارے ملک میں لائی تھیں اور ہمیں ایسی تازگی سے روشناس کرایا تھا جو اب بھی موجود ہے، غلطی سے ایسی تیز و تند آندھی سمجھ لیا جو ابتری لاتی ہے اور سب کچھ برباد کر دیتی ہے۔ تکلف برطرف جو لوگ ہندستانی سے عربی اور فارسی کے الفاظ خارج کرنا چاہتے ہیں وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو چیزیں صدیوں کے ہندو مسلم اشتراک سے وجود میں آئی تھیں وہ خالص نہیں ہیں لہٰذا ملاوٹ والی چیزوں کو ہر قیمت پر ختم کرنا ہے۔ لیکن وہ اس بات سے ناواقف نظر آتے ہیں کہ یہ غیر ملکی عنصر ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکا ہے اسے ختم کرنے کے لیے انھیں اردو سے صرف فارسی اور عربی کے الفاظ ہی نہیں نکالنے ہوں گے، انھیں تلسی داس، سورداس اور کبیر داس کی زبان کو بھی "پوِتر" بنانا ہوگا۔ اور یہ ایک ویسی ہی پاگل پن کی مہم ہوگی کہ گنگا اور جمنا کو مجبور کیا جائے کہ وہ کہیں ایک دوسرے میں نہ ملیں بلکہ سمندر میں جا ملنے تک اپنا الگ الگ راستہ طے کریں۔

اور اگر ہم اصولاً غیر ملکی عناصر کو نکال باہر کرنا اہم یا ضروری سمجھتے ہیں تو پھر صرف زبان ہی پر اکتفا کیوں کریں؟ کیوں نہ مختلف لسانی اور نسلی حلقوں میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص خالص سودیشی کلچر ہو، اس کا اپنا ملک اور آزاد حکومت ہو! اس صورت میں ہماری تاریخ اپنا ایک چکر پورا کرے گی اور ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ ممکن ہے کہ

اس منطق اور "پوتر تا" کے قائل کچھ لوگوں کی یہ خواہش ہو اور وہ اسے حاصل بھی کرنا چاہتے ہوں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ چہرے کو بہتر بنانے کے لیے ناک ہی کاٹ لی جائے۔ کچھ سر پھرے تو گردن بھی کاٹ سکتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی ہندستانی جسے اپنے ہم وطنوں کی عقلیت پسندی پر ذرا بھی اعتماد ہو گا وہ اس بات پر مشکل سے یقین کرے گا کہ یہ تمام چیزیں اس طرح کے جنون کی بھینٹ چڑھ جائیں گی۔

غیر ملکی الفاظ کو خارج کرنے کے ساتھ ساتھ ہم ایک غلطی اور کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اُن الفاظ کی اصل شکل بحال کرنا چاہتے ہیں جنھیں ہم نے دوسری زبانوں سے لیا تھا اور اپنی ضرورت اور مقصد کے مطابق ان کے تلفظ اور معانی وضع کیے تھے۔ یہ بھی وہی بات ہے جیسا کہ ہم ہندستانی میں کہتے ہیں کہ آنکھوں کو ان کے خول سے نکال کر ناک پر چپکانے کی کوشش کرنا۔ اسے ان لوگوں کی سنک بھی کہا جاسکتا ہے جو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قیمتی پتھر اس وقت تک لعل و جواہر نہیں کہلاتے جب تک کہ انھیں تراش کر زیورات میں جڑ نہیں دیا جاتا۔ کچھ یہی بات لفظوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ الفاظ بھی تراش خراش کے عمل سے گزرتے ہیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ زبان انھیں ایک خاص شکل عطا نہیں کر دیتی اور دماغ انھیں خاص معانی نہیں بخش دیتا۔ اس عمل کو جس کی تکمیل میں صدیاں صرف ہو جاتی ہیں، چند نام نہاد عالم فاضل افراد کے محض جھوٹے وقار اور علمیت کی تسکین کی خاطر مخالف سمت کو نہیں موڑا جاسکتا اور نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ وہ الفاظ جو ہماری ہندستانی زبان کا جزو بن چکے ہیں، وہ ہندستانی ہی کے الفاظ ہیں اور ہم ان کے جو معانی اور شکل متعین کرتے ہیں، ان کے علاوہ ان کے نہ کوئی دوسرے معانی ہوتے ہیں اور نہ شکل۔ ان لفظوں کی اصل سے کسی ماہر لسانیات کو تو دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن ہمیں نہیں کیونکہ ہماری اصل دلچسپی اس زبان سے ہے جسے ہم بولتے اور سمجھتے ہیں۔

جو لفظ ہندستانی میں داخل ہو چکے ہیں اور جنھیں ہندستانی کے لفظ کے طور پر عام

مقبولیت حاصل ہو چکی ہے وہ بہر حال ہندستانی ہیں۔ اب ہمیں غور اس بات پر کرنا ہے کہ یہ زبان جس کی منفرد شکل اور کھرے پن کا میں نے یہاں دفاع کیا خود کفیل ہے یا اس کے وجود کا دارومدار کسی بیرونی سہارے پر ہے؟ کیا اس سے ہمارے سارے مقاصد پورے ہو جائیں گے یا صرف روزانہ کی عام ضروریات یا کچھ قصے کہانیوں تک ہی یہ ہمارا ساتھ دے سکے گی؟ ہماری زندگی کا ہر دن دنیا میں ہونے والی نت نئی ترقیوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ان میں نئی ایجادات اور نئی مصنوعات، نئے حالات اور خیالات؛ سبھی شامل ہیں لہٰذا ہماری زبان کو بھی اس بدلتی ہوئی زندگی سے رشتہ استوار کرنا ہوگا۔ کیا ہمیں اس طور پر اپنا ذہن تیار کرنا چاہیے کہ ہمارا ذخیرۂ الفاظ جیسا ہے، ویسا ہی رہے اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نئے حالات میں بھی گھوم پھر کر ہم اسی سے کام چلائیں یا یہ کہ باہر سے کچھ نئے لفظ اس میں داخل کریں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ زبان کی ترقی میں رکاوٹ ڈالے۔ ہمیں نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ اور نئی چیزوں کے لیے نئے ناموں کی ضرورت ہر حال میں پیش آئے گی۔ تو پھر وہ الفاظ آئیں گے کہاں سے؟ میرا خیال ہے کہ جو الفاظ ہم اخذ کرتے ہیں وہ نئے ہیں یا پرانے، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ البتہ اتنا ضرور پیش نظر رہنا چاہیے کہ جو الفاظ لیے جائیں وہ بے تکے اور صوتی اعتبار سے ناقابلِ قبول نہ ہوں۔ ایسے الفاظ ہمیں پہلے گانوؤں کی بولیوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو قدرت سے قریب ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کے دھارے کے ساتھ بہتے ہیں یہ کنارے پر بیٹھے بزعم خود اپنی دنیا میں گم نہیں رہتے۔ میرا یقین ہے کہ اگر اس طرح ہم الفاظ تلاش کریں گے تو اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔ پھر ہمیں ان اصطلاحات پر غور کرنا پڑے گا جو ہمارے دستکاروں اور کامگاروں نے ایجاد کیے ہیں۔ مجھے اس بات پر قطعی حیرت نہیں ہوگی اگر یہ پتہ چلے کہ بہت سے ایسے الفاظ اور اصطلاحیں جن کے لیے ہم عربی یا سنسکرت کی موٹی موٹی ڈکشنریاں دیکھتے ہیں پہلے ہی سے رائج ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ کس حد تک ہمارا ساتھ دیں گے اور کتنے موزوں ہیں۔ جب ہم ان دونوں وسائل سے الفاظ تلاش کر کر کے

تحنے جائیں اور ہماری ضرورت جب ان سے پوری نہ ہو تو پھر ہمیں غیر ملکی اصطلاحوں اور ناموں کو قبول کرلینا چاہیے۔اگر ان کے تلفظ میں کوئی دشواری پیش آتی ہو تو مناسب تبدیلی کر کے ہم انھیں آسان بنا سکتے ہیں۔جب ہم ان اصطلاحات کو اخذ کرلیں تو ہم انھیں اپنی زبان کے لفظ تصور کریں، قواعد کے جو اصول ہم دوسرے الفاظ کے ساتھ روا رکھتے ہیں وہی ان کے ساتھ بھی روا رکھیں۔انھیں ہندستانی الفاظ سے ہم آہنگ کردیں اور اس بات کا خیال نہ کریں کہ کون سا لفظ حال میں اخذ کیا گیا ہے اور کون سی اصطلاح پہلے ہی سے رائج ہے۔ہمیں اپنی سائنسی اصطلاحات بڑے پیمانے پر غیر ملکی زبانوں سے لینا پڑیں گی اور اس ضمن میں یہ بات بڑی سود مند ہوگی کہ اردو اور ہندی بولنے والے ایک ہی اصطلاح قبول کرنے پر متفق ہو جائیں ورنہ ایک کی سائنسی اصطلاحات دوسرے کے لیے مشکل ہی سے قابلِ استعمال ہوں گی۔اس کے باوجود بہت سے الفاظ عربی اور سنسکرت سے بھی لینے ہوں گے اور یہاں بھی اسی معیار کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ منتخب کی گئی اصطلاحیں موزوں ہوں،ان کا تلفظ آسان ہو اور وہ ممکنہ حد تک ہماری زبان کی اسپرٹ سے مطابقت رکھتی ہوں۔زبان کی "طہارت" یا صفائی جیسی چیز کو قطعی قابلِ غور نہیں سمجھنا چاہیے۔ہمارا شروع ہی سے یہ اصول رہا ہے اور یہی اصول ہمیں اب بھی اپنانا چاہیے کہ یہی ہندستانی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

اگر ہندی اور اردو بولنے والے نئی اصطلاحات کے انتخاب کے سلسلے میں نیز انھیں اخذ کرنے کے تعلق سے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کریں،اگر ہماری نصابی کتابیں اسی زبان میں لکھی جائیں،اگر اخبارات بول چال کی زبان سے گریز نہ کریں،اگر ریڈیو اسٹیشن،ہمارے تھیٹر اور سینما ایک ایسی مشترکہ زبان کو عام کرنے کا فیصلہ کریں جو عربی اور سنسکرت کے دقیق الفاظ سے بوجھل نہ ہو تو ہندستانی کو اردو اور ہندی کے خانوں میں تقسیم کرنے کی تحریک خود بخود کمزور پڑ جائے گی۔کم از کم عام بات چیت کے لیے ہمارے پاس ایک زبان تو ہوگی جو کاروبار اور اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر ہمارے کام آئے گی۔یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی خاص مدت تک سماجی علوم کے لیے ذریعۂ تعلیم

دو زبانیں ہوں اور ہمارے شعرا پر اشعار اردو اور ہندی میں نازل ہوں لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ آرٹ، ادب اور شاعری جیسے شعبے بھی مشترکہ زبان یعنی ہندستانی بولنے کے رجحان کی نفی کریں گے۔

ادب لمبے عرصے تک محض ایک اعلیٰ طبقے کی دلچسپی اور مصروفیات کا محور نہیں رہ سکتا۔ زبان کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کا تعلق سماج سے ہوتا ہے۔ زبان انسان کو انسان سے اور دل کو دل سے جوڑتی ہے۔ انفرادی طور پر کسی ایک آدمی کی کوئی زبان نہیں ہوتی لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ہمارے ادیب یہ محسوس کریں گے کہ انھیں قاری کے بہت بڑے حلقے تک اپنی بات پہنچانی ہے اور عوام بھی بڑی تعداد میں یہ محسوس کریں گے کہ انھیں وہ باتیں سمجھنے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ویسے ویسے ادب زندگی کے قریب آتا جائے گا اور ہماری زبان صاف اور آسان ہوتی جائے گی۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے وہ ادیب بھی جو دنیا سے بیگانگی برتتے ہیں اور اپنی تحریروں میں خدا جانے کس کو مخاطب کرتے ہیں، بہر حال انسان ہی ہیں کنویں کے مینڈک نہیں جو اپنے آپ ٹراتے رہتے ہیں اور پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہ ادیب اپنے ساتھیوں سے بہر حال رابطہ رکھنا چاہتے ہیں اور وہ یقیناً ایک دن مجبور ہوں گے کہ اپنی زبان اور طرزِ اظہار کو آسان بنائیں تاکہ ان کی باتیں لوگوں کی سمجھ میں آئیں۔ زبانوں کے طلبہ اس بات سے واقف ہیں کہ کوئی بھی بولی جب بہت زیادہ عام ہوتی ہے، تو وہ لوگ جو صرف اسے سنتے اور پڑھتے ہیں، وہ ان لوگوں کے مقابلے میں اس پر زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں، جو اسے پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں، اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ زبان تو سماج کی ملازمہ یا داسی ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں سے منہ نہیں موڑ سکتی جن کی خدمت کرتی ہے۔ زبان تو بغیر کسی سہارے کے خود اپنے اظہار کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ شاعری میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو بالکل ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے اور جو اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ یہ ایک طرح کا روحانی سکون ہوتا ہے جس کی شاعر کو تلاش ہوتی ہے۔ یہ کبھی ٹھنڈی سانس میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی چیخ میں اور کبھی خوشی میں۔ لیکن اس

صورت میں بھی شاعر کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اسے سنا اور سمجھا جائے۔ اکثر کسی ویران جنگل میں کسی سوکھے پیڑ پر بیٹھی کوئی چڑیا چہچہاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ خود ہی گاتی ہے اور خود ہی سنتی ہے لیکن صحیح معنوں میں ہرے بھرے جنگلات اور باغوں ہی میں خوش الحان پرندوں کی آوازیں نغمے بکھیرتی ہیں۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ ہمارے شعرا وادبا جلد ہی ہندستانی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کریں گے۔ صاف اور آسان زبان میں جو ہر روز کی معمول کی زبان ہے، وہ زبان جس کے پرانے الفاظ اس بنیاد پر نکالے نہیں جائیں گے کہ وہ غیر ملکی ہیں اور جس میں لگاتار نئے الفاظ شامل کیے جائیں گے۔ لیکن اس کے ذخیرۂ الفاظ کو عربی اور سنسکرت کے الفاظ سے صرف اس لیے بوجھل نہیں بنایا جائے گا کہ یہ سنسکرت اور عربی کے الفاظ ہیں۔ یہ زبان تو مشترکہ زندگی کی علامت، ماضی کی کامیابیوں کو نذرانۂ عقیدت اور مستقبل کے حوصلوں اور امنگوں کا پیمانِ وفا ثابت ہوگی۔

کاکا کالیلکر

جتنا زیادہ میں اس سوال پر غور کرتا ہوں اتنا ہی میرا یہ یقین پختہ ہوتا جاتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ قومی زبان کی کیا شکل ہوگی، نہ وہ لوگ کر پائیں گے جن کی مادری زبان اردو ہے اور نہ وہ جن کی ہندی ہے۔

ایک قومی زبان وضع کرنے کا مسئلہ ہماری قومی تاریخ کی دین اور پورے طور پر اس خواہش کا مظہر ہے جس کے تحت ہم قومی استحکام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

قومی زبان کے اس سوال کو ہم الگ سے دیکھنے کی کوشش تو کر رہے ہیں لیکن مذہب، کلچر اور سیاست سے جو اس کا ربط ہے اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ چند ہندو اور مسلمان اس بات کو بار بار دہرا تو رہے ہیں کہ اردو کسی بھی طور پر مسلمانوں کی جاگیر نہیں ہے اور نہ ہی اسے مسلمانوں کی مذہبی زبان کہا جاسکتا ہے لیکن مسلمانوں کا عمومی طور پر یہی خیال ہے کہ یہ اسلامی تہذیب کی علامت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے تحفظ میں اسلام کی سلامتی کا راز پوشیدہ ہے۔

جہاں تک سنسکرت کا سوال ہے تو صاف بات یہ ہے کہ یہ ہندوؤں کی مذہبی زبان ہے اور اسے ہندستان کی تمام زبانوں کی ماں کہا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ

سنسکرت ہندستان کی یکجہتی کی سب سے بڑی علامت ہے ۔بلاشبہ سنسکرت میں ادب کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا بھی ہے، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور جس سے ہر مذہب کے لوگ محظوظ ہو سکتے ہیں۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو ہندومت کے دشمن ہیں یا اسے ناپسند کرتے ہیں۔

ایک مسلمان دوست نے ایک بار مجھے بتایا کہ اردو کے علاوہ شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس کے ادب میں کفر کی اتنی باتیں موجود ہوں۔زبان اپنے آپ میں محض موج کی طرح آزاد ہوتی ہے اور ذات اور مذہب کے مصنوعی باندھ کے روکے نہیں رکتی۔

انگریز اگرچہ عیسائی ہوتے ہیں لیکن یونانی اور لاطینی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ لاطینی اور یونانی ادب کا مطالعہ کرنے سے عیسائیت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہی رویہ مسلمانوں کا سنسکرت زبان کے تئیں ہونا چاہیے۔ کیا یہ ہندستان کے ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے آبا و اجداد کی زبان نہیں ہے؟

انگریزوں نے اپنی زبان کو اس بات کے لیے آزاد چھوڑ دیا کہ وہ یونانی اور لاطینی کا جس حد تک اثر قبول کرنا چاہے کرے، انھوں نے اس سے کچھ حاصل بھی کیا۔ عیسائی فکر اس مطالعے کے لیے بڑی توانا ہے۔

ہندستان کی زبانیں سنسکرت کے پیدا کردہ ماحول میں پروان چڑھیں اور ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ یہ سب سنسکرت کی بیٹیاں ہیں۔ اردو اگرچہ اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے لیکن شاید محدود نوعیت کے رسم خط کی وجہ سے، سنسکرت سے دور سے دور ہوتی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہندستان کی دوسری تمام زبانوں سے بھی کٹ کر رہ گئی۔ مسلمانوں کو اس صورتِ حال سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ انھیں اپنے مذہبی عقائد اور روایات سے تو ہر اعتبار سے مضبوطی سے جڑے رہنا چاہیے لیکن اگر وہ کسی بڑے نقصان سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں تو انھیں ہندستان کی تمام زبانوں کے ادب کے تئیں اپنے اوپر قدغن نہیں لگانی چاہیے۔ اگر اردو ان لفظوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہے گی جو تمام ہندستانی زبانوں میں مشترک ہو چکے ہیں تو اسے بہت بڑا نقصان پہنچے گا اور مسلمان اس ملک

میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو غیر ملکی محسوس کریں گے۔ آج تو یہ بات انھیں شاید کچھ زیادہ پریشان نہ کرے لیکن جب ہم دونوں کے اچھے دن آئیں گے تو انھیں اس بات کا سخت افسوس ہوگا کہ ان کے یہاں دور اندیشی کی کمی تھی۔

جس طرح انگریز آج ہندستانی فلسفے کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اس بات سے انھیں کوئی پریشانی نہیں کہ اس سے نہ صرف ان کی زبان پر اثر پڑ رہا ہے بلکہ ان کے خیالات بھی متاثر ہو رہے ہیں، اسی طرح ہندوؤں کو بھی عربی اور فارسی ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس بات کی چھوٹ دینی چاہیے کہ اس سے ان کی دیسی زبانیں متاثر ہوتی رہیں۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ فارسی، سنسکرت کی سگی بہن ہے۔ یہ شستہ اور شائستہ زبان ہے، اپنے حسن اور وقار کے لیے مشہور ہے اور اس کے ادب کا خوبصورتی اور نزاکت میں کوئی جواب نہیں لہٰذا ہندوؤں کو فارسی کا اچھی طرح مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کے خوبصورت اور جاندار الفاظ کو احتیاط اور اپنائیت کے ساتھ اس طور پر پروان چڑھانا چاہیے کہ وہ ہندستانی زبانوں میں اپنے لیے جگہ بنا سکیں۔ میں تو اس سے آگے بڑھ کر یہ تک کہوں گا کہ جب بھی ضرورت پڑے ہمیں فارسی سے نئے خوبصورت الفاظ بغیر کسی پس وپیش کے لے لینے چاہئیں اور اپنی زبان میں شامل کر لینے چاہئیں اور اس طرح سنسکرت اور فارسی کے الفاظ کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔

جب تک عام آدمی پسماندہ رہیں گے اور جب تک ہم ان کی تعلیم اور تہذیب کے سلسلے میں غفلت برتتے رہیں گے اس وقت تک سنسکرت، عربی اور فارسی کے انتہائی عام الفاظ بھی سمجھنا اور استعمال کرنا ان کے لیے دشوار ہوگا۔ جب تک یہ صورتِ حال باقی رہے گی اس وقت تک ہمیں ہندستانی کو ممکنہ حد تک آسان بنانا ہوگا اور اسے عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ نیز سنسکرت کے ایسے تمام الفاظ سے دور رکھنا ہوگا جو ابھی تک مختلف صوبائی زبانوں میں عام طور پر استعمال نہیں ہوتے۔

بدقسمتی سے ایک سچائی یہ ہے کہ اس وقت انگریزی کے ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن

سے ہندو اور مسلمان، دونوں یکساں طور پر مانوس ہیں اور ان الفاظ کا بدل ہندی اور اردو میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ ہم اس صورتِ حال کو بھلے ہی کوستے رہیں لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ان حالات میں اس طرح کے انگریزی الفاظ کو ہم اپنی ہندستانی میں شامل کرنے پر مجبور ہیں۔ چونکہ مسلمانوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ صرف انھی دیسی الفاظ کو قبول کریں گے جن سے وہ واقف ہیں اور نئے ہندستانی الفاظ کا سختی سے بائیکاٹ کریں گے اور جہاں ضرورت ہوگی وہاں صرف عربی اور فارسی سے اخذ کردہ الفاظ استعمال کریں گے یا پھر انگریزی کے لفظ لیں گے اس لیے انگریزی الفاظ کی تعداد ہماری زبان میں ناگزیر طور پر بڑھتی جائے گی۔ اس نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ ہندی نواز حلقے نے بھی اسی اصول کو اپنا لیا اور عربی اور فارسی کے الفاظ کو اچھوت سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ لوگ عربی اور فارسی کے صرف انھی الفاظ کو عارضی طور پر باقی رکھیں گے جو اُن کی زبان پر چڑھ گئے ہیں اور جو ہٹائے نہیں ہٹتے۔ ان الفاظ کے تعلق سے بھی ان کی کوشش بہر حال یہی رہے گی کہ جتنی جلدی ممکن ہو چھٹکارا حاصل کر لیں۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ابھی تک اس حلقے نے اتنی طاقت نہیں حاصل کی ہے کہ وہ تعصب والے اس رویّے کو کسی طور پر منوا سکیں لہٰذا اب بھی اس بات کی پوری امید ہے کہ دونوں زبانوں کے درمیان مثبت اور دوستانہ ماحول میں کچھ لو اور کچھ دو کا اصول اپنا کر مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔ حقیقی اور پائیدار نوعیت کی یکجہتی قائم کرنے کے لیے، ایک مضبوط قوتِ ارادی کا ہونا ناگزیر ہے لیکن اس کے برعکس جب باہمی شک وشبہ کا رجحان دن بہ دن بے روک ٹوک پروان چڑھنے لگے اور اسی کے مطابق، "اتحاد نہ کرنے" کا ارادہ مضبوط ہونے لگے تو نہ تو ہندی ترقی کر سکے گی اور نہ اردو! اس صورت میں دونوں زبانوں کو ملا کر ہندستانی کو فروغ دینے کی کوشش ہم آہنگی اور اتحاد کو نقصان پہنچانے کی ایک نئی وجہ بن جائے گی۔

صورتِ حال جو بھی ہو، ہندستانی تو ہندی اور اردو کے آپس میں گھلنے سے ہی بن سکتی ہے۔ شروع میں ہم آسان اردو اور آسان ہندی دونوں کو ہندستانی کا نام دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ، شمالی ہند کی بول چال کی زبان کے خطوط پر متوازن انداز کی آمیزش کے

ذریعے ایک نیا اسلوب بھی وضع کرنا ہوگا۔ اس کے لیے سخت گیر قسم کے اردو نواز اور ہندی نواز حلقوں کی جانب سے ہمارے اوپر سخت قسم کے الزامات بھی عائد کیے جائیں گے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہی طرز یا اسلوب مقبول ہو سکتا ہے جو آگے چل کر حقیقی قومی زبان کی شکل اختیار کرے گا۔ اس کے لیے ہم لوگ خوشی سے کام کریں گے اور اس کی جو بھی قیمت چکانی پڑے گی اس کے لیے ہم تیار ہوں گے۔ یہی وہ قومی زبان ہوگی جسے ہم تمام صوبوں میں روشناس کرائیں گے۔

ہم اس بات سے واقف ہیں کہ اپنے اس مقصد کے حصول میں ہمیں بہت ساری دشواریوں کا سامنا کر کے ان پر قابو پانا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس واحد مقصد پر ہمیں اپنی پوری توانائی صرف کرنی پڑے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ یہ ہماری آخری منزل نہیں ہوگی۔ ایک بار عوام میں تعلیم عام ہو جائے اور انھیں اپنی حکومت آپ چلانے کی مراعات اور ذمہ داریاں مل جائیں، ایک بار لوگ مہذب ہو جائیں اور اپنے حقوق اور حقیقی مفادات سے پورے طور پر واقف ہو جائیں تو پھر ہمیں سنسکرت کے سخت ترین الفاظ تک استعمال کرنے میں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی اور نہ اپنی قومی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ شامل کرنے میں ہم کسی طرح پس و پیش کریں گے۔ زبان کا ذخیرۂ الفاظ اس کی اپنی ترقی کے ساتھ قوی تر ہوتا جاتا ہے اور جب ہندستانی کو نازک ترین احساسات و خیالات کے اظہار کی قوت مل جائے گی تو پھر ہم سنسکرت عربی اور فارسی کے ان تمام دلکش، خوبصورت اور موزوں الفاظ کو جو یہ زبانیں ہمیں مہیا کر سکیں گی، آسانی اور اثر انگیزی کے ساتھ استعمال کر سکیں گے۔

قارئین، میری ان باتوں سے نہ چونکیں۔ پنڈتوں اور مولویوں کی زبان تیزی سے عام آدمیوں کے لیے ناقابل قبول ہوتی جا رہی ہے۔ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اب اہل قلم بادشاہوں کی شان میں قصیدے نہیں لکھ سکتے۔ آج "عالم پناہ" کی جگہ "عوام" نے لے لی ہے لہٰذا اگر وہ کسی کو خوش کر کے اس سے داد لینا چاہیں تو انھیں عوام ہی کو خوش کرنا پڑے گا۔ جیسے جیسے لوگ باشعور ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ادیب شاعر اور مقرر، اپنے آپ کو

عوام کا خادم بناتے جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں ایک زبان وجود میں آئے گی جو بیک وقت آسان، مالدار، شائستہ اور پُر وقار ہوگی۔ اس وقت ہندستانی زبان میں نہ الفاظ کی کمی ہوگی اور نہ کلچر کی، اور سنسکرت، عربی، فارسی، پالی، مگدھی، بنگالی، مراٹھی، گجراتی اور دوسری تمام صوبائی زبانوں کے الفاظ کا، اس کھلے ہوئے وسیع تر دربار میں تہہ دل سے خیر مقدم ہوگا اور انھیں عزت کا مقام دیا جائے گا۔ ہر شخص اس کے تمام الفاظ سے مانوس ہوگا۔ اس وقت ہماری کانگریس کی روح جو ہر ایک کا یکساں اپنائیت کے ساتھ استقبال کرتی ہے خواہ وہ شیعہ ہو یا سنّی، برہمن ہو یا غیر برہمن، دراوڑ ہو یا گونڈ۔ یہ بتائے گی کہ ہماری ہندستانی کتنی مالدار اور طاقتور ہے، تاکہ پھر کوئی یہ نہ پوچھے "یہ لفظ کہاں سے آیا؟" لیکن تمام لوگوں کو اُن تمام الفاظ کو ہندستانی کے طور پر قبول کرنا ہوگا جو زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور ہندستانی عوام کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ سنسکرت، عربی اور فارسی الفاظ کی بات تو چھوڑیے، کنڑ، تیلگو، ملیالم اور تامل کے ان الفاظ کو بھی جو ان تمام زبانوں میں مشترک ہیں اور جو اس لائق ہیں کہ انھیں پورے ملک میں پھیلایا جائے، ہندستانی کی حدوں میں بے روک ٹوک شامل کیا جائے گا اور انھیں ایسی محبوبیت عطا کی جائے گی کہ کسی کا دل بھی انھیں نکال باہر کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔

لیکن یہ سب کچھ تو ابھی خواب ہے جس کی تعبیر مستقبل ہی میں نظر آسکتی ہے۔ اس وقت تو ہماری ہندستانی صرف ہندی اور اردو کے ان الفاظ پر مشتمل ہوگی جو عام طور سے سمجھ لیے جاتے ہیں اور ان میں سے بھی ترجیح ان الفاظ کو دی جائے گی جو پنجاب، راجستھان، بہار، بندیل کھنڈ، بنگال، گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک اور دوسرے علاقوں میں آسانی سے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ "زمین" "بھومی" کے مقابلے زیادہ مقبول ہوگا۔ اسی طرح لفظ "کارن" لفظ "وجہ" کے مقابلے میں زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال ہوگا۔ لیکن دونوں کو صحیح بہر حال تسلیم کیا جائے گا۔

قومی زبان کا تعلق پوری قوم سے ہوتا ہے جسے عرف عام میں "سب کی بولی" کہا جائے گا۔ اس کی حقیقی شکل رائے عامہ کے ذریعے نکھاری جائے گی اور عوام ہی اسے اپنی ضروریات اور آسانی کے مطابق اخذ کریں گے۔ اس میں لفظ "نیر" بھی شامل ہوگا اور "پانی" اور "جل" بھی کیونکہ پانی کے لیے جنوبی ہندستان کے بارہ کروڑ افراد صرف لفظ

"نیر" ہی سے واقف ہیں۔

قومی زبان کے لیے اناج اور مسالے تو شمال کے ہندو اور مسلمان فراہم کریں گے لیکن ہم ان چیزوں کو ملا کر پکوان تیار کریں گے۔ ہم یعنی مغربی جنوبی اور مشرقی ہندستان کے لوگ، ہم جن کا دل پرانے جھگڑوں اور نئے تعصبات سے کڑھتا ہے، ہم جو ماضی سے رشتہ توڑے بغیر حال میں سانس لینا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک تابناک مستقبل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

☆☆☆

سلیمان ندوی

وہ زبان جو آج ہندستان میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے، خواہ اسے آپ اردو کہیں یا ہندستانی، عرب، ایران یا ترکی سے درآمد نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ اسی ملک میں پیدا ہوئی۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں نے اسے کچھ الفاظ اور محاوروں سے آشنا کرلیا جن کا تعلق اسلامی ممالک کی زبانوں سے تھا لیکن حالات کے تحت ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی زبان ہو وہ ان لوگوں کی ضروریات اور تقاضوں کی عکاسی کرتی ہے جو اسے استعمال کرتے ہیں۔

یہ زبان جسے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر استعمال کرتے ہیں، اسے ترقی کی اس منزل تک پہنچنے میں تقریباً ایک ہزار سال لگے ہیں۔ درحقیقت اظہار کا ایک مشترکہ وسیلہ وضع کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں نے صدیوں جو کوششیں کیں یہ اسی کا ثمرہ ہے اور ہندو مسلم یکجہتی کا سب سے بڑا سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اسے تباہ کرنا چاہتے ہیں وہ نئے فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دے رہے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ ملک کو بلکہ ایک ایک گاؤں اور قریہ کو دو الگ الگ قوموں میں تقسیم کردیا جائے جو ایک دوسرے کو شک و شبہ یا رقابت کی نظر سے دیکھیں کیونکہ مشترکہ زبان کی عدم موجودگی کی صورت میں وہ ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہندو بھائیوں کا ایک طبقہ جو یہ سوچتا ہے کہ قوم پرستی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ ہر غیر ملکی عنصر سے رشتہ توڑلینا چاہیے وہ اس الزام کو بنیاد بناکر اس زبان کی مخالفت کر رہا ہے کہ اپنے کردار کے اعتبار سے یہ اجنبی ہے۔ وہ ایک ایسی خالص ہندستانی زبان کو فروغ دینا چاہتے ہیں جس میں سے وہ تمام غیر ملکی الفاظ نکال دیے جائیں جو بتدریج ہماری گفتگو اور تحریر میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس طرح چند انگریزی الفاظ لے لینے سے ہماری زبان انگریزی نہیں ہوگئی اسی طرح عربی

اور فارسی کے چند الفاظ اور محاورے اخذ کر لینے کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ ہماری زبان کا بنیادی کردار ہی بدل گیا۔

ہمارے سامنے دو متبادل ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہندستان صرف اور صرف ہندوؤں کا ملک بن جائے جس کی زبان اور کلچر اپنے کردار کے اعتبار سے خالص ہندوانہ ہو اور اس خطۂ زمین پر رہنے والے تمام تر باشندوں کو اس کی بالادستی کو تسلیم کرنا پڑے۔ یہ ایک خطرناک راستہ ہے جو مشکلات سے پُر ہے اور جس کی کامیابی حد درجہ مشتبہ بھی ہے۔

دوسرا متبادل یہ ہے کہ ہندستان کو مختلف قسم کے پھولوں کا ایک گلدستہ تصور کیا جائے جس میں ہر پھول کی اپنی خوشبو اور اپنا رنگ ہے اس کے باوجود سب کے سب حب الوطنی کے مشترکہ دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو ہر فرقے کی بقا اور خوشحالی کی ضامن ہے اور اسی ماحول میں ہر فرقہ پوری قوم کو مستحکم اور خوشحال بنانے میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں قوم پرستی کا وہ محدود تصور جس کا ہندوؤں کا ایک طبقہ قائل ہے اور جو اس سطح تک جاتا ہے کہ اس ملک کے بہت سے باشندوں کو غیر ملکی قرار دینے سے بھی گریز نہیں کرتا اسی روایتی تنگ نظری کا پروردہ ہے جس نے ہندوؤں کو ہمالیہ اور بحر ہند کی حدوں تک محدود رکھا اور جس نے صدیوں تک چھوا چھوت کی برائی کو پروان چڑھایا۔

اس زبان کو جو آج ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسلامی زبان قرار دینا ایک غلطی ہے۔ اس بات کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ اس حقیقت کو چھپایا جائے کہ اسے فروغ دینے میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں؛ لیکن ان کوششوں کا کھوکھلا پن گذشتہ سال کل ہند یوم اردو کے موقع پر اس وقت ظاہر ہو گیا جب پورے ملک میں ان تقریبات میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی کافی دلچسپی سے حصہ لیا اور اس طرح اس بات کا ٹھوس ثبوت پیش کیا کہ یہ زبان مجموعی طور پر پورے ملک کی زبان ہے۔ بہت سے اہل نظر ہندو اسے اپنی مادری زبان بتانے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے۔

اگر یہ بات بھی تسلیم کر لی جائے کہ اردو صرف مسلمانوں کی مادری زبان ہے تب

بھی کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ترقی سے اکثریتی فرقے کی روایات اور کلچر کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ اکثریتی طبقہ تو اپنی عددی برتری کی بنیاد پر پھر بھی اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتا ہے لیکن اقلیتی فرقہ اگر اس زبان کو اپنا لیتا ہے جسے دانستہ طور پر اکثریتی فرقے کے لیے فروغ دیا جارہا ہے تو تہذیبی سطح پر اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔

پنجاب کے ایک ہندو پروفیسر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ اردو ان لوگوں کی مادری زبان ہے جو ملک کے ان حصوں میں آباد ہیں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ یعنی اس علاقے میں جو انبالہ سے بھاگلپور تک پھیلا ہوا ہے جبکہ ان صوبوں میں یہ عام طور سے نہیں بولی جاتی جہاں اکثریت میں مسلمان ہیں۔ یعنی کشمیر، شمال مغربی صوبہ سرحد؛ سندھ ، پنجاب اور بنگال۔ لہٰذا یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی زبان ہے۔ اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے اسے اپنایا بلکہ تہذیبی یکجہتی کے حق میں اسے قومی زبان بنائے جانے کے دعوے کو استحکام عطا کیا۔ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی اور زبان کے لیے وہ اسے ترک کیوں کر دیں۔

یہاں بار بار دہرائے جانے والے اس مفروضے کو درست کرنا ضروری ہے کہ ان علاقوں میں جہاں مخصوص علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں، ہندو اور مسلمان ایک ہی زبان ایک ہی طرح سے بولتے ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ بنگال میں تمام فرقوں کی مشترکہ زبان بنگالی ہے ، اسی طرح گجرات میں گجراتی ، مہاراشٹر میں مراٹھی اور مدراس میں کنڑ اور تیلگو زبانیں ہیں۔ یہ بات جزوی طور پر درست اور جزوی طور پر غلط ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ بات صحیح ہے کہ ان علاقوں کے ہندو اور مسلمان جو افعال اور حروف عطف وغیرہ استعمال کرتے ہیں وہ ایک ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے اسم اپنی تہذیبی اور سماجی روایات کے مطابق الگ الگ ہوتے ہیں۔ بنگال کے ایک مسلمان پروفیسر کے حوالے سے میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ بنگالی مسلمان پانی کو "پانی" کہتے ہیں جبکہ بنگالی ہندو اسے "جل" کہتے ہیں۔ مسلمان ماں کی بہن کو "خالہ" کہتا ہے اور ہندو اسے "موسی" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ مراٹھی اور

گجراتی کے تعلق سے تو میں ذاتی علم کی بنیاد پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پارسیوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کی گجراتی ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی مراٹھی اور ہندوؤں کی مراٹھی کا فرق آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال سے ہندی اور اردو کا فرق اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا مذکورہ بالا زبانیں بولنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ سنسکرت آمیز ہندی ہی اس ملک کی اصل زبان ہے تو اس سے فرقہ پرستی کو شہ ملے گی اور قوم کی یکجہتی تباہ ہو گی۔

زبان کے مسئلے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندستانی یا اردو کو قومی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ اسے آسان ہندی بھی کہا جا سکتا ہے۔ خالص سنسکرت آمیز ہندی یا سنسکرت کو ہندوؤں میں وہی مقام حاصل ہوگا جو مسلمانوں میں عربی یا فارسی کا ہے۔ اگر اس بنیاد پر ہم سب کے درمیان کوئی مفاہمت ہو جائے تو ہماری بہت سی دشواریاں دور ہو جائیں گی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے کچھ ہم وطن ایسے بھی ہیں جو ہم پر نہ صرف ہندی بلکہ انتہائی سنسکرت آمیز ہندی قومی زبان کے طور پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ عربی اور فارسی کے دقیق الفاظ سے بھی زبان کو بوجھل بنانا چاہتے ہیں۔ وہ جو غلطی کر رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ ملک کو دو مخالف خیموں میں تقسیم کیے جانے کی شکل میں ظاہر ہو گا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ گذشتہ چالیس برسوں کے دوران اس بات کا زبردست پروپگنڈا کیا گیا کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اردو کو اب بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دونوں فرقوں کی مشترکہ زبان ہے۔ بہت سے ہندو رسالے اور اخبارات اردو میں شائع ہوتے ہیں نیز یہ کہ بہت سے ممتاز ہندو اسکالرز اسی زبان میں لکھ رہے ہیں۔ اس کی ایک ٹھوس مثال ہم یہ پیش کرتے ہیں کہ گذشتہ سال ستمبر میں یوپی کے محکمۂ تعلیم نے دیہی علاقوں کی لائبریریوں کے لیے کتابیں طلب کیں۔ محکمے کو جو اردو کی اٹھارہ سو کتابیں موصول ہوئیں ان میں نصف سے کچھ کم ہندو مصنفین کی تھیں اور جو 71 مخطوطے موصول ہوئے، ان میں 36 ہندوؤں کے لکھے ہوئے تھے۔ اس سے یہ بات

واضح ہو جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہندوؤں کا ایک بڑا فرقہ ایسا موجود ہے جو اس مسئلے کو تنگ زاویے سے نہیں دیکھتا بلکہ اسے مشترکہ تہذیبی ورثہ سمجھتا ہے جو ہمارے آباو اجداد سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ اس ورثے کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں ہماری قومی یکجہتی اور مستقبل کی ذمہ داریوں سے کامیابی سے عہدہ بر آ ہونے کی بہترین ضمانت موجود ہے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ چونکہ ہمیں اپنے بہت سے ایسے ہموطنوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے جن کی مادری زبانیں سنسکرت ہی سے نکلی ہیں مثلاً بنگالی اور مراٹھی، لہٰذا سنسکرت آمیز ہندی ہی موثر طور پر مشترکہ زبان بن سکتی ہے۔ ایسا سوچنا دراصل، مسئلے کو ایک آنکھ بند کر کے دیکھے جانے کے مترادف ہے۔ اگر ہم دونوں آنکھیں کھلی رکھیں تو ہمیں یہ بھی دکھائی دے گا کہ کشمیر، سندھ، بلوچستان اور پنجاب جیسے صوبے بھی ہیں جن کی زبانوں کی اصل مختلف ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ خالص دراوڑی گروپ کی زبانوں کا تعلق نہ اردو سے ہے اور نہ ہندی سے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہاں کچھ مشترک ہے تو یہ ہے کہ مدراس پریسی ڈنسی کی مسلم آبادی اردو عام طور سے بولتی ہے اور اس کے اثرات مالابار کے دور دراز حصوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندستان کی وہ نازک اور میٹھی زبان جسے اصلاً ہندی کہا جاتا تھا اسے مسلمانوں نے نہ صرف ماضی میں پسند کیا بلکہ آج بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اسی زبان میں سیّد حسین گیسو دراز اور لکھنؤ کے سعد اللہ طراز کے زمانے سے لے کر اب تک بہت سے مسلمان صوفیوں نے اپنے نغمے بکھیرے ہیں۔ سینکڑوں مسلمان شاعروں نے محبت اور لگاؤ کی اس دلکش زبان میں اپنے دل نکال کر رکھ دیے ہیں لیکن وہ ہندی جس کا آج پرچار کیا جارہا ہے وہ قطعی مختلف ہے۔ یہ تو ہندستان کو برطانوی حکومت کی دین ہے اور اس نے دانستہ طور پر ایسا کیا ہے کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے یہ صورت حال کبھی نہیں تھی۔ دراصل انگریزوں نے ہماری زبانوں کو بھی بڑی کامیابی سے ہمارے اندر پھوٹ ڈالنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

اس سلسلے میں ایک وہم یہ بھی ہے کہ اردو صرف شہروں میں بولی جاتی ہے اور

ہندی دیہی علاقوں میں۔ حقیقتاً تو شہروں اور گانوؤں کی زبان بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ ان میں فرق بس اتنا ہی ہے جتنا شہری اور دیہی طرز زندگی کا ہوتا ہے۔ جو ہندی رسالوں اور اخباروں میں ہوتی ہے اسے شہروں میں کم ہی سمجھا جاتا ہے اور گانوؤں میں تو اس سے بھی کم۔ اس دعوے کی سچائی کا پتہ آسانی سے زندگی کے ہر روز کے معمول کے تجربات سے لگایا جاسکتا ہے۔

فرقہ وارانہ تلخی کے موجودہ ماحول میں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے اپیل کروں کہ وہ ملک کے وسیع تر مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تنگ نظری اور جھوٹی قوم پرستی کا راستہ ترک کردیں۔ ورنہ اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا جو کسی کے حق میں نہ ہوگا۔

سمپورنانند

یہ سوال اب محض علمی دلچسپی کا باعث نہیں رہا کہ ہندستان کی قومی زبان کیا ہوگی۔ مٹھی بھر ایسے لوگوں کے ایک حلقے کے سوا جنھوں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے کہ مستقبل قریب میں رابطے کی زبان کا درجہ انگریزی کے سوا کوئی دوسری زبان لیتی نظر نہیں آتی، باقی تمام لوگوں کے لیے ایک مناسب قومی زبان تلاش کرنے کا سوال ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے اور دوسرے تمام زندہ مسائل کی طرح اس مسئلے نے بھی کافی شدت اختیار کر لی ہے جس کے باعث غیر جذباتی انداز میں کچھ سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے فرقہ وارانہ احساسات بھی پیدا ہو گئے ہیں جس کے باعث صورت حال مزید پیچیدہ ہو گئی ہے جیسا کہ ان حالات میں عموماً ہوتا ہے۔

ایک طرح سے یہ مسئلہ حل ہی ہو گیا ہے۔ اس بات پر ہر شخص متفق ہے کہ اگر کوئی ایسی زبان ہے جو یہ مقصد پورا کر سکتی ہے تو وہ شمالی ہند کے تعلیم یافتہ طبقے میں استعمال ہونے والی زبان ہے۔ کچھ لوگ یہ کہنا چاہیں گے کہ شمالی ہند میں بولی جانے والی زبان یہ جگہ لے سکتی ہے۔ جب مختلف صوبوں کے غیر انگریزی داں افراد کہیں ایک جگہ ملتے ہیں تو ان کے درمیان اظہار کا ذریعہ یہی زبان ہوتی ہے اور یہ بہت پہلے ہی سے ہوتا آرہا ہے۔ یہ مقام اس نے متعدد تاریخی سیاسی اور تہذیبی اسباب کی بنا پر حاصل کیا ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات بھی نہیں ہے کہ ملک کے ان حصوں کی زبان دور دراز تک پھیلی جو گذشتہ پانچ ہزار برسوں کے دوران بڑی بڑی سلطنتوں کے مرکز رہے ہیں، جہاں مقدس مقامات واقع ہیں اور جہاں ایسی قدیم یونیورسٹیاں رہی ہیں جن میں اس عظیم ملک کے طول و عرض سے ہزاروں مرد و زن ہر سال علم کی پیاس بجھانے کے لیے آتے رہے ہیں۔

لیکن اس عام اتفاق کے باوجود یہ تنازعہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ یہ دو سوالوں

کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ اور یہی سوال مسئلے کی اصل بنیاد ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ اس زبان کا نام کیا ہو دوسرا یہ کہ اس کی شکل کیا ہو۔

پہلے ہم اول الذکر سوال پر غور کریں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شمالی ہند میں ہمارے پاس دو زبانیں ہیں۔ ہندی اور اردو اور ان میں سے کسی ایک کا ہمیں انتخاب کرنا ہے۔ یہ ایسا موقف ہے جس کا دفاع کرنا مشکل ہے۔ کسی بھی زبان کی امتیازی شناخت اس کے افعال، ضمیر، حروف عطف اور حروف ربط وغیرہ سے قائم ہوتی ہے۔ اگر اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو اسے ایک ہی زبان کہا جائے گا۔ اس کا سفر "پراکرت" سے شروع ہوا۔ یعنی قدرتی یا عام لوگوں کی بول چال کی زبان۔ یہ زبان سنسکرت سے مختلف تھی جو تعلیم یافتہ طبقے کی زبان تھی۔ اسے عام طور سے "بھاشا" یا "بھاکا" کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس میں بہت سے فارسی اور کچھ عربی کے الفاظ شامل ہوگئے۔ اس کی وجہ سے نام تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ انگریزی میں بہت سے لاطینی، یونانی اور دوسرے غیر ملکی الفاظ شامل ہوئے لیکن اس کا نام انگریزی ہی رہا۔ ان میں بہت سے "طہارت پسند" ہیں جو "اینگلو سیکسن" (نارمن فتح سے قبل کی انگریزی) کے بہت بڑے مداح ہیں۔ دوسرا طبقہ اس زبان کا دم بھرتا ہے جس میں غیر ملکی الفاظ زیادہ ہیں۔ لیکن یہ دونوں طبقے اپنی زبان کو انگریزی ہی کہتے ہیں۔ بنگالی، مراٹھی اور گجراتی کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان زبانوں میں عربی اور فارسی کے بہت سارے الفاظ گھل مل گئے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شمالی ہند میں پرانے نام بھاشا کو برقرار رکھنے پر کیوں نہیں اصرار کیا گیا۔ خیر حالات نے ایک دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ زبان کا وہ روپ جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں اردو کہلاتا ہے۔ دوسرا روپ جس میں سنسکرت، پراکرت اور ان سے اخذ کیے گئے دوسرے الفاظ شامل ہیں، اب ہندی کہلاتا ہے۔ یہ وہ نام ہے جسے ماضی کے متعدد مسلمان مصنفین نے رائج کیا تھا۔ لیکن بہت سے غیر ملکی الفاظ کے باوجود جن میں سے بیشتر اسم اور صفت ہیں، زبان بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ اس کے اردو روپ نے خوش قسمتی سے درباروں میں فارسی کی جگہ سرکاری

سرپرستی حاصل کرلی۔ مزید برآں آج کل مسلمان اسے مسلم تہذیب کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال اور مدراس جیسے صوبوں میں مسلمان بچوں کو اردو پڑھائے جانے پر اصرار کیا جارہا ہے۔ ان بچوں کو جن کے آباواجداد بنگالی اور تمل بھاشی ہونے کے باوجود اچھے مسلمان تھے۔ اس صورت حال نے قدرتی طور پر ہندوؤں کے دل میں ایک مخالف رو پیدا کردی جو ہندی کے حق میں تھی۔ اسی الجھے ہوئے سوال سے بچنے کے لیے "ہندستانی" کا نام تجویز کیا گیا۔ میں ذاتی طور پر اسے بھاشا کہنا ہی پسند کرتا۔ ہندی نام بھی کئی صدی پرانا ہے۔ یہ نام مسلمانوں ہی کا عطا کردہ ہے جسے ہندوؤں نے بھی بخوشی قبول کرلیا۔ لیکن میں اس کا نام ہندستانی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ہندستان بلکہ شمالی ہند کی زبان ہے۔ یہ ہندی جیسا جامع نام نہیں ہے۔ ہندی۔ یعنی ہند (پورے بھارت ورش) کی زبان۔ بہر حال یہ نام مٹی سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن اسے اردو کہنا میرے خیال سے اصولاً غلط ہے۔

بہر حال اب ہم دوسرے سوال کی جانب آتے ہیں۔ جو بہت ہی اہم سوال ہے۔ اس ہندستانی زبان کی شکل کیا ہونی چاہیے؟ یہاں میں قدرتی بہاؤ کی وکالت کروں گا۔ آپ کچھ مصنوعی الفاظ انتہائی پڑھے لکھے افراد کے حلق میں تو انڈیل سکتے ہیں لیکن عوام کی زبان قدرتی انداز سے آگے بڑھتی ہے۔ یہ سینکڑوں سرچشموں سے الفاظ حاصل کرتی ہے لیکن انھیں اپنے اندر جذب کر کے اپنے جسم وجاں کا حصہ بنالیتی ہے۔ ہندستانی میں سنسکرت "تدبھو" کے بے شمار الفاظ ہیں لیکن ان کی سنسکرت شناخت ختم ہو چکی ہے ادبی مقاصد کے لیے اس نے سنسکرت کے "تتسم" (خالص) الفاظ بھی لیے۔ اس میں فارسی الفاظ بھی خاصی بڑی تعداد میں ہیں اور کسی حد تک عربی کے "تدبھو" اور "تتسم" الفاظ بھی موجود ہیں۔ اس نے بڑی خوشی سے انگریزی اور دوسری یوروپی زبانوں سے بھی متعدد الفاظ اخذ کیے۔ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ یہ تو زبان کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مصنفین نہ صرف یہ کہ زبان استعمال کرتے ہیں بلکہ اسے بدلتے بھی ہیں اور نئے موڑ بھی دیتے ہیں۔ ہماری قومی زندگی نشاۃ ثانیہ کے ایک اہم دور سے گذر رہی ہے۔ آرٹ اور

تہذیب، سیاست اور معیشت غرضیکہ ہر شعبے میں تغیر رونما ہو رہا ہے۔ زبان کو نئے اور معنی خیز خیالات اور تخیلات کے سرچشمے کے طور پر اپنا رول نبھانا ہے لیکن اس کا موجودہ ذخیرۂ الفاظ ناکافی ہے۔ جزوی طور پر اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے ادیبوں نے انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کی ہے اور ہندستانی کے تمام تر محاوروں اور ذخیرۂ الفاظ کی توانائی اور ان کے تخلیقی اظہار کے امکانات سے صحیح معنوں میں واقف نہیں ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زبان معقول حد تک مالدار نہیں ہے۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آسانی سے دستیاب الفاظ یعنی سنسکرت، عربی اور فارسی کے الفاظ لے لیے جاتے ہیں۔ ان چند افراد کو چھوڑ کر جو اپنی نام نہاد علمیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے جملوں کو غیر ضروری طور پر سنسکرت یا فارسی کے مشکل الفاظ سے بوجھل بنا دیتے ہیں باقی جو الفاظ ان زبانوں سے لیے جاتے ہیں ان کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ جائز اور مناسب ہیں۔ ایک مصنف کی حیثیت سے میں روزانہ یہی کچھ کر رہا ہوں۔ یہ کوئی قابل مذمت بات نہیں ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ جو ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں جہاں سنسکرت کے الفاظ ہمیں بچپن ہی سے سننے کو ملتے ہیں وہ قدرتی طور پر یہ الفاظ استعمال کریں گے۔ یہی بات فارسی اور عربی کے الفاظ پر بھی صادق آتی ہے۔ اس میں ایک دوسرے سے بدگمان ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ لیکن ایک بات میں بڑے واضح لفظوں میں کہوں گا۔ دوسری زبانوں سے صرف بوقت ضرورت ہی لفظ لیے جائیں اور پھر انھیں اپنی زبان میں جذب کر لیا جائے۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ اردو اسلوب کے علمبردار اس معاملے میں سب سے بڑے قصوروار ہیں۔ وہ اپنے موضوعات، تخیلات، تشبیہات اور استعارات بھی غیر ہندستانی وسائل سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی تحریریں، عوام کے بڑے حلقے کو متاثر نہیں کر پاتیں۔ یہاں میری مراد بطور خاص شاعری سے ہے۔ آپ گانووں والوں میں جائیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملیے اور دیکھیے کہ نہ صرف کبیر، تلسی، سورداس اور میرا جیسے مذہبی شاعروں کی ادبی تخلیقات کو کافی مقبولیت حاصل ہے بلکہ جائسی اور پدماکر، رحیم

اور کیشو جیسے شاعروں کا بھی طوطی بولتا ہے۔ اس کے بعد غور کیجئے کہ کیا کسی عظیم اردو شاعر کی تحریروں کی رسائی بھی اس حلقے تک ہو سکی ہے! اس طرح کی تحریروں پر سب سے بڑا الزام یہی ہے۔ اوپر جن کویوں (شاعروں) کا ذکر کیا گیا ان کے حق میں کسی نے کوئی پروپگنڈا نہیں کیا۔ ان کے کارناموں نے انھیں شہرت دلائی کیونکہ وہ براہ راست لوگوں کے دلوں کو چھوتے ہیں۔ وہ ان چیزوں، اُن احساسات اور معاملات کا ذکر کرتے ہیں، جنھیں عوام اپنی ہی زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ایک نیا رجحان یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ کی اصل شناخت باقی رکھی جائے۔ لیکن اس طرح تو وہ زبان کا حصہ نہیں بنتے۔ انگریز غیر ملکی زبانوں سے الفاظ تو اپنی مرضی سے لے لیتے ہیں لیکن انھیں انگریزی قواعد اور تلفظ کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ تمام زندہ زبانوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔ اور ہندی والے بھی اسی پر عمل کرتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ودوان، سمراٹ، ودوشی، سکھ، خپ، گرہ ـــــ وہ الفاظ ہیں جن کا استعمال عام ہے۔ سنسکرت میں ان کی جمع بالترتیب یوں ہے۔ ودوان سہہ، سمراج ئہ، ودو شیہہ، سکھایہ، تپنسی، گرہنی۔ لیکن ہندی میں کوئی اس اصول کے اختیار کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ان الفاظ کی جمع بناتے وقت ہندی کی عام قواعد کے اصول سامنے رکھے جاتے ہیں۔ لیکن جب فارسی الفاظ درآمد کیے جاتے ہیں تو ادبی روایت کسی اور ہی صورتِ حال کا پتہ دیتی ہے۔ آپ کو نہ صرف عالم، تصنیف، رقعہ، جرم، شاہ جیسے الفاظ سیکھنا پڑیں گے بلکہ ان کی جمع بھی جو بالترتیب یوں ہیں۔ علما، تصانیف، رقعات، جرائم اور شاہان۔ اس صورتِ حال کو ختم ہونا چاہیے۔ لفظ یا تو ہندستانی ہو یا ہندستانی نہ ہو۔ اگر وہ ہندستانی ہے تو اسے اپنا پرانا خاندان بھول کر نئے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔

اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ یہ احتیاط بھی برتنی چاہیے کہ غیر ضروری طور پر اور دانستہ علمیت کا اظہار نہ کیا جائے۔ اگر اس طور پر محتاط رہا جائے تو سنسکرت اور فارسی کے الفاظ سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہمارے جیسے ملک میں جہاں ہندوؤں کو بالادستی حاصل ہے اور جہاں

ایسی زبانیں بولنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے جو سنسکرت سے نکلی ہیں یا جن کے تہذیبی ذخیرۂ الفاظ میں سنسکرت کے الفاظ کی تعداد بہت بڑی ہے، وہاں زبان کی ادبی شکل سنسکرت کے تدبھو اور تتسم الفاظ کی وجہ سے زیادہ نکھر کر سامنے آئے گی۔ یہی واحد روپ ان لوگوں کے لیے قابل فہم ہوگا جن کی مادری زبان ہندستانی نہیں ہے اور اسی کے ذریعے وہ بہتر طور پر اپنی خدمات انجام دے سکیں گے اور رفتہ رفتہ انھیں یہی کرنا بھی چاہیے۔ لیکن بڑی تعداد میں فارسی اور عربی کے جو الفاظ موجود ہیں، ان کے استعمال میں اس سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔ بڑی تعداد میں متبادل الفاظ یا مترادفات کی موجودگی زبان کے سرمائے کو بہر حال بڑھاتی ہے اور ادب کو حسن عطا کرتی ہے۔ انگریزی زبان اس کی خوبصورت مثال پیش کرتی ہے۔ ایک ہی خیال کو ادا کرنے کے لیے وہ ایک ہی معنی کے کئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً Question, Query, Interrogation اور Interpellation۔ یہ تمام الفاظ کسی ایک ہی سرچشمے سے نہیں لیے گئے ہیں۔ تو پھر ہندستانی کے پاس ایک خیال کے لیے ایک ہی لفظ کیوں ہو؟ اگر ایک لفظ کے لیے ہمارے پاس کچھ الفاظ سنسکرت سے لیے گئے ہوں اور کچھ فارسی سے تو رفتہ رفتہ وہ معانی کی کچھ نئی پرتیں بھی کھولیں گے اور اس طرح زبان اور اس کے ادب کی طاقت، حسن اور سرمایے میں اضافے کا باعث بنیں گے۔

لیکن صحت مند ترقی کے اس تصور سے ایک سنگین قسم کا خطرہ بھی جڑا ہوا ہے۔ اس کی جڑیں عدم رواداری میں پیوست ہیں۔ اگر اردو کو مسلم تہذیب کا مظہر سمجھا جائے گا اور اس کے مطالعے کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی جائے گی تو پھر ہندی کا استقبال ہندوؤں کی زبان کے طور پر ہوگا۔ اور یہ رجحان نظر بھی آنے لگا ہے لہٰذا ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ جیسی سیاسی جماعتوں کو اس مسئلے سے اپنے آپ کو الگ کر لینا چاہیے اور کانگریس ہی کی طرح زبان کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے طور پر ترقی کر سکے۔ ورنہ یہ خلیج مزید وسیع ہو جائے گی اور پھر اس کا پاٹنا مشکل ہوگا۔ ہر ادیب اور مقرر کو اس بات کی چھوٹ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار زبان کے جس روپ میں کرنا چاہے کرے۔ مجھے اس

بات کی پوری امید ہے کہ بہتر حالات سامنے آئیں گے۔ لکھنے اور بولنے والے اپنی لافانی روح کی تسکین کے لیے خلا میں نہیں لکھتے اور بولتے وہ جلد ہی ایسی زبان استعمال کرنے لگیں گے جو انھیں بڑی تعداد میں قاری یا سامع فراہم کر سکے۔ وہ رہنما، جو اہل فکر ہیں انھیں یہ بھی جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ آسانی کے لیے زبان کی دونوں شکلوں کو کیا نام دیا جانا چاہیے۔ اگر ہندو فارسی ذخیرۂ الفاظ پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کریں اور ایسا وہ آسانی سے کر بھی سکتے ہیں اور مسلمان سنسکرت کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کریں تو آج جن دشواریوں کا سامنا ہے ان میں سے بیشتر خود بخود دور ہو جائیں گی۔ مجھے اس "تلخ نوائی میں معاف" کیا جائے۔ لیکن میں کہوں گا کہ اس معاملے میں ہمارے مسلمان بھائی ہندوؤں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی غافل ہیں۔

اور اس سے اہم بات یہ کہ میں زیادہ سے زیادہ رواداری اور در گذر کا مادہ پیدا کرنے کی وکالت کروں گا۔ تقریر کے دوران اگر کوئی ٹوکے اور صحیح ہندستانی بولنے کا حکم صادر کرے تو اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ اس طرح ٹوکنے والا یا تو اپنی لاعلمی کا مظاہرہ کرتا ہے یا اپنے بے ڈھنگے پن کا، عام طور سے دونوں چیزوں کا۔ لیکن وہ خواہ کوئی بھی ہو ہندو یا مسلمان، وہ ہندستانی کا دشمن ہے۔ ایسا شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ ہم سب کسی بھی تقریر کا متن تو سمجھ ہی لیتے ہیں کیونکہ ہم موضوع سے واقف ہوتے ہیں، بھلے ہی ادھر ادھر کا ایک آدھ لفظ نہ سمجھ پائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہندستانی کے فروغ میں محدود نظریات کے لوگوں کی جانب سے دانستہ طور پر کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی گئی تو یہ ایک انتہائی خوبصورت اور طاقتور زبان کے طور پر ابھر کر سامنے آئے گی۔ ہندستان ایک عظیم تہذیب کا وارث ہے اور ہمیں اس کی آئینہ داری کے لیے ایک اچھی زبان کی ضرورت ہے۔

نوٹ:۔ میں نے ہندستانی کو شمالی ہند کے تعلیم یافتہ طبقے کی زبان قرار دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ عوامی زبان کی قسمیں کھاتے ہیں، اس زبان کی جو گاؤوں کی عورتیں اور مرد

بولتے ہیں۔شاید وہ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ایک بنیادی ہندستانی تو ہر طرف رائج ہے لیکن مقامی بولیوں میں کافی فرق ہوتا ہے۔مثال کے طور پر مشرقی اور مغربی یوپی کی بولیوں میں فرق ہے۔ مشرقی یوپی میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے اور یہ الفاظ قریب قریب اصل شکل میں موجود ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں احتیاط سے سوچنا چاہیے کہ یہ تعلیم یافتہ طبقہ کن لوگوں پر مشتمل ہے۔عدالتوں کے آس پاس جو دنیا نظر آتی ہے وہ فارسی آمیز ہندستانی سے گھری ہوئی ہے لیکن عدالتیں سماجی زندگی کا صرف ایک پہلو ہوتی ہیں۔جبکہ سماجی زندگی کئی چیزوں کا احاطہ کرتی ہے اور تہذیبی مذہبی اور دیگر سرگرمیاں جاری رہتی ہیں اور جہاں تک عوام کی اکثریت کا تعلق ہے ان کی بیشتر سرگرمیوں کی عکاسی سنسکرت آمیز ہندستانی میں ہوتی ہے۔لہٰذا تعلیم یافتہ طبقے کی زبان سے مراد دو انتہاؤں کے درمیان کی زبان ہے۔عاد اعظم یا پھر ذو اضعاف اقل مشترک۔

تارا چند

حالیہ دنوں میں جو مسئلہ اُن حلقوں کی تشویش اور پریشانی کا باعث بنا ہے جنھیں جدید ہندستانی زبانوں خاص طور سے صوبہ متحدہ (یوپی) میں بولی جانے والی زبان کے ادب کے فروغ سے دلچسپی ہے، وہ کوئی نیا نہیں ہے۔ دراصل جب انیسویں صدی کے آغاز میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں جون بوتھوک گلکرائسٹ نے للولال، سادل مصرا، میر امّن، شیر علی افسوس، میر بہادر علی، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، مظہر علی خان ولا، نہال چند اور دوسرے لوگوں کو جمع کیا اور انھیں فارسی اور برج بھاشا کی کتابیں ترجمہ کرنے کے کام پر مامور کیا، تب متعلقہ کام کے لیے منتخب کی گئی زبان کے نام، کردار، معیار اور اسلوب کا مسئلہ پیش آیا۔ انیسویں صدی کے پورے عرصے میں یہ مسئلہ اپنی جانب لوگوں کی توجہ مرکوز کراتا رہا۔ بعض دہائیوں میں تو اس پر بڑی گرما گرم بحثیں بھی ہوئیں۔ انیسویں صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائی میں جون بیمس اور ایف ایس گروسے (Growse) نے ممتاز جریدوں میں باقاعدہ بحث بھی چھیڑ دی۔ راجہ شیو پرساد ستارۂ ہند نے جون بیمس کے اس موقف کی وکالت کی کہ فارسی اور عربی عناصر کو برقرار رکھا جائے لیکن راجہ لکشمن سنگھ نے ان کی مخالفت کی اور گروسے کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ ان عناصر کی جگہ سنسکرت آمیزی کو فروغ دیا جائے۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہے کہ عیسائی مشنریوں نے اس رجحان کو پروان چڑھانے میں جو کچھ کیا وہ کم نہیں تھا۔ ہندستانی فلسفے کے شہرۂ آفاق اسکالر جی۔ اے۔ گریرسن نے اپنی تصنیف "ہندستان کا لسانی سروے" (جلد IX، حصہ 1) میں کہا ہے: "بدقسمتی سے اس عرصے میں سب سے زیادہ طاقتور انگریزی حلقے کا جھکاؤ سنسکرت پریمیوں کی جانب رہا۔ اس سنسکرت آمیز ہندی کو مشنریوں نے بڑے پیمانے پر استعمال کیا اور انجیل کے تراجم بھی اسی زبان میں کرائے گئے۔ وہ چند مقامی

ادیب جو صاف ستھری ہندی کے حق میں ہیں،اس گمراہ کن تحریک کی تیز آندھی میں ٹِک نہ سکے اور انھیں کچھ زیادہ کامیابی نہ مل سکی"۔

بیسویں صدی کے آغاز سے اس بحث نے ایک بار پھر شدت اختیار کرلی۔اس طرح یہ مسئلہ جس پر تقریباً ڈیڑھ صدی سے سنجیدہ بحث چلی آرہی ہے نہ تو وقتی یا ہنگامی نوعیت کا ہے اور نہ غیر اہم۔دراصل اس کا حل ایسے نتائج کا حامل ثابت ہوسکتا ہے جن کی عملاً بڑی اہمیت ہوگی لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس پر غیر جذباتی انداز سے گفتگو کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو،غیر جانبداری کی اسپرٹ بروئے کار لائی جائے۔اس سوال کی خوبیوں اور خامیوں نیز اس بحث میں فریقین کے درمیان اختلاف کے نکات پر غور کرنے سے قبل مجھے یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس کے لیے جو نام ہم استعمال کریں اس کی پورے طور پر وضاحت ہوجائے کیونکہ میری رائے میں بہت ساری غلط فہمیاں واضح نام نہ ہونے کی وجہ سے راہ پا گئی ہیں۔اس سلسلے میں کئی نام استعمال کیے گئے ہیں۔ان میں بھاشا،ہندوی،ہندی ہندستانی،زبانِ دہلوی، کھڑی بولی ،مدھیہ دیش کی بولی ،ریختہ ،زبان اردوئے معلّی اور اردو۔ان تمام ناموں میں ہندی،ہندستانی اور اردو،دوسرے ناموں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور حقیقت تو یہ ہے یہ تنازعہ انھی تین ناموں کو اپنانے کے سوال پر ہے۔

ہندی

پہلے ہم نام "ہندی" پر بحث کریں جیسا کہ ہندستانی فلسفے کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ لفظ ہندی یا ہندوی مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ان میں جو تین سب سے اہم ہیں،ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

1۔ ہندی یا ہندوی نام عام طور سے ان تمام چیزوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کا تعلق ہندستان سے ہے تاکہ غیر ہندستانی چیزوں سے فرق واضح ہوجائے۔اس کے استعمال کا سلسلہ اُس دور سے جاملتا ہے جب مسلمانوں کا ہندستان سے رابطہ قائم ہوا۔ یہ نام ہند آریائی

بولی کے لیے اس وقت سے استعمال کیا جانے لگا جب مسلمان لاہور اور دلی نیز ان شہروں کے مضافات میں آباد ہوئے۔ اس کے استعمال کے بارے میں کچھ مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ 1126ء میں محمد عوفی نے نظموں کا ایک انتخاب شائع کیا۔ اس میں انھوں نے خواجہ مسعود سعد سلمان کا ذکر کرتے ہوئے ان سے ایک دیوان منسوب کیا ہے جو ہندی میں لکھا گیا تھا۔ علاؤ الدین خلجی کے دورِ حکومت (1315ء-1295ء) میں فخر الدین مبارک غزنوی نے ایک فرہنگ ترتیب دی جس میں انھوں نے فارسی الفاظ کے ہندی مترادفات درج کیے ہیں۔ امیر خسرو، جن کا انتقال 1325ء میں ہوا ہندی اور ہندوی دونوں اصطلاحات استعمال کرتے تھے۔ شاہ میراں جی شمس العشاق نے 'جن کا انتقال 1495ء میں ہوا، اپنے کلام کی زبان ہندی بتائی ہے۔ دکن میں دکنی کے ساتھ ساتھ اس زبان کے لیے ہندی کا نام بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ نصرتی نے جو بیجاپور کے علی عادل شاہ دوئم (1673ء-1656ء) کا درباری شاعر تھا اپنے ہندی کلام کا ذکر کیا ہے۔ مغلیہ دربار نے اُس شاعری کی جب سرپرستی شروع کی جسے دکن نے فروغ دیا تھا، تو دلی کے شاعروں نے بھی اس زبان کو ہندی ہی کہا۔ ایسی متعدد مثالیں ان شاعروں کی تحریروں میں مل جائیں گی جن سے اس نام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں شاہ حاتم سے لے کر غالب تک شامل ہیں۔ اسی طرح ابتدائی دور کے نثر نگار سے لے کر سر سیّد احمد خاں تک، بیشتر اہل قلم نے اسے ہندی کہا ہے۔ گویا بعد میں جسے اردو کہا گیا وہ ان معنوں میں ہندی ہی ہے۔

2۔ اس اصطلاح کا دوسرا استعمال ان بولیوں کے لیے ہوا ہے جنھیں گریرسن نے Terriary پراکرت کہا ہے یا ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے جنھیں "جدید ہند آریائی زبانوں" سے تعبیر کیا ہے۔ جس علاقے میں یہ بولیاں ملتی ہیں، وہ ایک عام اندازے کے مطابق مغرب میں سرہند کے میدانوں سے لے کر مشرق میں بنارس تک اور شمال میں ہمالیہ کی ترائی سے لے کر جنوب میں نربدا تک پھیلا ہوا ہے۔ ان بولیوں کا تعلق قدیم مدھیہ دیش اور قدیم شمالی اور جنوبی کوسالہ (Kosala) سے ہے۔ یہ دو لسانی خاندانوں —— مغربی ہندی اور مشرقی

ہندی پر مشتمل ہیں۔ گویا ہندی نام مندرجہ ذیل تسلیم شدہ بولیوں کا احاطہ کرتا ہے:

بندیلی ، قنوجی ، برج بھاشا، بانگرو، ہندستانی (گریرسن) یا کھڑی بولی (روایت اور بھارتیندو ہریش چندر) یا دہلوی (شیخ باجن اور امیر خسرو) اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی بعض علما ان میں مزید آٹھ کا اضافہ کرتے ہیں۔ راجستھانی (پنڈت سوریہ کرن پاریک اور نروتم داس سوامی) میگھئی (راہل سانکیر تاین)۔ اس اعتبار سے ہندی شمالی ہند کی تمام بولیوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔

3۔ ہندی کا تیسرا استعمال بطور خاص اس جدید زبان کی ادبی شکل کے لیے ہوا ہے جسے ہندستانی، کھڑی بولی یا دہلوی کے نام سے جانا گیا۔ صوتیات اور ساختیات کے اعتبار سے جدید ہندی ان بولیوں سے مختلف اور نمایاں ہے جن کا ذکر مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کے زمرے میں کیا گیا اور یہ ہندی (استعمال۔ ا) یا اردو سے مشابہ ہے۔

ہندستانی

ہندی کے لیے (استعمال۔ ا) اردو کا نام پہلی بار غالباً مصحفی نے استعمال کیا۔ میر نے نکات الشعراء میں، جو 1752ء میں تصنیف کی گئی، اس کے لیے زبانِ اردوئے معلی استعمال کیا ہے۔ یہی نام قائم کی تصنیف "مخزن نکات" (1754ء) میں بھی ملتا ہے۔ دکن کے ایک شاعر باقر آگا نے اردو کی اصطلاح 1772ء میں استعمال کی۔ اسی طرح "تذکرۂ گلزار ابراہیم" کے مصنف عطا حسین تحسین (1797ء -1770ء) نے اسے "زبانِ اردوئے معلی" کہا ہے۔ میر امن نے اپنی کتاب باغ و بہار (مؤلفہ 1801ء) کی زبان اردو بتائی ہے۔ انیسویں صدی میں اس نام نے مقبولیت حاصل کر لی اور آج وہ اس زبان کی شناخت ہے جو ہندستانی، کھڑی بولی یا دہلوی کا ادبی روپ ہے۔ صوتیات اور ساختیات کے اعتبار سے یہ جدید ہندی سے ملتی جلتی ہے ان میں جو فرق ہے وہ ان الفاظ تک محدود ہے، جو دوسری زبانوں سے لیے گئے ہیں۔

وجہی (1635ء) کی تحریروں، فرشتہ کی ترتیب دی ہوئی تاریخ کی کتاب (1590ء) اور عبدالحمید لاہوری کی کتاب بادشاہ نامہ (1654ء) میں اسے "زبانِ ہندستان" کہا گیا ہے۔ گویا اس زبان کے نام سے سولہویں اور سترہویں صدی میں عام واقفیت تھی اور اسے ان یورپی سیاحوں نے بھی اخذ کیا جو اُس زمانے میں یہاں آئے تھے۔ ٹری (1616ء) اور فرایر (1673ء) نے اسے "انڈستان" کہا۔ لاماڈزی نے ایک فرہنگ کے مخطوطے کو (1704ء) "لینگوا انڈستانیکا" کہا ہے اور کیٹیلر نے 1715ء کے آس پاس "لنگوا ہندستانیکا" کے نام سے قواعد اور ذخیرۂ الفاظ کی پہلی کتاب لکھی۔ ہندستانی کی اصطلاح اٹھارہویں صدی میں عام ہوئی۔ 1801ء میں جب میر امّن نے باغ و بہار تصنیف کی تو انھوں نے دانستہ طور پر "ٹھیٹھ ہندستانی" زبان لکھنے کا بیڑہ اٹھایا۔ گلکرائسٹ نے اپنی کتابوں کے عنوانات میں ہندستانی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً "انگریزی۔ ہندستانی ڈکشنری" اور گارساں دتاسی نے پیرس میں جو اس زبان کی تاریخ پر خطبہ پیش کیا اس میں اس نے ہندوی اور ہندستانی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ کھڑی بولی کے لیے بھی ہندستانی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ بہت سے ادیبوں نے اسے اردو کے متبادل کے طور پر اور کچھ نے جدید ہندی کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسے واضح کرنے کے لیے گریرسن کی وضع کردہ تعریف یہاں پیش کی جاتی ہے:

"ہندستانی بنیادی طور پر گنگا کے بالائی دوآبے کی زبان ہے اور اسے ہندستان میں لینگوا فرینکا کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اسے فارسی اور دیوناگری، دونوں رسم خط میں لکھا جا سکتا ہے اور سنسکرت اور فارسی الفاظ کی کثرت سے یکساں طور پر گریز کرتے ہوئے ادبی کاموں کے لیے اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس خاص قسم کی ہندستانی کو اردو نام دیا جا سکتا ہے جس میں فارسی کے الفاظ کثرت سے آتے ہیں۔۔۔ اسی طرح ہندی کا نام اُس محدود ہندستانی کو دیا جا سکتا ہے جس میں سنسکرت الفاظ کی بہتات ہوتی ہے"۔

گویا اردو اور ہندی کے لیے ہندستانی کا نام کوئی نیا نہیں ہے بلکہ ایک پرانا اور تسلیم

شدہ نام ہے اُس بولی کا جس کی دو مختلف شکلوں یعنی ہندی اور اردو کو یہ بنیاد فراہم کرتی ہے۔

نام کے سلسلے میں غلط تصور نے خود اس زبان کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ حتیٰ کہ زبان وادب کے ممتاز تاریخ داں حضرات بھی ہندی، اردو اور ہندستانی کی نشو و نما کے سلسلے میں غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے۔ یہ غلط فہمیاں یا تو مختلف اسالیب کے ادب سے لاعلمی کی بنا پر راہ پا گئیں یا پھر ہندی کی اصطلاح کے مندرجہ بالا تینوں معانی کے خلط ملط ہو جانے سے ایسا ہوا، خاص طور سے دوسرے اور تیسرے استعمال کے باعث۔ کچھ لوگ جب ہندی کے ارتقا کے بارے میں بات کرتے ہیں تو وہ اس حقیقت کو ذہن میں نہیں رکھ پاتے کہ ہندی کی تاریخ راجستھانی، برج بھاشا اور اودھی جیسی بولیوں کی تاریخ سے مختلف ہے۔ وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ ہندی اور اردو کی تاریخ میں بہت کچھ مشترک ہے۔

ہندستانی کی تاریخ

ہندستانی یا کھڑی بولی کی جس کا ارتقا جدید ہند آریائی بولیوں کی ایک شاخ سے ہوا، ایک مسلسل تاریخ ہے جو اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس نے مدھیہ دیش کی بولیوں سے اپنے آپ کو الگ کیا (یہ دسویں صدی کے آس پاس کا زمانہ تھا) جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ بنیادی بولی گنگا کے بالائی دوآبے اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے باشندوں کی بولی تھی اور اب بھی ہے۔ اسی عام بول چال کی زبان کو مسلمانوں نے اس وقت اختیار کیا جب بارھویں صدی کے اختتام پر وہ دلی اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہوئے۔ ان نئے لوگوں کی زبان سے کچھ نئی آوازیں نکلیں اور کھڑی بولی کے صوتی نظام میں داخل ہو گئیں جو کہ خالص ہند آریائی زبان تھی۔ کھڑی بولی کی ساخت میں ہلکی بلکہ غیر اہم سی تبدیلی بھی واقع ہوئی اور اس نے ان لفظوں کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا جو مسلم فاتحوں کی زبانوں سے اسے ملے تھے۔ یہی تبدیل شدہ زبان ادبی اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ امیر خسرؔو نے چودھویں صدی میں اسے استعمال کیا۔ لیکن چونکہ ان کے زمانے کا کوئی

دستاویزی ثبوت موجود نہیں ہے اس لیے یہ معاملہ شک سے خالی نہیں ہے۔ لیکن دکن میں یہ زبان نثر اور نظم دونوں کا وسیلہ بنی لہٰذا یہاں چودہویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران شاندار ادب وجود میں آگیا۔ اس زبان میں جو ادب تخلیق ہوا وہ تدبھو (دیسی الفاظ) سے بھرا ہوا ہے اور غیر ملکی عناصر سے بوجھل نہیں ہے۔ دکن کے اہلِ قلم بجا طور پر اپنے آپ کو ہندی کا ادیب تصور کرتے تھے۔ یہ وہ نام تھا جسے انھوں نے اس زبان کے لیے استعمال کیا جس میں وہ نثر و نظم تخلیق کرتے تھے۔

شمالی ہند کی صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ اگرچہ کھڑی بولی یا ہندستانی شمال کی زبان تھی لیکن ادبی زبان کے طور پر بطور خاص دکن میں اس کا ارتقا ہوا۔ شمالی ہند میں مشکل ہی سے کوئی آزاد ادبی کارنامہ ایسا ہوگا جو اس زبان میں سترہویں صدی سے قبل وجود میں آیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب کھڑی بولی تیرہویں صدی میں ایک شائستہ اور ادبی زبان کے طور پر ابھری تو اسے راجستھانی کی رقابت کا سامنا کرنا پڑا جو اس زمانے میں شمالی ہند کی مقبول ادبی زبان تھی۔ یہ وہ زبان تھی جس میں جتن جینا ادب لکھا گیا اور اسی زبان میں نرپتی نالہا اور دوسرے شاعروں نے اپنی رزمیہ اور دوسری نظمیں تخلیق کیں۔

پندرہویں صدی میں بھکتی تحریک کا عروج ہوا اور اس کے زیر اثر تین حلقے قائم ہوئے "نراکار بھکتی" "کرشن بھکتی" اور "رام بھکتی"۔ پہلے مکتبِ خیال کے سنت مثلاً کبیر، نانک اور دادو نے اپنے عقیدے کے پرچار کے لیے دوسری بولیوں کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی اور ہندستانی کا بھی استعمال کیا۔ دوسرے مکتبِ خیال کے بھکتوں نے جن میں سورداس اور نند داس وغیرہ شامل ہیں اپنے بھجنوں اور گیتوں میں برج بھاشا کا استعمال بطورِ خاص کیا۔ تیسرے مکتبِ خیال کے رہنما گوسوامی تلسی داس تھے جنھوں نے اپنی تخلیق کے لیے اودھی کا استعمال کیا۔

پندرہویں صدی اور اس کے بعد ادب کے جو سوتے پھوٹے ان کا بہاؤ دو مختلف سمتوں کی جانب رہا۔ یعنی برج بھاشا اور اودھی کی طرف۔ انھیں صرف ہندو شاعروں نے ہی

نہیں استعمال کیا بلکہ مسلمان شاعروں نے بھی اپنایا۔ رحیم، رس کھان، اور رسلین برج بھاشا کی ادبی تاریخ میں اتناہی اہم مقام رکھتے ہیں جتنا ہندو شعرا۔ اور یہ بات تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ اودھی میں اگر ملک محمد جائسی کا بنیادی ادبی کارنامہ سامنے نہ آیا ہوتا تو اس زبان میں رام چرت مانس جیسی شاندار تخلیق کبھی وجود میں نہ آتی۔

کھڑی بولی

اس زمانے میں جدید ہندی یا سنسکرت آمیز ہندستانی کا وجود برائے نام تھا۔ کھڑی بولی بلاشبہ بول چال کی زبان تھی لیکن جہاں تک ادبی کارناموں کا تعلق ہے ہندی (فارسی آمیز ہندستانی) برج بھاشا اور اودھی کا چاروں طرف بول بالا تھااور یہ صورت حال اٹھارھویں صدی کے اختتام تک باقی رہی۔ حالیہ دنوں میں ہندی کے کچھ ادیبوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اٹھارہویں صدی سے قبل کی صدیوں میں جدید ہندی میں ادب موجود تھا لیکن ان کی یہ کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی نظر نہیں آتیں۔ 16 صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ "چند چھند برنن کی مہی ما" کو، جس کے مصنف گنگا بھٹ ہیں، سولہویں صدی کا جدید ہندی کا پہلا نمونہ بتایا جاتا ہے اور اس کے لمبے عرصے کے بعد سترہویں صدی میں جاٹ مل کی تصنیف آتی ہے "گورے بادل کی بات" لیکن پہلی تصنیف کی زبان ملی جلی ہے جس میں برج بھاشا اور کھڑی بولی شامل ہیں۔ اور دوسری کے بارے میں یہ ثبوت ملا ہے کہ اس کا تعلق انیسویں صدی سے ہے۔ یہ اصلاً راجستھانی نظم ہے جسے نثر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی کی دو یا تین تصنیفات اور ہیں۔ ان میں "من دوار کا ورنن" چاہتا کی "پت دیاہی کی پرمپرا" شامل ہیں جن میں کھڑی بولی کا استعمال ہوا ہے لیکن اگر ان کا موازنہ اس زمانے کی ہندی (فارسی آمیز ہندستانی) برج اور اودھی کے نثری ادب سے کیا جائے تو انھیں مشکل سے ادبی قدر و قیمت کی چیز کہا جائے گا۔

ان صدیوں کے پورے عرصے میں ہندی (فارسی آمیز ہندستانی) ہی ہندستان کی

لینگوا فرینکا اور شائستہ سماج (ہندو مسلمان دونوں) کی زبان تھی، جدید ہندی (سنسکرت آمیز ہندستانی) نہیں۔ 1871ء میں آگرہ بھار تیندہریش چندر نے اگروال فرقے سے متعلق اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا "اگروال گھرانوں کے تمام مرد عورتوں کی زبان کھڑی بولی یا اردو ہے۔" (ان کی بولی، استری اور پُورش سب کی کھڑی بولی اتھوا اردو ہے) اگروال فرقے کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہی شمالی ہند کے دوسرے فرقوں کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔

دراصل جدید ہندی (سنسکرت آمیز ہندستانی) نے اپنی زندگی کی شروعات انیسویں صدی کے آغاز سے کی۔ منشی سدا سکھ لال نیاز نے، جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد الہ آباد میں بودوباش اختیار کرلی تھی، سری مد بھگوت کا آزاد ترجمہ "سکھ ساگر" کے نام سے کیا تھا۔ قریب قریب اسی زمانے میں انشاءاللہ خاں نے "رانی کیتکی" کی کہانی لکھی۔ اس کے بعد سادل مصر اور للو لال کو ڈاکٹر گلکرائسٹ اور فورٹ ولیم کالج کے پروفیسروں نے ہدایت کی کہ وہ ہندوؤں کے لیے ایک ادبی ذریعہ اظہار وضع کریں جو ہندی (فارسی آمیز ہندستانی) کی جگہ لے سکے۔ مسٹر ایف ایف کے (F.F.Keay) نے "ہیریٹیج آف انڈیا" سلسلے کے تحت اپنی کتاب 'تاریخ ادب ہندی' میں کہا ہے کہ "اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا بڑا حصہ عربی اور فارسی کے الفاظ پر مشتمل تھا جن کا خاص تعلق مسلمانیت سے تھا۔ ہندی بولنے والوں کے لیے ایک ایسی ادبی زبان کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس کا جھکاؤ ہندوؤں کی طرف زیادہ ہو۔ لہٰذا اس کے لیے اردو کا انتخاب کیا گیا اور اس میں سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے گئے۔ اور ان کی جگہ سنسکرت یا اصلی ہندی کے الفاظ شامل کر لیے گئے"۔ انھوں نے مزید کہا "للو لال کی ہندی دراصل ایک نیا ہندی اسلوب تھا۔" پنڈت چندر دھر شرما گلیری نے 1921ء (سمبت 1978) میں ناگری پرچارنی پتریکا میں قدیم ہندی پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا وہ کہتے ہیں۔ "میرے کہنے کا تات پریہ یہ تھا کہ ہندوؤں کی رچی ہوئی پرانی کویتا جو ملتی ہے، وہ

برج بھاشایا پوربی، بیسوری، اودھی، راجستھانی، گجراتی آدی ہی میں ملتی ہے۔ ارتھات کھڑی بولی میں پائی جاتی ہے۔ کھڑی بولی یا پکی بولی یا ریختہ یا ورتمان ہندی کا آرمبھ کل کے گدیہ اور پدیہ کو دیکھ کر یہی جان پڑتا ہے کہ اردو یا ریختہ میں فارسی عربی تتسم اور تدبھو کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تتسم یا تدبھو رکھنے سے ہندی بنالی گئی ہے۔" مسٹر جولس بلوش مصنف "La For-mation de la langue Marathe"۔ کے (Keay) اور گلیری کے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق "للو لال نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کے آشیرواد سے اپنی مشہور کتاب پریم ساگر لکھ کر سب کچھ بدل دیا۔ اس کا نثری حصہ سب کا سب اردو ہے جس کے تمام فارسی الفاظ نکال کر وہاں ہند آریائی الفاظ رکھ دیے گئے ہیں۔ اس نئی بولی نے ہندوؤں کو ایک لینگوا فرینکا دی۔"

ہندی کی 135 سال کی تاریخ

کچھ جدید ہندی ادیبوں نے جدید ہندی سے متعلق اس طرح کے بیان پر احتجاج کیا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ان کے احتجاج میں کوئی دم نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جدید ہندی (سنسکرت آمیز ہندستانی) کی نشوونما کا غیر جذباتی انداز سے اگر مطالعہ کیا جائے تو ایک ہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ یعنی اس زبان کی عمر صرف 135 سال ہے بلکہ اتنی بھی نہیں۔ کیونکہ سادل مصرا اور للو لال نے جدید ہندی کی صبح صادق کی بشارت تو دی لیکن یہ صبح بھی صادق ثابت نہ ہوئی کیونکہ ہندی پر اندھیرا چھا گیا جو 1857ء کے بعد ہی دور ہو سکا جب راجہ شیو پرساد، راجہ لکشمن سنگھ، بابو ہریش چندر اور دوسروں نے اسے ہمیشہ کے لیے دور کرنے کا کام انجام دیا، اور تب کہیں جا کر جدید ہندی ادب کی صبح نمودار ہوئی۔

غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کروں گا جن کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ہماری زبان کا سائنسی ذہن رکھنے والا ہر طالب علم تائید کرے گا۔

1۔ جدید ہند آریائی زبانوں کے گروپ کی ایک مشرقی رکن میتھلی کے ادب کا سراغ

اٹھارہویں صدی سے ہی ملتا ہے جیسا کہ راہل سنکریتائن نے ثابت کیا ہے۔

2۔اسی گروپ کی ایک مغربی بولی راجستھانی کے پاس بارہویں سے انیسویں صدی تک ادب کا بہت بڑا سرمایہ موجود تھا لیکن اب یہ ادبی زبان کے طور پر باقی نہیں رہی۔

3۔اسی گروپ کی مغربی شاخ کی ایک اور بولی برج بھاشا نے ایک ادبی زبان کے طور پر پندرہویں سے انیسویں صدی تک خوب ترقی کی۔جدید ہندی کے فروغ کے ساتھ اس کی نثر زوال کا شکار ہو گئی اور اب اس کی شاعری کا سورج بھی رفتہ رفتہ غروب ہو رہا ہے۔

4۔مشرقی شاخ کی بولی اودھی پندرہویں صدی میں منظر عام پر آئی لیکن اسے برج بھاشا جیسی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔اب اسے ادبی زبان نہیں تصور کیا جاتا۔

5۔مغربی اور مشرقی ہندی کی دوسری بولیاں چودھویں سے انیسویں صدی تک ادبی اظہار کا ذریعہ بنی رہیں لیکن اب ان کی وہ حیثیت باقی نہیں۔

6۔کھڑی بولی یا ہندستانی کے دو ادبی روپ ہیں۔اسے استعمال کرنے والے پہلے اسے ہندی کہتے تھے اور اب اسے اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کی تاریخ چودھویں صدی سے شروع ہوئی اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔دوسری شکل، جسے جدید ہندی کے نام سے جانا جاتا ہے،ادبی مقاصد کے لیے انیسویں صدی کے آغاز سے استعمال ہونے لگی اور 1857ء کی بغاوت کے بعد اس نے تیزی سے ترقی کی ہے۔

ہندی اُردو اور ہندستانی

ہندی ،اردو اور ہندستانی کے رشتوں کے تعلق سے غلط تصورات کا ایک تیسرا سلسلہ بھی ہے۔اب تو کسی کو اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تینوں نام ایک ہی زبان کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔زبانوں کے رشتوں کے تعین کے لیے تین سطحوں پر تقابلی مطالعہ کرنا ضروری ہے۔(1)صوتی نظام(2)شکل یا ہیئت کا نظام(3)ذخیرۂ الفاظ۔ لیکن تینوں میں سے پہلے دو بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جبکہ تیسرے کی اہمیت محض ثانوی

ہوتی ہے۔لسانیات کے تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ زبان کی قواعد کا ڈھانچہ اس کا سب سے مستحکم حصہ ہوتا ہے اور زبان میں ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کے باوجود وہ نسل در نسل یونہی برقرار رہتا ہے۔صوتی نظام اگرچہ ہیئت کے مقابلے میں کم مستحکم ہوتا ہے لیکن کچھ چیزیں ناقابلِ تبدیل ہوتی ہیں۔لیکن جہاں تک زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے "لذتِ تجدید" سے کس طور پر آشنا کرلیا جاتا ہے۔علم لسانیات کے اس وقت کے سب سے بڑے ماہرین میں سے ایک اے میلیٹ کا کہنا ہے کہ "تلفظ اور قواعد ایک مقررہ نظام ترتیب دیتے ہیں۔اس نظام کے تمام حصے آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔صوتی اور ہیئتی نظام الفاظ مستعار لینے کا کام کم ہی نپٹاتے ہیں۔الفاظ کوئی نظام نہیں ترتیب دیتے۔زیادہ سے زیادہ وہ چھوٹے چھوٹے حلقے بناتے ہیں۔گویا ہر لفظ الگ الگ ارتقاپذیر ہوتا ہے۔۔۔جو چیز زبان کے رشتوں کا پتہ دیتی ہے وہ تمام باتوں سے قطع نظر تلفظ اور قواعد سے سروکار رکھتی ہے"۔

اس طرح اگرچہ فارسی میں عربی کے بہت سے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ آریائی گروپ کی زبان ہے۔انگریزی ٹیوٹانی (جرمن خاندان کی) زبان ہے اس کے باوجود کہ اس میں لاطینی عناصر کی بھرمار ہے۔پھر اسلوب کی سطح پر بھی اختلاف موجود ہیں۔کچھ لوگوں کا جھکاؤ اینگلو سیکسن (خالص) لفظیات کی طرف ہے اور کچھ لوگ جانسن طرز کے قائل ہیں۔لیکن اختلاف کے یہ معنی نہیں کہ ان دونوں اسلوبوں کو الگ الگ زبان مان لیا جائے۔خود اپنے وطن میں ہم دیکھیں تو سندھی اور پنجابی زبانیں انھی اصولوں کی مظہر دکھائی دیتی ہیں۔انھوں نے فارسی اور عربی سے بے شمار الفاظ اخذ کیے ہیں لیکن ان کی صوتیات اور قواعد بنیادی طور پر ہند آریائی ہی رہی۔کسی بھی زبان کا ذخیرۂ الفاظ تاریخ کے پیچ وخم سے بھی متاثر ہوتا ہے۔جس کی تازہ ترین مثال جنگِ عظیم پیش کرتی ہے۔انگلستان کے اعلیٰ طبقے میں جرمن نام ترک کرنے کا سلسلہ چل پڑا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ "ہاؤس آف آنوور (House of Honover) بدل کر (House of Windsor) ہوگیا۔فرانسیسی زبان نے 'جو غیر ملکی

الفاظ اخذ کرنے کے معاملے میں خاصی سخت گیر ہے،انگریزی الفاظ کے لیے اپنی بانہیں پھیلادیں۔اور "جینٹل مین" اور "اسپورٹس" جیسے الفاظ قبول کر لیے گئے۔روسیوں نے اپنے شہروں کے ناموں سے جرمن لاحقے برا(burg) کو خارج کر کے اس کی جگہ grad لگانا شروع کر دیا اور اس طرح سینٹ پیٹرس براپیٹروگراڈ ہو گیا اور پھر جب پیٹرس خاندان کی قسمت کا ستارہ گردش میں آیا تو پیٹرس برا لینن گراڈ میں تبدیل ہو گیا۔ غرضیکہ تاریخی واقعات قومی ترجیحات پر اثرانداز ہوتے ہیں نیز یہ کہ دوسرے عوامل بھی ذخیرۂ الفاظ پر لگاتار اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ ہندی اردو اور ہندستانی کا صوتی نظام ایک جیسا ہے تینوں کے پاس تین درجوں کی آوازوں کی ایک ہی تعداد ہے۔ یعنی قدیم ہند آریائی حروفِ علت اور حروفِ صحیحہ 'اور جدید ہند آریائی حروفِ علت اور حروفِ صحیحہ اور سامی آوازیں۔ ماہرینِ قواعد اسے تسلیم بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو حسد کے جذبے کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً پنڈت کامتا پرساد گرو نے اپنی "ہندی دیاکرن" دھیریندر ورمانے "ہندی بھاشا کا اتہاس" اور مولوی عبدالحق نے "قواعد اردو" میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے صوتی نظام تو ہندی، اردو اور ہندستانی کو ایک جیسا سمجھتا ہے لیکن دوسری آریائی اور سامی زبانوں مثلاً سنسکرت، برج بھاشا، اودھی، فارسی اور عربی سے امتیاز برتتا ہے۔

پھر ان تینوں کی قواعد بھی کم وبیش ایک جیسی ہے "اردو اور ہندی میں تصریف یا فعل کی گردان کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" (گریرسن) جون بمس کی رائے میں۔ "اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں ماننا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اس مسئلے کے پورے پہلو اور زبان کے فلسفے کی پوری حقیقت کے بارے میں زبردست غلط فہمی راہ پاگئی ہے۔" (جدید آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد)

ذخیرۂ الفاظ سے زبان کی شناخت مکمل نہیں ہوتی۔ خزانۂ الفاظ اصلی یا دیسی بولی اور دوسری زبانوں سے اخذ کردہ الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ جہاں تک اردو اور ہندی کا سوال ہے

ان میں اول الذکر زمرے کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو مشترک ہیں مثلاً تمام افعال، ضمائر اور حروف ربط وغیرہ ایک ہی ہیں اور جہاں تک اسم اور صفت کا تعلق ہے مشترکہ دیسی اسما اور صفات کے علاوہ دونوں نے سنسکرت، پراکرت، فارسی اور عربی زبانوں سے استفادہ کیا ہے۔ ایسے الفاظ کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں ہے کیونکہ خالص سائنسی خطوط پر جامع قسم کی لغات موجود نہیں ہیں۔ فرہنگ آصفیہ کے مؤلف مولوی سیّد احمد دہلوی نے اپنے جمع کردہ الفاظ کا جائزہ لیا ہے۔ الفاظ کی مجموعی تعداد 50,000 ہے۔ ان میں سے عربی سے لیے گئے الفاظ کی تعداد 7586' فارسی الفاظ کی 6041' سنسکرت الفاظ کی 554، انگریزی الفاظ کی 500 اور دوسری زبانوں کے الفاظ کی تعداد 181 ہے باقی سب کے سب دیسی الفاظ ہیں۔ اگر ہم ہندی لغت "ہندی شبد ساگر" پر نظر ڈالیں جسے ناگری پرچارنی سبھا نے شائع کیا ہے تو پتہ چلے گا کہ عربی کے تمام 7586 اور فارسی کے تمام 6041 الفاظ کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک واضح ثبوت ہے کہ جہاں تک باہر سے لیے گئے الفاظ کا تعلق ہے، اردو اور ہندی کا فرق اتنا نہیں ہے جتنا کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک مرکب اور اخذ کردہ الفاظ کا تعلق ہے، دوسری زبانوں سے لیے گئے الفاظ کی ترکیب اور لاحقے وضع کرنے کا طریقہ قابل ذکر حد تک مشترک ہے جیسا کہ دونوں زبانوں کی قواعد کے ایک حوالے سے ظاہر ہوتا ہے۔

سنسکرت آمیز ہندی کے حق میں دلیل

ایک طرف جہاں اردو اور ہندی کے ذخیرۂ الفاظ میں پائی جانے والی مماثلت کا ذکر ضروری ہے، تو دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ان دونوں میں فرق بھی اچھا خاصا ہے اور اگر مناسب اقدام نہ کیے گئے تو یہ فرق بڑھتا ہی جائے گا۔ اردو اور ہندی کے ادیب دو مکتبِ خیال میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک حلقہ کلاسیکی زبانوں سے بڑے پیمانے پر الفاظ لینے کے حق میں ہے تو دوسرا ایسے الفاظ کی تعداد کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اپنے اپنے موقف

کے حق میں یہ دونوں ایک ہی طرح کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندی مکتب خیال کے ادیب سنسکرت تتسم کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے کے حق میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ فارسی آریائی الفاظ کو خارج کر دیا جائے۔ یہ حلقہ اس کا جواز یہ پیش کرتا ہے:

(الف) ہندی وہ ہند آریائی بولی ہے جو دوسری ہند آریائی زبانوں مثلاً بنگالی، گجراتی اور مراٹھی سے قریبی تعلق رکھتی ہے لہٰذا ان کے لیے قدرتی امر یہی ہوگا کہ وہ اپنی ایک ہی سرپرست زبان یعنی سنسکرت سے استفادہ کریں۔ جتنے زیادہ سنسکرت کے تتسم الفاظ استعمال کیے جائیں گے اتنی ہی زیادہ تکنیکی اصطلاحات کے تعلق سے اس کی جڑیں مضبوط ہوں گی اور یہ زبانیں ایک دوسرے کے قریب آئیں گی۔ اس طرح دوسری زبانوں کے لوگوں کے لیے ہندی سمجھنا اور اسے استعمال کرنا آسان ہوگا۔ اور ہندی کو یہ موقع ملے گا کہ وہ ہندستان کی بین صوبائی زبان بن سکے۔

(ب) الفاظ ایک تہذیبی فضا کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ سو سنسکرت الفاظ کی فضا قدیم ہندستانی تہذیب کی خوشبو سے معطر ہوتی ہے جبکہ فارسی الفاظ کی فضا اجنبی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہندستانی زبان میں فارسی کے مقابلے میں سنسکرت الفاظ کا ذخیرہ زیادہ توانا ہونا چاہیے۔

ان دلائل میں وزن ہے بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ یہ دل میں ایک طرح کا ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں لہٰذا اس موقف پر کافی احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

غور کرنے کے بعد

وہ لوگ جو عربی کے سرچشمے سے الفاظ مستعار لینے کے حق میں ہیں خواہ تکنیکی اصطلاحات ہوں یا دوسری نوعیت کی، ان کے دلائل بھی کچھ اسی طرح کے ہیں۔ ان کے مطابق عربی ایک عظیم فرقے کے مقدس صحیفے کی زبان ہے اور ایسی روایات کی امانت دار ہے جو اس فرقے کو بہت عزیز ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک جدید زندہ زبان ہے جو مغربی علوم کو تیزی سے اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ لہٰذا یہ جدید فکر کی مطلوبہ اصطلاحات کے

لیے ایک معقول وسیلہ فراہم کرتی ہے۔ مذہبی خیال کے لوگ ہندستان کے ہر خطے میں کافی وسیع پیمانے پر اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی صوتیات اور محاوروں سے عوام کا بہت بڑا حلقہ مانوس ہے۔ اس نے ہندستانی یا کھڑی بولی پر لگاتار اپنا اثر ڈالا ہے۔ ثبوت کے لیے صوتیات، نظام قواعد اور ذخیرۂ الفاظ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ماضی میں برج بھاشا کے سورداس اور اودھی کے تلسی داس جیسے عظیم شاعروں کو اپنی تخلیقات میں عربی کے الفاظ استعمال کرنے پر کوئی پشیمانی نہیں ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے ہزاروں الفاظ اس زبان کا حصہ بن چکے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت خود "ہندی شبد ساگر" ہے۔

کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان دلائل میں وزن نہیں ہے۔ لیکن دونوں فرقوں کے دلائل پر غور کرنے کے بعد اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک معتدل راستہ اختیار کرنا دانشمندی کی بات ہوگی تو کوئی اس کی مخالفت نہیں کرے گا۔ ہندستانی کو سنسکرت آمیز بنائے جانے کے خلاف نہ صرف جون بیمس اور جی اے گریرسن جیسے ممتاز یوروپی ماہر لسانیات نے بلکہ راجہ شیو پرساد، پنڈت بال کرشن بھٹ، پنڈت گردھر شرما، پنڈت پدم سنگھ شرما اور پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیائے جیسے ہندستانی اسکالروں نے بھی آواز بلند کی ہے۔ یہاں میں صرف پنڈت گردھر شرما کی رائے کا حوالہ دوں گا۔ وہ فرماتے ہیں:

"سنسکرت مئے بن کر آپ نے بنگال، مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار شیگھر کر لیا، کنتو وہ کیول شکشتوں کی بھاشا بن گئی۔ سروسادھارن اس کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ تو کیا لابھ ہوا؟ لابھ کیا بڑی ہانی ہو گئی۔ ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد ہی پرتھم لینے چاہئیں۔ پھر ان سے آوشیکتا پوری نہ ہو تب سنسکرت بھاشا کے سرل شبد لینے چاہئیں۔"

دوسری طرف سید علی بلگرامی، مولوی وحید الدین سلیم اور مولوی عبدالحق جیسے علما نے عربی نواز حلقے کو اعتدال پسندی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تکنیکی اصطلاحات وضع کرنے کے سلسلے میں مولوی وحید الدین نے اپنی کتاب "وضع اصطلاحات"

میں کہا ہے ــــ

"...... ہم کو اس دھوکے سے بچنا چاہیے اور ہندی زبان کے الفاظ و حروف سے جو ہماری زبان کی فطرت میں داخل ہیں ناک بھوں چڑھانا نہیں چاہیے۔ ہم جس طرح عربی فارسی سے اصطلاحات لیتے ہیں اسی طرح ہندی سے بھی بے تکلف وضع اصطلاحات میں کام لینا چاہیے"۔

بد قسمتی یہ رہی کہ یہ حلقے ایک دوسرے سے دور الگ الگ کام کرتے رہے جس کی وجہ سے ان کے مشوروں اور انتباہ پر کسی نے غور نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی اور اردو دونوں تیزی سے عالموں کی زبان بنتی جارہی ہیں جو عام لوگوں سے بہت دور ہیں۔ لوگ پڑوسیوں کے درمیان آپسی مفاہمت کے لیے آسان ذریعۂ اظہار فراہم کرنے کے بجائے ایسی رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں جس کے باعث وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے جارہے ہیں۔ ان زبانوں کی افادیت کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے اور ان کی مقبولیت گھٹ رہی ہے۔

"تہذیبی نسبت"

تہذیبی نسبت کی بحث کو بہت الجھا دیا گیا ہے۔ کلچر اقدار کا معاملہ ہوتا ہے جس میں روحانی، اخلاقی، سماجی اور جمالیاتی قدریں شامل ہیں یہ قدریں جزوی طور پر قدرت اور انسان کی کشمکش کی دین ہوتی ہیں اور مختلف حلقے ان کے توسط سے اپنی شناخت کو قائم رکھتے ہیں اور جزوی طور پر یہ اندرونی تضادات سے پیدا ہوتی ہیں جن کے تحت لوگ خود سے وحدت کا ایک راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ یہی طبعی اور نفسیاتی عوامل کلچر کا تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے پاس علاقائی کلچر (یعنی فرانسیسی، انگریزی، چینی یا فارسی کلچر) اور پھر طبقاتی کلچر بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً بورژوائی اور پرولتاری کلچر' اشرافیہ کا کلچر وغیرہ، ہندستانی کلچر کی بات بھی کی جاتی ہے۔ لیکن کیا اردو کلچر یا ہندی کلچر نام کی بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ اردو (فارسی آمیز ہندستانی) زبان ایک ایسا وسیلہ رہی ہے جو ماضی میں ہندو مذہب کی تبلیغ

واشاعت کا ذریعہ بنی۔ آج بھی وہ اس مقصد کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ اور جیسا کہ نظر آتا ہے مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اسی طرح ہندی (سنسکرت آمیز ہندستانی) نے مسلمانوں کی خدمت کی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ اگر چینی، فارسی، پشتو، جاپانی، اودھی، بنگالی اور ایسی بہت سی زبانیں، جن کا عربی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بن سکتی ہیں تو پھر ہندستانی میں اگر سنسکرت کے کچھ لفظ آجاتے ہیں تو یہ مذہب کی تباہی کا باعث کیونکر ثابت ہوں گے؟

ہندستانی کلچر دراصل ایک جدید کلچر کا ارتقا ہے جس کی اس عظیم خطۂ زمین پر آباد ہر فرقے کے لوگ آبیاری کر رہے ہیں۔ حق و صداقت کے اس کے جو آدرش ہیں، ان کی حیثیت ایک قومی حوالے کی ہے جس میں مختلف صوبوں، نسلوں اور ذاتوں کی خصوصیات جلوہ گر ہوئی ہیں۔ جن طبعی اور سماجی حالات میں یہ کلچر نمو پذیر ہو رہا ہے وہ ماضی کے حالات سے مختلف ہیں اور ہماری اندرونی اور بیرونی کشمکش کی نوعیت بھی اب وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ پرانی قدریں ہمارے درمیان چھان پھٹک کے عمل سے گزر رہی ہیں جنھیں نئی تفسیر و تشریح کی ضرورت ہے۔ یہی وہ بیداری ہے جو مشترکہ کلچر کے تعلق سے ابھر رہی ہے اور یہی ہمیں زیادہ توانائی عطا کرے گی۔ ہندستان کی ادبی تخلیقات خواہ وہ تامل، تیلگو، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی میں جلوہ گر ہوں یا ہندستانی میں، اسی مشترکہ کلچر کے تصور سے فیضان حاصل کریں گی۔

ہمیں ہندی اور اردو کے تہذیبی ماحول کے فرق پر اتنا شور شرابہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کے برعکس ہمیں اس پالیسی کے عملی نتائج پر غور کرنا چاہیے جس کے تحت ہمارے اصطلاح ساز مندرجہ ذیل قسم کی اصطلاحات وضع کرتے ہیں۔

انگریزی (1)Abscissa (2)Absolute Term (3)Accelerate (4)Algebra (5)Alternando (6)Antecedent

ہندی- (1)بھُج (2)پرم پد (3)گتی وردھی کرنا (4)بیج گنت (5)ایکانتر نش (6)پورو پد

اردو۔ (1) فصلہ یا مقطوعہ (2) رقم مطلق (3) اسراع حرکت (4) جبر و مقابلہ (5) تبدیل (6) مقدم وغیرہ

عملی دشواریاں

ان اصطلاحات کو میں نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس اور انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی جانب سے جاری کردہ تکنیکی اصطلاحات کی فرہنگوں سے لیا ہے۔ یہ ان اصطلاحات کے نمونے ہیں جو الجبرا میں استعمال ہو رہی ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستانی کے دونوں حلقوں میں جو اصطلاحات وضع کی جارہی ہیں ان کی وجہ سے فاصلہ کتنا بڑھتا جارہا ہے۔ جب تک ہندستانی طلبہ کو انگریزی کے ذریعے تعلیم دی جائے گی تب تک تو یہ فرق نہیں پڑتا کہ ہندستانی زبان میں ایک ہی چیز کے لیے دو دو اصطلاحیں ہیں یا صرف ایک۔ لیکن اب جبکہ ثانوی سطح کی تعلیم کا انتظام ہماری اپنی زبانوں میں ہو رہا ہے اور ہم اس جانب بڑھ رہے ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم بھی اپنی زبانوں میں دی جائے گی تو دو اصطلاحوں کی موجودگی اہم مسئلہ بن سکتی ہے خاص طور سے بنگال سے باہر شمالی ہند کے ان علاقوں میں جہاں ہندی اور اردو کے پرستار مل جل کر رہتے ہیں۔ اگر طلبہ کے لیے اردو اور ہندی سمجھنا مشکل ہو جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسکولوں میں دوہری تعلیم کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اس کی وجہ سے یا تو کارکردگی میں خامی پیدا ہوگی یا پھر اخراجات بہت بڑھ جائیں گے۔ یونیورسٹی سطح پر تو یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جائے گی اور تعلیم تحقیق اور علم کے پھیلاؤ کی راہ میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ کیا ہمیں ہر یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کے لیے الگ الگ اساتذہ بحال کرنا پڑیں گے!

پھر حکومت اور قانون سازیہ کی زبان کیا ہوگی؟ آج پنجاب میں لوگ اس مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ کچھ دن بعد ہی یوپی اور بہار میں بھی یہ مسئلہ زیر غور آئے گا اور آخر میں

دلی اس سوال میں الجھے گی۔ پھر عوامی تفریح اور ابلاغ کے ذرائع مثلاً ریڈیو، سنیما اور تھیٹر وغیرہ کا بھی مسئلہ ہوگا اور یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ بین صوبائی تجارت اور رابطوں کا کیا بنے گا؟ انگریزی کی جگہ کون سی ہندستانی زبان لے گی؟ کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ مستقبل میں انگریزی ہمارے ان تمام مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی۔

مجھے یہ صورت حال بڑی افسوسناک نظر آتی ہے کہ محض دوسری زبانوں سے اخذ کیے جانے والے الفاظ کے سوال پر ہم ایک ہی زبان کے دو روپ کو ایک دوسرے سے بہت دور لے جا رہے ہیں اور تعلیمی نیز انتظامی معاملات کا حل تلاش کرنے کی بجائے اس کام کو مزید دشوار اور پیچیدہ بناتے جا رہے ہیں۔

ہندستانی کے حق میں

ہندستانی جیسا کہ میں نے اوپر بتانے کی کوشش کی ہے کوئی مصنوعی زبان نہیں ہے۔ ایک نمایاں زبان کے طور پر کوئی ایک ہزار سال سے اس کا وجود قائم ہے۔ اس کا ادب قابل ذکر ہے کیونکہ میں دکن کے تقریباً تمام تر ادبی سرمائے کو ہندستانی کا حصہ تصور کرتا ہوں، خواہ وہ نثر ہو یا نظم۔ شمالی ہند میں غیر ممالک کی نقالی کرنے والوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو آسان اور عام فہم زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی مثال کسی بھی زمانے کے دواوین سے مل سکتی ہے۔ حالی کی "مناجات بیوہ" اور "برکھا رت" اسی خوبصورت اردو کے نمونے ہیں جو جذبات اور طرز اظہار دونوں اعتبار سے پورے طور پر ہندستانی ہیں۔ جدید ہندی نے بھی ایسی کچھ مثالیں پیش کی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستانی کیسی ہونی چاہیے۔ میں یہاں صرف ایک مصنف کا نام پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ لیکن وہ مصنف ایسا ہے جس کا جدید ہندی ادب میں بطور تخلیقی فنکار کوئی ثانی نہیں۔ میری مراد پریم چند سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک ادبی تخلیقات کا سوال ہے جدید ہندی اور اردو ہندستانی کے محض دو اسلوب ہیں۔ سائنسی رسالوں کا جہاں تک معاملہ

ہے ان کا فرق بھی باہر سے اخذ کیے گئے الفاظ تک محدود ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر قوتِ ارادی ہو تو اس فرق کو دور کرنا ناممکن کام نہیں ہے۔ یہ ایک پسندیدہ کام ہوگا اور میں ذاتی طور پر اس کا پورے طور پر قائل ہوں اور میں ان لوگوں کے سامنے جو اس خلیج کو پاٹنا چاہتے ہیں کچھ تجاویز پیش کروں گا تاکہ وہ ان پر غور کریں۔

(1) ایسے اقدام کیے جانے چاہئیں جن کے تحت اردو والوں کی جدید ہندی کا مطالعہ کرنے اور ہندی والوں کی جدید اردو کا مطالعہ کرنے کی حوصلہ افزائی ہو۔

(2) ایسے الفاظ کی ایک فرہنگ مرتب کی جانی چاہیے جنھیں ہندی اور اردو کے ادیب و شاعر استعمال کرتے ہیں۔

(3) جدید خطوط پر ایک قواعد ترتیب دی جائے جس میں ہندی اور اردو کے صوتی اور ہیئتی نظام کا تجزیہ پیش کیا جائے اور لچکدار رویّے کے ساتھ تراکیب اور اخذ شدہ الفاظ کی شکل متعین کرنے کے اصول بتائے جائیں۔

(4) ہندی اور اردو مصنّفین کے استعمال کے لیے تکنیکی اصطلاحات کی ایک فرہنگ ترتیب دی جائے۔

(5) مترجمین کے لیے ایک انگلش۔ہندستانی ڈکشنری تیار کرائی جائے۔

(6) نظم ونثر کا ایک ایسا انتخاب شائع کیا جائے جس میں ہندی اور اردو کے ایسے ادب پاروں کو شامل کیا جائے جو آسان زبان میں لکھے گئے ہوں۔

ان تجاویز میں کچھ تو ایسی ہیں جن پر انفرادی طور پر عمل کیا جاسکتا ہے یا پھر بعض ادارے اپنی خدمات پیش کر سکتے ہیں لیکن بعض تجاویز ایسی ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے میں حکومت کی مدد درکار ہوگی۔ مثال کے طور پر اردو اور ہندی کے مطالعے کو فروغ دینے کے لیے اسکولوں میں محکمۂ تعلیم ہی کوئی بندوبست کر سکتا ہے۔ پھر تکنیکی اصطلاحات کی ڈکشنری بھی اس وقت تک ترتیب نہیں دی جا سکتی جب تک ان علاقوں کے اردو اور ہندی اسکالروں کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہو جاتا جہاں یہ زبانیں استعمال کی جاتی ہیں۔ چونکہ

اس سوال کا تعلق متعدد صوبوں اور علاقوں کی تعلیمی ترقی سے ہے لہٰذا ان صوبوں کی حکومتوں کی مدد کے بغیر کامیابی سے اس مسئلے سے نہیں نمٹا جا سکتا۔ لیکن اس سوال سے جو عملی معاملات جڑے ہوئے ہیں وہ اتنے اہم ہیں کہ حکومت کے لیے اس میں دلچسپی لینے کا جواز موجود ہے۔ فرانس جیسی کسی اکادمی کی عدم موجودگی میں حکومت، یونیورسٹیوں اور ادبی اور سائنسی اداروں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جا سکتی ہے جو مشترکہ تکنیکی اصطلاحات کے مسئلے پر غور کر سکے اور اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کوئی حل پیش کر سکے۔ سائنسی اور تکنیکی مقاصد کے لیے مطلوبہ الفاظ کے سوال پر کسی طرح کا اتفاق رائے پیدا ہو جاتا ہے تو اردو اور ہندی کے درمیان جو جھگڑے کی جڑ ہے وہ دور ہو سکتی ہے، ایک ہی علاقے میں دو زبانوں کا وجود جن مشکلات کا باعث بن رہا ہے وہ آسان ہو جائیں گی اور تب ہندی اور اردو ادب اور بول چال کی سطح پر ایک دوسرے میں ضم ہونے لگیں گی۔

☆☆☆

آصف علی

ابھی حال تک اردو کو ہندستان کی "لنگوا فرینکا" کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگ اسے "ہندستانی" کہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن "نام میں کیا رکھا ہے؟" یہ لاکھوں ہندستانیوں کی زبان ہے۔ اگر یہ سب سے اہم نہیں تو کم از کم ہندستان میں بولی جانے والی اہم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ لیکن اردو صرف ایک زبان ہی کا نام نہیں ہے جو ادبی تخیلات اور شاعرانہ تصورات سے مالا مال ہے اور ایک جدید زبان کے طور پر تیزی سے ترقی کر رہی ہے بلکہ یہ ایک خاص قسم کی تہذیب کی علامت اور ایک کلچر کی مظہر ہے۔

پہلے اس کے نام کے بارے میں گفتگو کر لی جائے۔ جو لوگ "ہندستانی" نام کو ترجیح دیتے ہیں وہ اس زبان پر کسی طرح کا اعتراض نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اس کا نام اردو نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا اس بات پر اصرار ہے کہ اسے ممکنہ حد تک عربی اور فارسی کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہیے' کچھ حلقوں میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ افعال اور مروّجہ محاوروں کو متاثر کیے بغیر جس حد تک فارسی اور عربی کے الفاظ کو آسانی سے اس میں جذب کیا جا سکتا ہے، اس حد تک ان زبانوں سے الفاظ لیے جانے چاہئیں۔ لیکن جو لوگ ہندی کی وکالت کرتے ہیں ان کا موقف مختلف ہے۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اردو کو عربی اور فارسی کے ان تمام عناصر سے پاک کیا جائے جن کے باعث آج یہ اپنی موجودہ شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بعد اس میں سنسکرت الفاظ و عناصر داخل کیے جائیں اور پھر آخری مرحلہ یہ ہوگا کہ اس کے موجودہ فارسی رسم خط کو ترک کر کے دیوناگری یا پھر سنسکرت رسم خط کی کسی تبدیل شدہ شکل کو اپنا لیا جائے گا۔ اس کے پیچھے یہ منطق کار فرما ہے کہ یہ ایک ایسا رسم خط ہے جس کی مختلف تبدیل شدہ شکلیں بیشتر ہندستانی زبانوں کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

اس تنازعے نے قریب قریب سیاسی اور فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا ہے۔

ہمارے مقصد کا جہاں تک تعلق ہے یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ اردو ہندی نہیں ہے اور یہ کہ لفظ ہندستانی کو آج کل آسان اردو کے لیے ایک متبادل نام کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

اردو ایک مخصوص کلچر کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کئی طرح کی ایشیائی تہذیبوں کے اثرات سے نمو پذیر ہونے والی ایک تہذیب کی عکاس ہے۔ یہ وہ نقطۂ اتصال ہے جہاں آریائی، یونانی، تاتاری، عربی اور عجمی تہذیبیں آپس میں ملتی ہیں۔ اردو کی پرورش انہی تہذیبوں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ہے اگرچہ اس کو اصل طاقت ہندستان کی مٹی سے ملی ہے۔ کئی آزاد چشموں کی طرح یونانی، عربی، عجمی، ساسانی، دراوڑی، آریائی تہذیبیں، تہذیب کے اس خاص دھارے میں آکر مل گئیں جس کی انتہائی بلندی مگدھ میں نظر آئی اور بالآخر اس نے ایک ایسی راہ اختیار کرلی جسے اردو کا نام دیا گیا۔ متعدد رنگا رنگ تہذیبوں کے امتزاج اور یہاں کی عوامی زندگی پر پڑنے والے ناگزیر قسم کے غیر ملکی اثرات نے ایک ایسے مخصوص کلچر کی آبیاری کی جو اردو کے نام سے ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ اردو ہمیں تہذیبی تعمیر کی بنیاد کے قریب لے آئی ہے جہاں ہم زینہ بہ زینہ اپنے تخیلات کی ایک نئی عمارت کھڑی کرسکتے ہیں۔ ہمیں یہاں ناگزیر طور پر بیک وقت ردّ و قبول کے ساتھ ساتھ تجزیے اور تعمیر کے عمل سے گذرنا ہوگا۔

لفظ "اردو" ترکی سے آیا ہے جس کے معنی فوج یا لشکر کے ہیں۔ اس زبان کے آغاز کا یہاں ہمیں ایک براہ راست ثبوت ملتا ہے۔ بہت پہلے، شاید جب پہلی بار ہندستان میں ترکمانوں کے قدم مستقل طور پر جمے تو بڑی تعداد میں جو فوجی تھے اور جن میں غیر ملکی اور ان کے ہندستانی ہمنوا بھی شامل تھے' انھوں نے غیر ارادی طور پر اسے "زبان اردو" یعنی فوجی خیمے کی زبان کہنا شروع کردیا اور اس کے پیچھے وہ عوامل کارفرما رہے ہوں گے جو حالات کی دین تھے۔ یعنی سپاہی اور مقامی تاجر اور دوسرے لوگ روزمرہ کی تجارتی سرگرمیوں میں ظاہر ہے شریک ہوتے رہے ہوں گے۔ سماجی سطح پر میل جول بڑھا ہوگا۔ اس طرح یہ زبان قدرتی طور پر آپس میں اظہار خیال کا وسیلہ بنی ہوگی جس کے توسط سے وہ ایک دوسرے کے

قریب آئے اور ان کے طرز زندگی کا مشاہدہ کیا۔ گویا اس طور پر نہ صرف ایک زبان وجود میں آنے لگی بلکہ مخصوص طرز کی ایک تہذیب کا ڈھانچہ بھی مرتب ہوا۔ اس میں ان کے آپسی میل جول اور پائیدار نوعیت کے سماجی رابطوں کی آئینہ داری ہوئی اور ایک مشترکہ زبان کے ساتھ ساتھ مشترکہ کلچر بھی وجود میں آیا۔ کچھ اہم اور مبارک دن ایسے ہوتے ہیں جب لافانی دوستی اور بھائی چارے کے ایسے معاہدوں پر دستخط ہوتے ہیں اور مہر تصدیق ثبت کی جاتی ہے جن کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ہوتا۔ وہ دن بھی آئے اور گذر گئے۔ ان کا کوئی ریکارڈ نہیں مرتب کیا گیا لیکن یہ وہ قیمتی اور خوشگوار دن تھے جو آنے والی انگنت نسلوں کے لیے لازوال ورثہ چھوڑ گئے۔ یہ ورثہ مشترکہ منزل، مشترکہ سماج اور اس کی امنگوں کا ورثہ تھا۔ وہ جو اردو زبان بولتے تھے اور وہ جو اسے سمجھتے تھے۔ انھیں ان کے آبا و اجداد نے ایک ایسی لڑی میں پرو دیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔ قوموں کی تاریخ کی تقویم میں کچھ بڑے خوشگوار دن بھی ہوتے ہیں لیکن یہاں کوئی دن ایسا نہیں ہے جو اس زبان کی پیدائش کا جشن منائے جسے ہم بولتے ہیں۔

ہندستان میں جب غیر ملکی حملہ آور آئے، بہت قدیم زمانے میں نہیں بلکہ عہدِ وسطیٰ میں تو سنسکرت ہندستان کی کلاسیکی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ کالی داس، بان اور بھو بھوتی کے قاری تو موجود تھے لیکن سنسکرت ادب کے ماہر موجود نہیں تھے اور بہت سی سرکاری دستاویزیں تو سنسکرت میں لکھی جاتی تھیں لیکن عوامی زبان بہ سہولت اپنے قدم جمانے لگی تھی۔ اس زمانے کی بول چال کی جو زبانیں شمالی ہند میں رائج تھیں وہ بدھ کے زمانے کی مگھئی اور پالی اور عہد وسطیٰ کی نشاۃ ثانیہ والی سنسکرت کی آمیزش سے بنی تھیں جن میں یونانی اور پہلوی کے کچھ الفاظ آسانی سے جذب کر لیے گئے تھے۔

ڈاکٹر ہاروز (Hornwitz) نے اپنی کتاب "ہندستانی ادب کی مختصر تاریخ" میں کہا ہے۔ "سال 1000ء تک سنسکرت اور پراکرت ایک خوش آہنگ ہندی میں ضم ہو گئی تھیں اور یہی عہدِ وسطیٰ میں ہندوؤں کی زبان تھی"۔ پراکرت کا مطلب سیدھے طور پر ایک بولی

ہوتا ہے۔ کوشل خاندان کے عروج کے ساتھ سنسکرت زبردست تبدیلیوں کے عمل سے گذر رہی تھی اور وہ متعدد پراکرتوں کے روپ میں پھوٹ رہی تھی۔ بدھ مت کے مذہبی اصول پالی میں لکھے جاتے تھے جو مگدھ کے لوگوں کی مقدس زبان تھی۔ اس زبان کی بالادستی نو سو سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک قائم رہی اور اس نے سنسکرت کو ہندوؤں کی زبان کی حیثیت سے بے دخل کر دیا۔ یہ صورت حال ہندو مت کے احیا اور چھٹی صدی عیسوی میں برہمنوں کے دوبارہ عروج حاصل کرنے تک برقرار رہی۔ سنسکرت کو ایک بار پھر راج سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا (ویسے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سنسکرت کبھی بھی اس ملک کی بول چال کی زبان نہیں رہی) بہر حال اس سے پہلے کی صدیوں میں عوامی زبان اپنا گہرا نقش چھوڑ گئی تھی۔ لہٰذا سنسکرت دوبارہ عوام میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہ کر سکی اور ملک کی کلاسیکس کا حصہ بن گئی۔ برج بھاشا جو ہندی کی کافی تبدیل شدہ شکل تھی اور اپنی "کم سنی" کے مرحلے سے بہت آگے نکل چکی تھی، اس وقت تک اتنی ترقی کر چکی تھی کہ صرف مقبول گیتوں اور ادب کی زبان نہیں رہ گئی تھی بلکہ واحد ایسی زبان تھی جس نے متھرا اور نواحی علاقوں برندابن، اجمیر اور قنوج میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان علاقوں کو اس زمانے میں شمالی ہند میں تہذیب کے اہم مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ پراکرت زبان یونانی اور فارسی سے کس حد تک متاثر ہوئی یہ بتانا ذرا مشکل ہے لیکن اندازے یا قیاس کے لیے تاریخ میں ضرورت سے زیادہ ہی مواد موجود ہے۔ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ دارا (Darius) نے ایک ہندستانی صوبے کی بنیاد رکھی اور اس بات پر بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہندستانیوں نے یونانیوں کے خلاف فارس کی فوجوں کا ساتھ دیا تھا۔ اے جی رالنسن نے اپنی کتاب "مطالعہ تاریخ ہند" میں یہاں تک کہا ہے کہ "اس میں کسی شک کی گنجائش کم ہی نظر آتی ہے کہ پنجاب پر اہل فارس کے قبضے نے ہندستان پر بہت گہرا اثر مرتب کیا۔ کچھ مقامی راجاؤں نے غالباً فارسی رسم و رواج اور فن تعمیر کا اثر بھی قبول کیا۔" فارسی سلطنت کے خاتمے کے بعد مغربی ہندستان میں اس کی ایک واضح نشانی صدیوں تک باقی رہی۔ یہ خروشٹی

رسم خط تھا جسے Achacmenids کے افسران نے روشناس کرایا تھا اور چوتھی صدی عیسوی تک براہمی رسم خط پورے طور پر اس کی جگہ نہیں لے سکا تھا۔ خروشتی بلاشبہ ایک ارمنی رسم خط ہے جو اس طرح کے دوسرے رسم خط کی طرح دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا ہے سکندر نے ٹکشلا میں فارسی اور بہیلونی رسم ورواج کا مشاہدہ کیا تھا اور ہندستان کے شمال کے ہندو درباروں کے رسم ورواج تو یقینی طور پر فارسی ہی تھے۔ کم از کم میگستھنیز کی کتاب "چندر گپت موریہ کا دربار" پڑھ کر ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ہندوؤں کے ادب اور فنون پر یونانی اثرات کا سوال بہت سے مصنفوں کا محبوب موضوع رہا ہے اور ایک طرف جہاں ونسنٹ نے کالی داس کے شاہکار ادب میں یونانی اثرات تلاش کر لیے ہیں وہاں دوسری طرف پروفیسر رالنسن کا کہنا ہے کہ "پاٹلی پتر میں مغرب کے سفارت کاروں کی موجودگی کا سراغ ملتا ہے اور ایک یونانی رانی کی موجودگی سے دربار میں یقیناً یونان پرستانہ رجحان کو بڑھاوا ملا ہوگا"۔ کالی داس کے مشہور ناٹک "شکنتلا" میں بلاشبہ کچھ ایسے اندرونی ثبوت ملتے ہیں جن سے پروفیسر رالنسن کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً جب راجہ دشینت دل شکستگی کے لمحے میں تفریح کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو دو یونانی رقاصائیں اس کا دل بہلاتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے ہندوؤں کو یونانی ادب اور فنون متاثر کیے بغیر نہیں رہے ہوں گے۔ ابتدائی دور کے فارسی اور یونانی اثرات، سنسکرت زبان پر کس حد تک مرتب ہوئے یا کم از کم پالی پر جو بعد میں ایک شائستہ زبان بنی اور جس میں اشوک کے فرمان جاری ہوا کرتے تھے، ان کا کیا اثر پڑا اس کا اندازہ کرنا تو ماہرین لسانیات ہی کا کام ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام اور ان کی زبان پر غیر ملکی اثرات بہر حال مرتب ہوئے۔ سنسکرت کی اعلیٰ اور پیچیدہ نوعیت کی تکمیل اور درستگی اور اس کے بعد عوام میں اسے بول چال کے لیے آسان بنانے کے رجحان نیز سنسکرت پر پڑنے والے یونانی اور فارسی اثرات، شاید مل جل کر ایسے ابتدائی عوامل ثابت ہوئے جن کے باعث اس زبان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ متعدد بولیوں یا پراکرتوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ شمال میں جو پراکرت بولی جاتی تھی وہ کوشل

راجاؤں کے زمانے میں پالی بن گئی اور گمان غالب ہے کہ دوسری پراکرتوں نے دوسری شکلیں اختیار کرلیں جو اس وقت بنگال، گجرات، مہاراشٹر، راجپوتانہ اور شمال کے دوسرے علاقوں میں رائج ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں پالی کو سنسکرت نے پھر نکال باہر کیا اور بتدریج لیکن یقینی طور پر بعد کے دنوں میں یہ ہندی کی شکل میں تبدیل ہوتی گئی۔ برج یا متھرا کی زبان برج بھاشا اس وقت جب مشرق کے ہنوں نے ہندستان پر اپنے حملے کی شروعات کی، شمالی ہند کے "مہذب" حصّے میں ایک جدید فیشن کے طور پر رائج تھی۔ اگرچہ گجرات کے کچھ حصوں کو عربوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں فتح کرلیا تھا لیکن سبکتگین کے وقت تک کوئی اور قابلِ ذکر حملہ نہیں ہوا۔ سبکتگین نے یہ میراث محمود کے لیے چھوڑ دی جس نے ہندستان پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ اس کے بعد شمال کے بڑے حصّے میں غوریوں، ایبکوں، خلجیوں، سیّدوں اور افغانوں کے دورِ حکومت میں اور دکن میں قطب شاہی حکومت کے زمانے میں برج بھاشا ہی عوام کی زبان تھی جس سے ترکمانستان، عرب اور فارس کے "لشکروں" کا براہِ راست رابطہ ہوا اور یہ رابطہ ایک پُر وقار ناگزیر سمجھوتے کی شکل میں سامنے آیا جو بالآخر حکمراں اور محکوم دونوں طبقوں پر یکساں طور پر نافذ ہوا۔ ان تمام عوامل نے مل کر مختلف خصائل لوگوں کو ایک لڑی میں پرودیا اور اس طرح اردو بولنے والی ایک قوم وجود میں آگئی۔

برج بھاشا چونکہ سب سے اہم زبان تھی اس لیے وہی خاص دھارا بنی رہی، عربی، فارسی اور ترکستانی کی حیثیت معاون ندیوں جیسی تھی جس میں وہ آزادانہ طور پر ملتی اور بہتی رہیں۔ گویا اسی برج بھاشا کے خمیر سے "زبانِ اردو" کا ظہور ہوا اور اس نے تمام خاص افعال مہیا کیے بلکہ اسما، صفات اور ضمائر وغیرہ کی بہت بڑی تعداد بھی اسی کی دین ہے۔ یہ چیزیں تب سے اب تک زبانِ اردو کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

اب تاریخ شروع ہوتی ہے اس دور کی جس میں اس زبان کو رنگ روپ عطا کرنے میں باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں نے اپنے اثرات مرتب کیے اور اردو کے نام سے جو زبان

رائج ہوئی اس کے بولنے والوں نے خاص قسم کے عادات و آداب اختیار کیے۔ ہندستان میں غیر ملکی مسلمانوں کے آباد ہو جانے کے بعد سے مغلیہ حکومت قائم ہو جانے کے کافی عرصے بعد تک یعنی کم از کم پانچ صدی بعد تک مسلمان "شرفا" اور ان مسلم گھرانوں کی زبان فارسی ہی رہی جن کا تعلق امور ریاست سے تھا۔ مغل دربار میں فارسی کی حیثیت کبھی ختم یا کم نہ ہوئی اور یہ سلسلہ دلی کے آخری مغل بادشاہ کے زوال تک قائم رہا۔ انھوں نے انگریزوں کی قید میں آجانے کے بعد اپنے ساتھ بہتر سلوک روا رکھنے کے بارے میں ملکہ وکٹوریہ کے نام جو پیغام بھیجا تھا وہ فارسی میں تھا حالانکہ وہ نہ صرف یہ کہ اردو زبان کے جانے پہچانے شاعروں میں سے ایک تھے بلکہ نظریاتی اور عملی اعتبار سے بھی وہ اردو کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ "قلعۂ معلّٰی" یا شاہی دربار نہ صرف اس وقت بلکہ ہمیشہ عوامی زبان کا سب سے بڑا اور خالص سرچشمہ تصور کیا جاتا تھا۔ مسلمان بادشاہوں کی درباری زبان بھلے ہی فارسی رہی ہو لیکن شمال میں اردو ہر طرف دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔

بہت پہلے خلجی کے زمانے سے ہی مشہور مسلمان شعرا داد با عوامی زبان اختیار کرنے پر مائل تھے جس کے ابتدائی نقوش ہمیں امیر خسرو کے لافانی کلام میں نظر آتے ہیں۔ خسرو ایک نابغۂ روزگار تھے اور ان کے کلام کا بڑا حصہ فارسی میں ہے لیکن اپنے ہمعصروں میں وہ پہلے شاعر ہیں جسے اس اعتبار سے شاید ان مسلمانوں میں اوّلیت کا مقام حاصل ہے جو ہندستان میں پیدا ہونے کے باوجود فارسی میں لکھتے تھے۔ اس کے بعد بیدلؔ اور غالبؔ ہی کے حصے میں کسی حد تک وہ اعزاز آیا۔ خسرو نے اپنی صلاحیت کا ایک بڑا حصہ اس زبان پر صرف کیا، جو اس وقت "ہندی" کے نام سے جانی جاتی تھی اور جو برج بھاشا کی ایک شائستہ شکل تھی۔ عام طور سے آج بھی یہ زبان گیتوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ وہ زبان اردو تو نہ تھی لیکن اس کی پیشرو اور سرپرست ضرور تھی۔ اس وقت تک ہندی الفاظ کا جو ذخیرہ تھا وہ سماجی ضروریات کے مطابق محدود پیمانے کا تھا۔ سنسکرت یا کسی اور زبان کی مدد لیے بغیر وہ اس لائق نہیں بن سکتی تھی کہ اس کے ذریعے سائنسی یا فلسفیانہ خیالات کا اظہار ہو سکے۔ یہ بہت آسان

اور حس کو جگانے والی زبان تھی اور حیرت انگیز طور پر نغمہ و آہنگ کے لیے انتہائی موزوں تھی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ بچوں کی توتلی بولی جیسی تھی جو سننے میں بڑی میٹھی لگتی ہے لیکن اس سے کام نہیں چل سکتا۔

اس کا اگلا پڑاؤ زیادہ مضبوط ہے۔ ولی کو اردو کے ابتدائی شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے کلام سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خسرو کی ہندی بہت ساری تبدیلیوں کے عمل سے گذری۔ اب وہ اس طور پر ہندی نہ رہی بلکہ فارسی الفاظ اور بندشیں اخذ کر کے مشترکہ زبان کے اولین نمونے کے طور پر سامنے آئی۔ "زبانِ اردو" کو اب ایک شاعر مل گیا اور اس کے بعد سے تو اس کے پرستاروں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ قیاس تو بہت دوڑایا جاسکتا ہے کہ ہندی رسم خط میں سنسکرت کے نمونے پر اردو کیا اور کس طرح کا رول ادا کر سکتی ہے لیکن فارسی رسم خط کے حق میں بھی کافی طویل بحث کی جاسکتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ اسے اختیار کرنے کے بعد اس میں خیالات کی ایک نئی رو اور نئی اسپرٹ داخل ہوئی۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ فارسی چونکہ دربار کی زبان تھی اس لیے تمام حلقوں نے پوری دلچسپی سے اس کے فروغ میں حصہ لیا اور اردو جو بول چال کی زبان تھی فارسی کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اب فارسی رسم خط کو رضاکارانہ طور پر اختیار کیا گیا ہو یا کسی اور طرح سے، لیکن اسی نے اس نوزائیدہ زبان کو بقائے دوام بخشا ہے۔ لیکن یہ معاملہ بڑا عجیب ہے۔ مغلوب قوم کی زبان نے فاتح قوم سے اس کی متاعِ عزیز یعنی اس کی مادری زبان چھین لی اور وہ بھی بہت کم قیمت پر۔ ہندی رسم خط نے فارسی رسم خط کو توزیر نہیں کیا لیکن اس کے بھاری بھر کم وجود نے فارسی کو یقیناً بے دخل کر دیا۔ جس طرح انگلستان میں نارمن فتح کے بعد فرانسیسی دربار کی زبان تو رہی لیکن عوامی سطح پر اینگلو سیکسن اور فرانسیسی کی ملی جلی بولی مروج ہوئی اسی طرح یہاں فارسی دربار اور امرا کی زبان کی حیثیت سے تو باقی رہی لیکن عوام میں وہی زبان رائج ہوئی جو فارسی اور ہندی کی آمیزش سے بنی تھی۔ لیکن ایک فرق نمایاں ہے۔ اینگلو سیکسن کے پاس تو ادب تھا لیکن ہندی کے پاس ایسا کوئی ادب نہیں تھا جو وہ فارسی زبان کو

پیش کر سکتی۔ سنسکرت کا ادب بہت توانا تھا۔ اس میں رومان، ڈرامہ، سائنس اور آرٹ سب کچھ تھا لیکن ہندی میں میٹھے بول کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے برعکس فارسی زبان ایک شاندار ادب کی وارث تھی۔ فارسی پر عربی کا گہرا اثر تھا جو ایک عظیم تہذیب کی زبان تھی ۔انیسویں صدی کے وسط تک ہندی میں ادب کے جس ذخیرے کو شامل کیا گیا وہ مسلم دور حکومت میں ارتقا پذیر ہوا تھا۔ آر سی دت نے اپنی کتاب "ہندستان کی تہذیب" میں لکھا ہے کہ "ہندی شمالی ہند کی عام زبان ہے اور ہندی ادب کا آغاز چند کے رزمیہ سے ہوتا ہے جو دلی کے آخری ہندو راجہ کا ہم عصر تھا۔ اس کے بعد راما نند اور کبیر کی مذہبی تحریک شروع ہوئی اور اس کے نتیجے میں مقدس ہندی ادب کا ایک بہت بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ راجپوتانہ میں جاگیر دار سرداروں کے بہادری کے کارناموں سے متعلق بہت سے رزمیے اور نظمیں لکھی گئیں"۔ لیکن دت کے مطابق ہندی ادب کا آغاز چند کے رزمیہ سے ہوتا ہے جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ دلی کے آخری ہندو راجہ یعنی پرتھوی راج کا ہمعصر تھا۔ یہ چیز ہمیں بارھویں صدی کے اختتامی ایام کی طرف لے جاتی ہے۔

لیکن ہندی نے مزید ترقی کی۔ سورداس نے اپنی تصنیف "سور ساگر" سولہویں صدی میں پیش کی۔ کیشوداس نے بھگت مالا اور بہاری لال نے ست سائی تصنیف کی۔ لیکن ہندی میں سب سے اہم کام تلسی داس نے اودھی بھاشا میں رامائن لکھ کر انجام دیا۔ ہندی میں مندرجہ بالا ادب کے بارے میں آر سی دت نے جو تفصیل پیش کی ہے اس کے بعد بھی ہندی میں اہم تخلیقات سامنے آئی ہیں لیکن کسی کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو رامائن کو ملا۔ اب اجمالی انداز کا مشاہدہ کرنے والے کی سمجھ میں بھی یہ بات آجائے گی کہ فارسی کو پیش کرنے کے لیے ہندی ادب کا حقیقتاً کوئی سرمایہ نہ تھا جبکہ فارسی کے پاس ادب کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور یہ زبان ادب کی ہر شاخ اور صنف کو کچھ نہ کچھ دے سکتی تھی۔ فارسی نہ صرف یہ کہ صدیوں کی اعلیٰ شائستگی کی حامل تہذیب کی دین تھی بلکہ اس پر یونانی اور سنسکرت اثرات کا رنگ بھی پورے طور پر چڑھا ہوا تھا اور عربی کے اعلیٰ ادب میں بھی وہ شرابور تھی۔ لہٰذا اردو اگر فارسی

کے زیر اثر آ گئی تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔ ہندی نے بہر حال بنیادی چیزیں مہیا کیں۔ اس وقت کی ہندی تہذیب اس مرحلے میں آ گئی تھی جہاں دلکش سادگی اور انحطاط پذیر بانکپن کی پیدا کردہ پاکیزگی و سلاست اور سکون باقی رہ گیا تھا۔ اس نے بڑا ہی پر وقار پس منظر فراہم کیا اور فارسی کی شائستگی، عربی کی قوت اور ترکی کے شجاعانہ اثرات نے اس سے اپنا رشتہ استوار کیا اور ان سب کی آمیزش سے ایک کلچر وجود میں آیا جو اردو بولنے والوں کا کلچر ہے اور جو پوری دنیا کے کلچر سے الگ نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔ آپسی میل جول اور انضمام کے نتیجے میں ایسے اثرات کا ظہور میں آنا یقینی تھا جن کی اردو آج علمبردار ہے۔ فارسی مزاج جو فنکاری اور شائستگی کا حامل تھا جب عربی ادب کی سخت مزاجی اور "مردانہ" اثرات سے آشنا ہوا اور پھر تاتاریوں کے نیم بے ہنگم اور وحشیانہ طور طریقوں سے اس کا پالا پڑا تو ان تمام عوامل کے نتیجے میں ایک ایسے کلچر کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ اسے اس وقت کی ہندی تہذیب سے بھی چلا ملی جس کی سادگی، معصومیت اور پر وقار نغمگی نے اسے مزید نکھارا اور اسے آخری شکل عطا کی۔ اردو زبان اور اردو تہذیب اسی انضمام و امتزاج کی ایک خوبصورت گواہ ہے۔

گذشتہ سو برس کے دوران یہ زبان قوی ہیکل جوان بن چکی ہے۔ خسرو کے زمانے کا توتلی بولی والا اس کا بچپن رخصت ہو چکا ہے۔ یہ تو اسی وقت ایک ہونہار نوعمر بن چکی تھی جب ولی نے اس پر عنایت کی نظر ڈالی اور میر تقی میر، سودا اور انشا کے زمانے تک آتے آتے یہ عنفوان شباب تک پہنچ چکی تھی۔ دراصل اس وقت اس نے ایک انتہائی حوصلہ مند جوان کی شکل اختیار کر لی تھی جب میر حسن نے اس میں اپنی مشہور مثنوی لکھی۔ ظفر اور ذوق کے زمانے میں تو اس میں زوال کی علامتیں پیدا ہونے لگی تھیں کیونکہ اس کے نکھرنے کا عمل اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا اور غالب کے فارسیت کے رجحانات نے اختراعات کی وادی میں دراندازی شروع کر دی تھی۔ جہاں غالب کی اردو نثر جدت پسندی یا وقار کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، وہیں ان کی اردو شاعری اس زمانے کی تسلیم شدہ اردو اور ان کے انتہائی فارسی آمیز اسلوب کے درمیان، جس کے وہ موجد تھے، زبردست شگاف پیدا کرتی

ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے، جو بے مثال اہمیت کے مالک تھے لیکن جنھیں کافی نظر انداز کیا گیا، عوام کی زبان میں شاعری کی۔ انھوں نے اردو کو ہندی الفاظ و عناصر سے بھر دیا لیکن غالبؔ کی زبان نے اردو کے دھارے کو قطعی دوسری جانب موڑ دیا اور بعد میں داغؔ کے منظر عام پر آنے تک اردو، فارسی کے پالنے میں بیٹھی ہوئی سانس لے رہی تھی۔

اردو کا بیشتر نثری ادب رومانی، مذہبی اور تاریخی نوعیت کا ہے۔ نصف صدی سے زائد عرصے سے فکشن اور صحافت کے قدم بھی مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور فلسفیانہ اور سفر ناموں کے ادب، سوانح عمریوں اور دوسری زبانوں کے تراجم سے اس کا دامن بھر گیا ہے۔ سائنسی کتابیں البتہ ناکافی اور سائنس کا اور ٹیکنکل کام تو تقریباً نفی کے برابر ہے۔ لیکن تراجم کا کام پابندی سے ہو رہا ہے۔ زبان کو تیزی سے جدید بنایا جا رہا ہے تاکہ یہ تمام تر جدید تقاضوں کو پورا کر سکے۔ ڈرامہ کا بھی فقدان نہیں ہے۔ ڈرامہ سنسکرت کے لیے نیا نہیں ہے لیکن اردو کے لیے تقریباً بدیسی ہے اور کوشش ہو رہی ہے کہ فارسی کے طرز پر ڈرامے لکھے جائیں لیکن یہاں بھی وہی خامیاں ہیں جو فارسی میں نظر آتی ہیں۔ آرٹ سے متعلق ادب، جیسا کہ آج کے زمانے میں اسے سمجھا جاتا ہے، ابھی ابتدائی مرحلے سے آگے نہیں بڑھا ہے البتہ موسیقی سے متعلق کچھ اچھی چیزیں موجود ہیں۔ آرٹ سے متعلق جس قسم کا ادب رسکن، ویل رائٹ اور پیٹر نے پیش کیا ہے ویسے ادب کا تو اردو میں نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ جہاں تک تنقید کا سوال ہے جدید نقادوں کا تو ذکر ہی کیا اردو تو ولیم ہیزلٹ اور رسکن جیسا نقاد بھی نہیں پیش کر سکتی کیونکہ اردو تنقید یا تو بالکل خام حالت میں ہے یا سرے سے اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

ایک بالکل ہی استثنائی نوعیت کا طرز تحریر حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ عام رائے اس کے حق میں نہ ہونے کے باوجود خفیہ طور پر اسے سراہا گیا ہے۔ دراصل یہ اردو افعال کے ساتھ مشکل فارسی لکھنے کا ایک طرز ہے لیکن اسے اردو کے زوال کی ایک بدترین مثال ہی کہا جائے گا۔

ادب کا جو مجموعی سرمایہ اتنی کم مدت میں وجود میں آیا ہے اسے دیکھ کر واقعی حیرت

ہونے لگتی ہے کہ جو کام بہ ظاہر ناممکن نظر آتا ہے اس میں اتنی کامیابی کیونکر حاصل کرلی گئی۔ اردو نے جو شاید دنیا کی سب سے کم عمر زبان ہے، اپنے آپ کو اتنا مستحکم کرلیا ہے کہ سنسکرت، عربی اور جرمن زبانوں کو چھوڑ کر کسی بھی زبان سے آنکھیں ملاسکتی ہے۔ یہ انگریزی اور بنگالی سے زیادہ سائنسی خطوط پر نہیں وضع ہوئی ہے۔ یہ ان متعدد بولیوں کے بطن سے پیدا ہوئی ہے جو افراتفری کا شکار تھیں۔ اعلیٰ اور شستہ زبانیں کم وبیش اسی طور پر وجود میں آتی ہیں۔ حقیقتاً اس نے بہت مختصر عرصے میں زبردست ترقی کی ہے لیکن اسے صریحی طور پر کچھ اور فائدے بھی حاصل ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یونانی کے علاوہ کوئی بھی زبان بغیر کسی نمونے کے فروغ نہیں پاسکی ہے۔ یوروپ کی تقریباً تمام زبانیں لاطینی کے طرز پر ارتقاپذیر ہوئی ہیں ہر ایک کا ارتقا لاطینی سے نکلی ہوئی کسی نہ کسی ترقی یافتہ بولی کا مرہون منت رہا ہے۔ اس طرح نئی زبانوں کو یہ فائدہ حاصل رہا ہے کہ وہ ان زبانوں کے تجربات سے استفادہ کرسکیں جن سے وہ نکلی تھیں۔ اردو کے حصے میں سنسکرت، فارسی اور عربی کا پورا ادب آیا جس سے اس نے استفادہ کیا۔ ابتدائی ہندی کے زمانے میں اس نے محتا جی کے دن دیکھے لیکن وہ اس کی نو عمری کا زمانہ تھا۔ بعد ازاں وہ دھند چھٹ گئی اور اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بھرپور سرپرستی حاصل ہوئی اور سال بہ سال یہ ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کا ادب اتنی تیزی سے پروان چڑھا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

دلی، اردو کی حقیقی جائے پیدائش ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہوسکتی ہے لیکن یہ اس کی پسندیدہ تربیت گاہ ضرور بنی۔ جب دلی دربار انحطاط کا شکار ہوا اور اودھ کے نوابین کا ستارہ عروج پر تھا تو اہل قلم کا کارواں لکھنؤ کوچ کرگیا اور دلی کے "دیوان خاص" میں جو زبان سن بلوغت کو پہنچی تھی اس نے لکھنؤ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ وہاں قدرتی طور پر اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس زمانے کے انگنت شعرا وادبا میں انشا، سودا، ناسخ اور آتش جیسی ممتاز شخصیتیں بھی شامل تھیں جنھوں نے اس زبان کو نکھارا اور سنوارا۔ یہ اس زمانے کا ایک انوکھا کارنامہ تھا۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہو گی کہ اردو جس طرح مختلف تہذیبوں کی آئینہ داری کرتی ہے اسی طرح اس نے مختلف زبانوں کی روح بھی اپنے اندر سمیٹ رکھی ہے۔ایک امتیازی کلچر کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مشرقی شائستگی کی ایک خوبصورت نمائندہ بھی ہے۔اردو کی بہترین خوبیوں سے جو لوگ واقف ہیں وہی اس تبصرے کی صحیح معنوں میں داد دے سکتے ہیں کہ سماجی میل جول کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شائستگی نے اسے جس بلندی پر پہنچایا ہے وہ فرانسیسی اور فارسی کے حصے میں بھی نہیں آئی۔اردو میں مختلف تہذیبوں کے بہترین اور نادر عناصر پوری ہم آہنگی کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں اور یہ ایک ایسے کلچر کی نمائندگی کرتی ہے جسے انسانی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔

ایک خام اور ناتوان بولی کے طور پر اس نے اپنا سفر شروع کیا لیکن فوجیوں اور عام شہریوں کے مقامِ اجتماع پر اس نے مختلف نسلوں کے درمیان ایسی مفاہمت کرائی جو دور رس نتائج کی حامل تھی اور اس طرح اس نے ایک شستہ زبان کے طور پر وقار حاصل کیا۔اس نے اپنی تشکیل محدود خیالات کے دائرے میں رہ کر نہیں کی اور اپنی تکمیل کے مراحل طے کر کے آج جس شکل میں یہ ہمارے سامنے ہے اسے مستثنیات ہی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

کے۔ ایم۔ منشی

میں اپریل 1935ء میں گاندھی جی کے ہمراہ اندور گیا جہاں انھیں ہندی ساہتیہ سمّیلن کی صدارت کرنا تھی۔ اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہندستان کی قومی زبان کے لیے گاندھی جی نے جو تحریک شروع کی ہے، وہ کتنی طاقتور ہے۔ انھوں نے ہندی سمّیلن کو فیضان عطا کیا اور "دکھشن ہندی پرچار سبھا" کو مشورے دیے جو جنوبی ہندستان میں شاندار کام کر رہی تھی۔

اس وقت یوپی میں سنسکرت آمیز ہندی اور فارسی آمیز اردو کے پُر جوش حامیوں کے درمیان زبردست تنازعہ چل رہا تھا۔ اور وہ لوگ بھی لاعلمی کے باعث اس بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے جو اس مسئلے کی نوعیت سے بھی واقف نہ تھے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندی اور اردو دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں۔ ایک چھوٹے سے تعلیم یافتہ طبقے کی بات چھوڑیے۔ یوپی کے لوگ ایک ہی زبان بولتے ہیں جس میں سنسکرت، فارسی اور مقامی عناصر کا امتزاج کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جو فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتا تھا اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اردو بول رہا ہے اور جو سنسکرت یا مقامی الفاظ زیادہ استعمال کرتا تھا اسے ہندی والا کہا جاتا تھا۔ راستے کا عام آدمی صرف وہی الفاظ استعمال کرتا تھا جو عام بول چال میں مشترک تھے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ وہ الفاظ آئے کہاں سے ہیں۔ اس زندہ زبان کو مردم شماری کے افسران ہندستانی قرار دیتے تھے جبکہ ہندو اسے ہندی اور مسلمان اردو کہتے تھے۔ مردم شماری کی رپورٹ میں ڈاکٹر ہٹن کہتے ہیں:۔

"بات چیت کی زبان کے لیے ہندی اور اردو اصطلاحات کے استعمال نے دو مکتبِ خیال کے لوگوں کے درمیان تلخ تنازعہ پیدا کر دیا ہے اور اس کا سلسلہ ہندو مت اور اسلام سے جوڑا جا رہا ہے۔ اگر عملاً دیکھا جائے تو ہندی اور اردو کے درمیان کسی طرح کا خط فاصل

کھینچنا ناممکن ہے کہ یہ ایک ہی طرح سے بولی جاتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی فارسی الفاظ زیادہ استعمال کرتا ہے اور کوئی سنسکرت الفاظ۔ چونکہ عام آدمی صرف مشترکہ بول چال کی زبان استعمال کرتا ہے اس لیے مردم شماری کا عملہ خود اپنے تعصبات کے تحت کاغذات پر عام طور سے زبان کا تعین کر دیتا ہے"۔

ہندی کی ایک شکل، جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت تھی، صدیوں تک ادب کی زبان رہی ہے۔ یہاں تک کہ ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور یاری صاحب جیسے بعض مسلمان شعرا نے بھی اپنی کاوشوں سے اسے مالامال کیا۔ جب نئی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندو مصنفین نے ادب تخلیق کرنا شروع کیا تو قدرتی طور پر انھوں نے اسی زبان سے اور پھر سنسکرت سے استفادہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان کافی حد تک سنسکرت کے زیر اثر آگئی۔ یہی اس وقت کی ادبی ہندی تھی۔ اسے گجرات، مہاراشٹر، بنگال اور یوپی میں آسانی سے سمجھ لیا جاتا تھا اور وہ لوگ بھی کسی حد تک سمجھ لیتے تھے جن کی مادری زبان کنڑ، تیلگو یا ملیالم تھی اور جو تھوڑی سی ہندی بھی جانتے تھے۔

جو ہندی مغل بادشاہوں کی فوج استعمال کرتی تھی وہ اردو کہی جانے لگی۔ یہ ہندستانی یا ادبی ہندی سے قدرے مختلف تھی کیونکہ اس میں فارسی اصل کے الفاظ بڑی تعداد میں ہوتے تھے۔ جدید دور میں جب مسلمان ادیب، ادب تخلیق کرنے لگے تو انھوں نے قدرتی طور پر فارسی اور عربی ادب کے سرچشمے سے فیضان حاصل کیا کہ وہاں تک ان کی رسائی بھی آسان تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی اردو فارسی آمیز ہو گئی اور ہندستانی اور ادبی ہندی سے دور ہوتی گئی۔ یہ زبان یوپی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک طبقہ سمجھتا اور استعمال کرتا تھا نیز دوسرے صوبوں کے پڑھے لکھے مسلمان اسے جانتے تھے اس حلقے سے باہر کے لوگ جو ادبی ہندی یا ہندستانی آسانی سے سمجھ لیتے تھے ان کے لیے اس زبان کا سمجھنا آسان نہ تھا۔

سنسکرت آمیز ادبی ہندی اور فارسی آمیز ادبی اردو کا ارتقا قدرتی طریقے سے ہوا تھا اور ابتدائی مرحلوں میں کسی طرح کی رقابت یا فرقہ پرستی کو دخل نہ تھا۔ اس قدرتی

ارتقا کو روکنا آسان نہ تھا۔ اگر کوئی ہندو شاعر کوئی عشقیہ گیت یا تاریخی رومان تخلیق کرتا تو ظاہر ہے وہ بجے دیو ویاس اور والمیکی کے کارناموں سے رجوع کرتا۔ اسی طرح جب کوئی مسلمان ادب تخلیق کرتا تو عام حالات میں وہ سعدیؔ یا حافظؔ کے علاوہ اور کس سے استفادہ کر سکتا تھا؟

یہ دونوں دھارے اس وقت تک آپس میں نہیں مل سکتے جب تک کہ یوپی کی سماجی رابطے کی زبان ہندستانی اتنی ترقی نہیں کر جاتی کہ ادب کی زبان بن سکے۔ اگر ہندی اور اردو کے ادب پاروں کا ترجمہ کرایا جائے یا ایک دوسرے میں ڈھال لیا جائے تو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

انگریزوں کے آنے سے قبل ہندو ادیب فارسی الفاظ استعمال کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح مسلمان ادیب بھی سنسکرت الفاظ سے بدحظ نہیں ہوتے تھے۔ بد قسمتی سے سیاسی اور مذہبی عدم اعتمادی ہمارے لیے ایک ایسی لعنت ثابت ہوئی کہ ہندو ادیبوں نے فارسی الفاظ سے پرہیز کرنا شروع کر دیا اور مسلمان ادیب سنسکرت الفاظ کو نظر انداز کرنے لگے۔ اگر دونوں فرقوں کے ادیب یہ خیال کیے بغیر کہ کون سا لفظ کہاں سے آیا، بہترین الفاظ استعمال کریں تو سنسکرت آمیز ہندی اور فارسی آمیز اردو کی دوری کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوال وسیع تر ہندو مسلم مسئلے کا ایک حصہ بن گیا ہے اور یہ اسی وقت حل ہوگا جب ہندو اور مسلمان سماجی اور تہذیبی سطح پر قریبی رابطوں کو فروغ دے کر ہم آہنگی قائم کریں گے۔

یوپی سے باہر مختلف صوبوں کے مسلمان متعدد قسم کی ہندستانی بولتے تھے۔ حیدر آباد (دکن) میں یہ اردو کے قریب ہوئی اور مہاراشٹر میں کم و بیش یہی گجراتی اور مراٹھی تھی۔ میں نے بیجاپور جیل میں اسی کے کنڑ روپ کا بھی مشاہدہ کیا۔ ٹھیک اسی طرح جب مردوں اور عورتوں نے ہندستانی کو قومی زبان کے طور پر سیکھنا چاہا تو انھوں نے ہندی قواعد کے ڈھانچے میں اپنی مادری زبان کے سنسکرت آمیز عناصر جوڑ دیے۔

رسم خط کا مسئلہ

قومی زبان وضع کرنے کے لیے تمام تجربات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندستانی جو یوپی میں سماجی رابطے کا ذریعہ تھی بذاتِ خود ایک زبان ہے۔ یہ ایک زندہ مادری زبان تھی لیکن یہ پورے ملک کی زندہ زبان نہ تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔

یوپی، پنجاب اور شمال مغربی صوبہ سرحد کے باہر قومی زبان وہ زبان تھی جس کا ماحول سنسکرت آمیز اور ڈھانچہ ہندی کا تھا۔ لہٰذا ان صوبوں میں سماجی رابطہ اس زبان ہی کے ذریعے ممکن تھا۔ ہمارے تخلیقی فن کے اظہار کا وسیلہ بھی یہی بن سکتی تھی۔ لیکن چونکہ قوم پرستانہ طاقتیں زیادہ مستحکم ہو رہی ہیں، سائنسی ایجادات ہندستان کے مختلف خطوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہی ہیں، ملک کی تہذیب اور طرزِ زندگی میں یکسانیت پیدا ہو رہی ہے لہٰذا یہی زبان ایک زندہ قومی زبان بننے کی اہل ہے۔ لیکن یہ مادری زبان کا بدل کبھی نہیں بن سکتی اور نہ ایسا کسی کا کوئی ارادہ ہے۔ جب یہ قومی زبان پورے ہندستان کی رابطے کی زبان بن جائے گی تو اس کا ذخیرۂ الفاظ بہت توانا اور جامع نوعیت کا ہو جائے گا۔ یہ بہت سے یورپی الفاظ کو بھی جذب کر سکتی ہے۔ شاید ادھر دہائیوں سے ہندستانیوں کے درمیان قریبی سماجی رابطوں کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ یہ تمام عناصر ہم آہنگ ہو جائیں گے اور ایک زندہ قومی زبان وجود میں آئے گی۔ اس کے بعد اردو اور ہندی نیز سنسکرت اور فارسی کا تنازعہ بھی ختم ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں رسم خط کا سوال بہت اہم ہے۔ اگر ان تمام صوبوں کے لیے ہمارے پاس ایک رسم خط ہو، جہاں بنگالی، ہندی، مراٹھی اور گجراتی زبانیں بولی جاتی ہیں تو ان صوبوں کے ان چاروں زبانوں کے ادب کو آسانی سے پڑھ سکیں گے۔ دوسرے صوبوں کے وہ لوگ جو قومی زبان پڑھ سکتے ہیں، وہ بھی اِن چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ رسم خط صرف دیوناگری ہی ہو سکتا ہے۔

اس مسئلے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلاف ہے اس پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ امید کرنا فضول ہے کہ مسلمان اردو رسم خط ترک کر کے ہمارے رسم خط کو اپنالیں گے۔ خود ہندوؤں کے درمیان بھی کوئی ایک رسم خط مشترکہ نہیں ہے۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام تعلیم یافتہ لوگوں کو دیوناگری اور اردو، دونوں رسم خط سکھائے جائیں؟ اس کا عملی حل ایک ہی ہے کہ دیوناگری رسم خط کو وہ تمام لوگ اختیار کرلیں جو آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ہی سوال باقی رہ جائے گا کہ دیوناگری اور اردو کے درمیان اس بات پر سمجھوتہ ہو جائے کہ آیا دونوں رسم خط اختیاری ہوں گے یا پھر یہ کہ دونوں کے لیے رومن کو مشترکہ رسم خط تسلیم کرلیا جائے۔ گجراتی حروف تہجی میں پانچ یا چھ حروف ایسے ہیں جن میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن اس پیچیدگی کو آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے مراٹھی اور ہندی بولنے والے افراد بغیر کسی دشواری کے تمام حروف استعمال کرتے ہیں۔ اگر مختلف صوبوں کے لوگ چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کو تسلیم کرلیں تو اس سمت میں خاصی پیش رفت ہو سکتی ہے۔

1931ء کی مردم شماری کے مطابق، اعداد و شمار کے اعتبار سے ان مسائل کو یوں پیش کیا جاسکتا ہے:۔

(1) ہمارے وہ لوگ جو ہندستانی زبانیں استعمال کرتے ہیں۔ 34,98,88,000

(2) (i) جو لوگ سنسکرت خاندان کی زبانیں بولتے ہیں۔ 25,37,12,000

(ii) جن کی مادری زبان ہندوستانی ہے۔ 12,02,39,000

(iii) جو لوگ آسانی سے ہندی۔ ہندوستانی سمجھ لیتے ہیں ۔ 11,00,00,000

(iv) جو لوگ ایسی زبانیں بولتے ہیں جو عام طور سے دیوناگری میں لکھی جاتی ہیں۔
11,11,29,000

(v) جو لوگ ایسی زبانیں بولتے ہیں جو دیوناگری ہی کی کسی شکل میں لکھی جاتی ہیں ۔
9,33,51,000

(3) جو لوگ غالب سنسکرت آمیز دراوڑی زبانیں بولتے ہیں ـــ ۔4,67,18,000

(4) جو ایسی دراوڑی زبانیں بولتے ہیں جن میں کچھ سنسکرت ملی ہوتی ہے ـــ 2,14,12,000

اب دوسرے نقطۂ نظر سے اسی بات کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہندستان میں دس ہزار افراد میں سے:

(i) 9,982 افراد ہندستانی زبانیں بولتے ہیں۔

(ii) 7235 افراد سنسکرت خاندان کی زبانیں بولتے ہیں جن کا ذخیرۂ الفاظ اور ادب سنسکرت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

(iii) 4053 افراد ایسی زبانیں استعمال کرتے ہیں جو دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔

(iv) 2,662 افراد ایسی زبانیں استعمال کرتے ہیں جو دیوناگری کی کسی شکل میں لکھی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان ہر10,000 افراد میں سے 6,715 افراد آسانی سے دیوناگری رسم خط اختیار کر سکتے ہیں۔

اب اس پس منظر میں صورت حال کو دیکھا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہندستانی ادبیات کی "دولت مشترکہ" کی بنیاد وہی عنصر ہو سکتا ہے جو سنسکرت خاندان کی تمام تر زبانوں اور ان دراوڑی زبانوں میں مشترک ہے جن میں سنسکرت کو بالادستی حاصل ہے اور جو ہندستانی کے ڈھانچے میں سموئی جا سکتی ہوں۔ اس زبان کے ذریعے تمام صوبوں کے، نیز اردو کے ادب کو ایک بین صوبائی سطح پر باہم تبادلے کے لیے رکھا جا سکتا ہے اور ہر صوبائی نیز اردو ادب اپنی مرضی کے مطابق جتنا مواد چاہے اس سے حاصل کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندستان کے ادب اور تہذیب میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ یہ کام ایک آل انڈیا "ساہتیہ پریشد" انجام دے سکتا ہے۔ دوسری طرف یوپی کی "ہندستانی" سے متعلق تنظیموں کے ذمے بنیادی کام یہ ہوگا کہ وہ اس ذخیرے سے اردو کے لیے مواد حاصل کریں اور اردو کے ادب پاروں کو اس ذخیرے میں منتقل کریں۔

لیکن ان تمام سرگرمیوں کو صوبائی "پریشدوں" سے کوئی سروکار نہیں رکھنا

چاہیے۔ سماجی میل جول اور تخلیقی آرٹ صرف مادری زبان کے وسیلے سے پروان چڑھ سکتا ہے۔ دوسری زبانیں سوتیلی ماں جیسی ہوتی ہیں۔ ایک فنکار کے ذہن میں جو خیال پل رہا ہے اسے دوسری زبانیں جمالیاتی بصیرت نہیں عطا کر سکتیں۔ قومی زبان کی تشکیل اور ادبیات کی دولتِ مشترکہ کا قیام مختلف نوعیت کے کام ہیں اور ان کا تعلق بین صوبائی "نظام روابط" سے ہوگا۔ جبکہ تخلیقی آرٹ الگ چیز ہے کہ اس کے تحت ادب کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور یہ کام صرف مادری زبان کے ذریعے انجام پا سکتا ہے۔ ادبی تبادلے کی سہولیات تخلیق کے لیے تحریک تو پیدا کر سکتی ہیں اور رابطے کی شدید ضرورت تخلیق کی سمت تو متعین کر سکتی ہے لیکن تخلیق کا اصل راز زمین کی شادابی اور زرخیزی یعنی مادری زبان کی توانائی میں مضمر ہوتا ہے۔ جو اپنی زبان کی خدمت کرے گا وہی صحیح معنوں میں ادب کی دولت مشترکہ کو فیض پہنچا سکتا ہے اور جو کوئی قومی زبان اور ادب کی تعمیر میں اپنا تعاون پیش کرے گا وہ اپنی مادری زبان کی ترقی کو یقینی بنائے گا۔ ہندستان ایک قوم ہے اور یہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے جذبے سے لبریز ہے۔ اس کے اہل قلم ایک زبان ایک رسم خط اور ایک ادب کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ یہ جذبہ ان کے دلوں میں آج جس شدت سے پیدا ہوا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ صورت حال آج ملک کی ہر ادبی شخصیت کے پیش نظر ہے اور لامتناہی ترقی اور نمو کا تصور ہر دل میں موجزن ہے۔

میرا انگریزی میں لکھا ہوا مضمون بعنوان "ہندستان میں صوبائی ادب کی دولت مشترکہ" ملک کی ادبی شخصیتوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ مضمون یوں شروع ہوتا ہے۔

"حالیہ دنوں میں ہندستان کے ہر اس صوبے میں جس کی اپنی امتیازی زبان ہے، ادبی سطح پر بیداری کی لہر سی آئی ہوئی ہے۔ اس بیداری کے نتیجے میں ہر صوبے میں متعدد ادبی انجمنیں قائم ہوگئی ہیں جن کا سرپرست ایک وفاقی ادارہ ہے جسے متعلقہ زبان کے "ساہتیہ پریشد" کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن عام طور سے یہ تنظیمیں الگ تھلگ صرف صوبائی پیمانے پر کام کر رہی ہیں"۔

لیکن اس وقت قوم پرستی کے جذبے کو بالادستی حاصل ہے اور مستقبل میں بھی یہی جذبہ حاوی رہے گا۔ تمام صوبائی کاوشیں جاری رہیں گی اور ان کا دائرہ کار بڑھ کر عظیم تر قومی یکجہتی اور ادب کی دولت مشترکہ کے قیام سے متعلق سرگرمیوں کا احاطہ کرے گا۔ اور اگر ہندستان کو ایک باقاعدہ قوم کا درجہ حاصل کرنا ہے تو ایسا کرنا لازمی ہوگا۔ لیکن اس طرح کی دولتِ مشترکہ کو عملی جامہ پہنانے کا کام ہندی ہی کے توسط سے ممکن ہو سکے گا جس کے لیے تمام صوبوں کے اہل قلم مل جل کر مشترکہ طور پر کوشش کریں گے۔ جب اس مقصد میں ہم کامیاب ہو جائیں گے تو صوبائی ساہتیہ پریشدوں کا ایک وفاق قائم کریں گے جو درحقیقت آل انڈیا "ساہتیہ پریشد" ہوگا۔ یہ خیال میرے دل میں 1925ء سے اس وقت سے پل رہا ہے جب میں گجراتی ساہتیہ پریشد سے پوری سرگرمی سے وابستہ ہوا۔

میری اس تجویز کا خاطر خواہ ردِ عمل ہوا اور "ہنس" نام کا ماہانہ رسالہ مشہور ہندی ناول نگار منشی پریم چند کی اور میری مشترکہ ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ چونکہ اسے گاندھی جی کا آشیرواد حاصل تھا اور اس کے ساتھ ایک ہندی اور ایک گجراتی کے مصنف کا نام جڑا ہوا تھا اس لیے شروع ہی سے اسے کامیابی ملی۔

"ہنس" نے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کیا۔ پہلی بار ہندستان کے مختلف علاقوں کے ادیب اس کے صفحات پر ایک ساتھ نظر آئے۔ لیکن ایک سال کی شاندار کارگزاری کے بعد اسے بند کرنا پڑا کیونکہ بنارس کے کلکٹر نے ہم سے ضمانت مانگی۔ خالص ادبی رسالہ بھی اتنا خطرناک تصور کیا گیا۔ گاندھی جی اس بات کے حق میں نہ تھے کہ ضمانت کی رقم کا بوجھ برداشت کیا جائے۔

کچھ دنوں بعد کاکا صاحب کالیلکر اور میں نے مل کر بھارتیہ ساہتیہ پریشد قائم کیا اور اس میں اپنے آپ کو مصروف کر لیا۔ اس کی تجویز میں نے اپنے میمورنڈم میں پیش کی تھی لیکن ملک اس طرح کی وفاقی ادبی انجمن کے قیام کے لیے تیار نہ تھا۔

☆☆☆

امرناتھ جھا

ہمارے سیاسی رہنماؤں کا بھلا ہو کہ ان کے طفیل ہندستان میں مشترکہ زبان کا مسئلہ خطرناک شکل اختیار کرتا جارہا ہے اور ایسے آثار نظر آرہے ہیں کہ ملک میں جہاں پہلے ہی سے اتنے سارے جھگڑے موجود ہیں، فساد کی ایک اور بنیاد کھڑی ہو جائے گی۔ ہمارے بہت سے مسائل کی طرح یہ بھی تیزی سے ایک فرقہ وارانہ مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ میرے نزدیک ایسی کوئی وجہ موجود نہیں ہے کہ اس مسئلے کو اتنی اہمیت دی جائے کہ یہ بحث و مباحثہ اور تنازعات کا محور بن جائے۔ جہاں تک عوام کی اکثریت کا سوال ہے، جن کے لیے یہ لیڈر تقریریں کرتے ہیں۔ خود ان کے لیے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے گانووں یا اگر فیشن زدہ لاطینی انداز میں کہا جائے تو دیہی علاقوں میں بول چال کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پنجاب میں ہر شخص پنجابی بولتا ہے۔ بمبئی میں لوگ یا تو مراٹھی بولتے ہیں یا گجراتی۔ بنگال میں ہر شخص بنگالی بولتا ہے۔ مدراس میں لوگ تامل یا تیلگو، کنٹر یا ملیالم بولتے ہیں۔ مغربی یوپی میں ہر کوئی اردو بولتا ہے جب کہ مشرقی یوپی اور بہار میں ہر ایک کی زبان ہندی ہے۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے مقامی علاقوں میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ترہت کے علاقے میں برہمن، کایستھ، مسلمان سب یکساں طور پر میتھلی بولتے ہیں۔ اودھ میں ہندو مسلمان سب اودھی بولتے ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ فرقہ وارانہ اور مذہبی بنیاد پر تلخی کو بڑھاوا دیا جارہا ہے جس کا نتیجہ یہ سامنے آرہا ہے کہ اردو عربی کے قریب جارہی ہے اور ہندی سنسکرت کے قریب؟ شہروں میں بھی یہ مسئلہ نہ تو بازاروں میں بحث کا موضوع ہے اور نہ ڈرائنگ روم میں۔ یہ وفاقی ہندستان کا ایک مسئلہ ہے یہ بین صوبائی کانفرنسوں کا مسئلہ ہے۔ یہ سنٹرل اسمبلی اور وفاقی عدالت کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس سے ایسا کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے اسے اتنی اہمیت دی جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس مسئلے نے خواہ مخواہ تلخی اور مخاصمت

کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ حقائق کیا ہیں؟ ہندستان اتنا ہی بڑا ہے جتنا بڑا روس کے بغیر پورا یوروپ۔ یہاں زبان کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا یوروپ میں ہے۔ جیسا کہ ایک ممتاز اسکالر نے کہا ہے "اگر ہم سنسکرت اور ہند آریائی کے مقابل کلاسیکی اور رومانس کی زبانیں رکھیں، مثلاً اور دراوڑی زبانوں کے سامنے سیلٹی اور ٹیوٹونی کو رکھیں، ایرانی کے سامنے بالتی اور سلاؤ کو رکھیں، تبتی اور برمی کے سامنے فن، اگریلن اور ترکی کو رکھیں تو دونوں طرف کچھ باقی نہیں بچے گا"۔

میں جنوبی ہند کے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا لیکن جہاں تک مشرقی، مغربی اور شمالی ہند کا سوال ہے وہاں جدید زبانیں ابھی تک اعلیٰ علمی مقاصد کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھیں۔ کوئی دو سو پچاس سال قبل تک عالم یہ تھا کہ دیسی زبانوں کا بیشتر ادب ضرب الامثال، مذہبی گیتوں اور عشقیہ نغموں وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اعلیٰ علمی اور دانشورانہ سطح پر اظہار اور رابطوں کا وسیلہ سنسکرت ہوا کرتی تھی جسے اس وقت ہندستان کے طول و عرض کے تمام تعلیم یافتہ ہندو سمجھتے تھے جن میں آریائی بھی شامل تھے اور دراوڑ بھی۔ ابتدائی بودھ اور جین ادب بھی سنسکرت ہی میں ملتا ہے۔ جبکہ مسلمان اور ایسے ہندو (بطور خاص کشمیری کائستھ اور کھتری) جو دربار سے وابستہ تھے یا انتظامیہ میں اہم عہدوں پر فائز تھے، اعلیٰ علمی کاموں کے لیے عربی یا فارسی کا استعمال کرتے تھے۔

جدید زبانوں کے فروغ کا سلسلہ 1837ء کے اس فیصلے کے بعد شروع ہوا جس کے تحت فارسی کی جگہ عدالتی کام کاج کے لیے صوبائی زبان کا استعمال ہونے لگا۔ مسلمانوں نے اسے اپنے وقار پر ایک سنگین حملہ تصور کیا کیونکہ کبھی وہ اس ملک کے حکمراں ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر برابری کی اس سطح پر لانے کے لیے تیار نہ کر سکے جس پر فارسی زبان اور فارسی کلچر کی بالادستی کے سبب مسلم دورِ حکومت میں تمام زبانیں چلی گئی تھیں۔ ملک کی دوسری زبانوں کی نشوونما، ترقی اور خوشحالی کے خلاف کہیں کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تمل، تیلگو، کنٹر، ملیالم سب کو یہ موقع ملا کہ وہ ترقی کی انتہائی

بلندی کو عبور کریں۔ بنگال، مدراس اور بمبئی کے مسلمانوں کو پوری آزادی تھی کہ وہ اپنی صوبائی زبانوں کی ترقی کے لیے اپنا تعاون پیش کریں لیکن جب کبھی بھی بہار، یوپی اور پنجاب میں ہندی کے فروغ کی بات ہوئی، مسلمانوں اور ان ہندوؤں کی جانب سے جن کی مسلمانوں کی سرپرستی میں خوب منہ بھرائی ہوئی تھی، اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ مخاصمت کا یہ رویہ کچھ اتنا شدید ہوا کہ اس کا ردِ عمل ناگزیر ہو گیا۔ اسی صورت حال کے نتیجے میں اب کائستھ، کشمیری اور کھتری بھی اس بات کے لیے مجبور ہوئے کہ اپنے بچوں کو اردو کی جگہ ہندی پڑھائیں۔ حالانکہ یہ وہ حلقے تھے جو اپنی فارسی و عربی دانی نیز سنسکرت اور ہندی سے اپنی قطعی لاعلمی پر فخر کیا کرتے تھے۔

میں اردو کے مطالعے پر اپنا کافی وقت صرف کرتا ہوں۔ آج کے اردو کے بیشتر ممتاز ادبا سے میری شناسائی ہے۔ میں نے متعدد موجودہ شاعروں کے کلام کا جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اردو کا پورا ماحول اور مزاج غیر ملکی ہے ہندستانی نہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ خود ایک ہندو بھی جو ہندو مذہب، ہندو کتھاؤں اور دیومالاؤں کے ماحول میں پروان چڑھا ہے جب اردو لکھنے بیٹھتا ہے تو مختلف رنگ میں رنگ جاتا ہے اور نوشیرواں، حاتم، شیریں، لیلیٰ مجنوں اور یوسف کے حوالے دیتا ہے اور کبھی بھی (سوائے مخصوص حوالوں کے) یدھشٹر، بھیم، ساوتری، دمینتی، کرشن اور دوسری ان شخصیتوں کا حوالہ نہیں دیتا جن سے وہ بچپن سے مانوس ہے۔ حالانکہ ہندو، خواہ کتنا ہی بڑا فارسی داں ہو اور فارسی زبان و ادب پر خواہ کتنی ہی مہارت حاصل کرے، اسے مسلمانوں کی جانب سے آسانی سے "اہل زبان" نہیں تسلیم کیا جاتا۔ ایک اور مثال دیتا ہوں۔ اردو کی ایک لغت "فرہنگ آصفیہ" میں جو حال ہی میں دکن میں ترتیب دی گئی ہے، جہاں عربی کے 7000 اور فارسی کے 6500 الفاظ ہیں وہاں سنسکرت کے صرف 500 الفاظ درج کیے گئے ہیں۔ اردو شاعری میں جو بحریں استعمال ہوتی ہیں وہ ہندستانی نہیں بلکہ فارسی ہوتی ہیں۔ اردو میں جمع بنانے کا طریقہ بھی ہندستانی اصول کے مطابق نہیں ہوتا

بلکہ فارسی طرز پر ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو خصوصی طور پر مسلمانوں کی زبان ہے نیز یہ کہ یہ غیر ہندستانی ہے۔ یہی وہ دو وجوہ ہیں جن کے باعث ہندو اسے نسبتاً نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ معاملہ باہم رواداری کا بھی ہوتا ہے۔ الٰہ آباد میں بی اے اور ایم اے ڈگری کے لیے اردو اور ہندی پڑھانے کا انتظام پندرہ سال قبل کیا گیا تھا اور آج بھی یہ سلسلہ موجود ہے۔ سینکڑوں ہندو لڑکے بی اے کے لیے اور اچھی خاصی تعداد میں ایم اے کے لیے اپنے نام درج کراتے ہیں لیکن ایک بھی مسلمان لڑکا بی اے یا ایم اے ہندی کے لیے اپنا نام نہیں لکھواتا۔ جہاں کہیں ہندی کے حق میں کوئی کچھ کہتا ہے تو اس پر فوراً یہ الزام لگا دیا جاتا ہے کہ یہ اردو کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اگر میں اپنے گھر میں مشاعرہ کرتا ہوں تب تو ٹھیک ہے کہ مجھے یہی کرنا چاہیے لیکن جب کوی سمیلن کا اہتمام کرتا ہوں تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندی کی بے جا طرفداری ہے۔ اگر میں "جناب صدر" کہتا ہوں تو اس غیر ملکی طرز تخاطب پر کسی کو حیرت نہیں ہوتی لیکن اسی کے لیے میں اپنی مادری زبان کا لفظ "سبھاپتی" استعمال کروں تو مجھ پر یہ الزام لگ جاتا ہے کہ میں ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچا رہا ہوں اور ایک "مردہ زبان" کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ یہ دعویٰ کہ اردو مسلمانوں کی ہے، یہ مفروضہ کہ ہندی کو بڑھاوا دینے کی کوشش درپردہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی سازش ہے اور اس بات پر مسلسل اصرار کہ صرف اردو ہی مسلم تہذیب کی آئینہ دار ہے؛ یہ وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے ہندو فرقے کے لوگ زیادہ سے زیادہ اردو سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اردو نے سنسکرت کے ایسے الفاظ بھی خارج کر دیے جنھیں میرؔ جیسے پہلے کے شعرا استعمال کرتے تھے۔ حیدر آباد کے دستور میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت دی گئی ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اسے لازمی طور

پر

ذریعۂ تعلیم بنادیا گیا ہے حالانکہ اس ریاست کے 85 فیصد لوگوں کے لیے یہ اجنبی یا غیر ملکی ہے۔ دراصل یہی وہ عوامل ہیں جن کے باعث اس زبان کی مقبولیت گھٹ رہی ہے۔ اس

حقیقت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ 99-1889ء میں یوپی میں جہاں 361 کتابیں ہندی میں اور 559 اردو میں چھپی تھیں وہاں 36-1935ء میں 2,139 کتابیں ہندی میں اور صرف 252 اردو میں چھپیں۔ ہندی جو یہ شاندار ترقی کر رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اسے مسلم دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ بنگالی، مراٹھی اور گجراتی کے خلاف اس طرح کا رویہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس مخاصمانہ رویے کا سلسلہ گزشتہ صدی کی اسی کی دہائی سے جا ملتا ہے جب سر سید احمد خاں نے ہندی کے تعلق سے تنگ نظری کی یہ پالیسی اختیار کی تھی۔ لیکن آج اردو خود اسی کا شکار ہو رہی ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی ایک میٹنگ میں راجہ شیو پرساد نے ایک انتہائی معقول تجویز یہ پیش کی تھی کہ سوسائٹی کے جریدوں اور دوسرے مواد کا ترجمہ ہندی میں بھی ہونا چاہیے۔ اس پر سر سید بپھر اٹھے تھے اور کہا تھا ـــــ

> "یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو اور مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ہندی پر ہرگز متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علاحدہ اور مسلمان علاحدہ ہو جائیں گے"۔

سر سید کو ہندو مسلم اتحاد کا حامی کہا گیا لیکن اس پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ کیا وہ اس بات کے لیے کوشاں نہ تھے کہ ہر ممکن طریقے سے کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ مسلمانوں کی الگ شناخت قائم ہو سکے؟ "حیاتِ جاوید" میں مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

> "ہندو مسلمانوں میں پہلے الٹے اور سیدھے پردے کی تمیز تھی لیکن جب سے اچکن کا رواج ہوا یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ اسی سبب سے سر سید کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ہندستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور ـــ امتیاز پیدا کریں اور اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس

اول خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محڈن کالج کے
بورڈروں کے لیے اس قاعدے کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں
میں عمل در آمد ہے، یونیفارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا"۔

جب ایک شخص ہندستانیوں سے الگ شناخت قائم کرنے کے لیے قسطنطنیہ کا یونیفارم اختیار کرنے کی تجویز پیش کر رہا ہے تو ایک مشترکہ زبان کے وسیلے سے یکجہتی قائم کرنے کی اس کی کوششیں قابل یقین نہیں معلوم ہوتیں۔ اور پھر وہ "مشترکہ زبان" کون سی ہے؟ "نوشیرواں" نام کے ایک رسالے کے تازہ شمارے (اپریل 1940ء) میں جو اس وقت میرے سامنے ہے، ایک مضمون اس خطیبانہ جملے پر ختم ہوتا ہے ـــــ

"انصاف سے کہیے۔ کیا یہ نظیر اور آزاد کی اردو ہے یا گنگارام اور سیٹھ
جمنالال کی؟"

اس کا تو واضح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اردو صرف اسی کو کہا جا سکتا ہے جسے صرف مسلمان بولتے اور لکھتے ہیں۔ ہندو جو لکھتے اور بولتے ہیں وہ اردو نہیں ہے۔ پھر یہ کیسی "مشترکہ زبان" ہوئی؟ دلی کی جامعہ ملیہ سے حال ہی میں "ہمارا پنجسالہ پروگرام" کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوا ہے، اس کے دیباچے میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے ـــــ

"دو برس کے بعد سے جامعہ نے اپنے بنیادی مقصد کی طرف توجہ کی۔
ارباب جامعہ نے سیاست کے نشیب و فراز سے قطع نظر کر کے علمی اور
تعلیمی خدمات کو اپنی کوششوں کا مرکز قرار دیا اور تعلیم کے نہایت معقول
انتظام کے ساتھ ساتھ ایک شعبہ تصنیف و تالیف بھی قائم کیا"۔

یہ ایک ایسا اقتباس ہے جس کی لفظیات کا 50 فیصد حصہ عربی اور فارسی الفاظ پر مشتمل ہے۔ "برس" کے سوا کوئی بھی اسم ذات ہندستانی نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں دیسی یا مقامی الفاظ صرف فعل متعلق فعل اور حرف ربط تک محدود ہیں۔ اسی زبان کے لیے مولانا عبدالحق بڑے طمطراق سے دعویٰ کرتے ہیں کہ "دراصل ہندی کی ترقی یافتہ شکل ہی اردو ہے"۔ ترقی یافتہ ہندی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجیے ـــــ

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبالؔ بہت بلند پایہ شاعر، عظیم المرتبت مفکر تھے۔ بعض حضرات کو شاید اس بات کے تسلیم کرنے میں پس و پیش ہو کہ وہ علوم روحانی کے معلم اور اسرار باطنی کے حکیم بھی تھے اور انھیں رہبانیت کی گہرائیاں معلوم اور رمز مخفی سے بخوبی آگاہی تھی"۔

جو لوگ فارسی کا اچھا خاصا علم نہیں رکھتے کیا وہ یہ اقتباس سمجھ سکیں گے؟ اس کے باوجود اردو کے پرجوش حامی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ہندستان کی مشترکہ زبان ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کی یادگار۔ اسی زبان کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی "ناقابل تقسیم ہیں"۔ ہندستان کی آبادی میں اس زبان کے جاننے والوں کو خوردبین کی مدد سے تلاش کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف ہندی والوں کا دعویٰ بھی یکساں طور پر ناقابل قبول ہے۔ دوسرے صوبے کے لوگوں کو 'خاص طور سے بنگال کے لوگوں کو' تذکیر و تانیث کا سوال الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ حالیہ برسوں میں ہندی کے ادیبوں کا رجحان اپنی زبان کو مصنوعی اور کتابی بنانے کا رہا ہے۔ وہ سنسکرت کے مشکل، نامانوس اور دور از کار الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ وہ پہلے کے دور کے ہندی شعرا اور گیت کاروں کے سیدھے سادے طرز کو ترک کرتے جا رہے ہیں۔ وہ زبان کو عوام سے دور لے جا رہے ہیں حالانکہ عوام ہی کی گود میں یہ پلی تھی۔ ایک معمولی دیہاتی جو سورداس، کبیر اور تلسی داس کو سمجھ لیتا ہے وہ نرالا، سمترا نندن پنت اور جے شنکر پرساد کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہندی کی اصل عظمت یہ تھی کہ یہ عوام کی زبان تھی۔ یہاں تک کہ اس کی کلاسیکی چیزوں کو بھی عام آدمی پڑھتے تھے۔ اس کے ادب کا عوام سے براہِ راست رابطہ تھا۔ یوپی اور مغربی بہار کا شاید ہی کوئی گانوں ایسا ہو جہاں آپ کو یہ دیکھنے کو نہ ملے کہ بوڑھے اور جوان، کسی پیڑ کے نیچے یا الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ پڑھا لکھا مانا جاتا ہے وہ ہندی کی کویتائیں یا دوہے اونچی آواز میں

سنا رہا ہے۔وہ کبیر کا کلام ہو سکتا ہے یا سورداس کا یارام چرت مانس کی چوپائیاں ہو سکتی ہیں۔سب خاموشی سے سنتے ہیں محظوظ ہوتے ہیں، اور گنگناتے بھی ہیں۔سنانے والا ایک منجھے ہوئے گرو کی طرح اشاروں اور جسمانی جنبش کا بھی سہارا لیتا ہے۔اس طرح کے ادب میں لطیف فلسفے اور روزمرہ کے عام اور مانوس مسائل کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان شعرا کی نازک موسیقیت ملک کے لوگوں کے دلوں کو چھوتی ہے۔بچے اور بوڑھے، عام کسان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد یکساں طور پر ان لافانی نظموں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ہندی کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس کے ذریعے امیدوں،امنگوں خوابوں اور عام آدمی کے روزمرہ کے مسائل کا اظہار ہوتا ہے۔اور اس کی جڑیں اپنی مٹی میں بڑی گہرائی تک پیوست ہیں۔اپنی سرحدوں سے باہر کسی وفاداری کی یہ پابند نہیں ہے۔پھر بھی یہ فراخ دل ہے۔یہ عربی فارسی اور انگریزی سے آزادانہ اور فراخدلانہ طور پر الفاظ لیتی ہے۔ماضی میں اس نے کسی بھی اچھے لفظ کو قبول کرنے میں پس وپیش نہیں کیا خواہ وہ کسی بھی ذریعے سے آیا ہو۔لیکن بعد میں صورتِ حال یہ ہوئی کہ ہندی کے ادیب غیر ضروری طور پر اپنی زبان کو سنسکرت آمیز بنانے کے مرتکب ہوئے۔یہاں ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جسے صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سنسکرت اچھی طرح جانتے ہیں۔

''شبھوت سوندریہ گیان۔۔۔شبد شبد میں تیرے اُجول۔۔۔ہم شکھارا۔۔۔''

لیکن اگر اس پر اعتراض کیا جائے تو جواب یہ مل سکتا ہے کہ ادبی طرزِ اظہار صحافتی یا عام بولی سے مختلف ہوگا۔صرف ایک قسم کے الفاظ شاعرانہ تخیل اور بلند خیالات کے اظہار کے لیے ناکافی ہوتے ہیں اور یہ کہ فلسفیانہ تصورات اور سائنسی حقائق کے اظہار کے لیے کلاسکی زبان سے الفاظ لینے ہی پڑیں گے۔نئی چیزوں اور نئے تصورات کے لیے ماضی میں بھی سنسکرت سے الفاظ لیے گئے ہیں۔ڈاکٹر ایف ڈبلو تھامس نے بجا طور پر کہا ہے کہ نہ صرف ہند آریائی بلکہ دراوڑی زبانیں بھی سنسکرت اور اس سے اخذ کردہ الفاظ سے اسی طرح متاثر ہوئی ہیں جس طرح انگریزی کلاسکی زبانوں سے ہوئی ہے۔ملیالم میں شاید یہ صورت

حال کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔اردو کو چھوڑ کر باقی تمام زبانیں سنسکرت کو ایک ذخیرہ سمجھ کر اس سے رجوع کرتی ہیں اور اعلیٰ مقاصد کے لیے الفاظ لیتی ہیں۔یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جنہیں پورے ہندستان میں لوگ سمجھ لیں گے۔اگر کوئی نیا لفظ سنسکرت سے لیا جاتا ہے تو یہ بنگالی، مراٹھی، گجراتی، تمل ،تیلگو، کنڑیا ملیالم سبھی زبانوں کے علاقوں میں آسانی سے قبول کرلیا جائے گا۔ڈاکٹر راجندر پرساد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جب اپنی ریڈیو کی تقریر میں بنگال، مدراس اور بمبئی کے لیے سنسکرت آمیز ہندستانی کی سفارش کرتے ہیں تو گویا وہ اس صورتِ حال کو تسلیم کرتے ہیں۔(شاید اول الذکر کو اس بات سے دلچسپی ہو سکتی ہے کہ دلی کے اسٹوڈیو میں ان کے نام کا تلفظ "راجندر پرشاد "ہوتا ہے)یہی وجہ ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندستانی اصل کی کوئی بھی زبان اگر پورے ملک کی مشترکہ زبان بننے کی اہل ہو سکتی ہے تو اس کا سنسکرت آمیز ہونا ضروری ہوگا۔حد تو یہ ہے کہ "ہندستان ٹائمز"جو ہندستانی کے آستانے پر سجدے کرتا ہے اور اسی لیے مجھ سے اس بات پر برہم ہوا کہ میں اس کے مقررہ آستانے پر سجدہ کرنے والوں میں نہیں ہوں، وہ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا کہ ہندستان کی مشترکہ زبان سنسکرت آمیز ہی ہو سکتی ہے "کیونکہ آبادی کی اکثریت کی مذہبی وابستگی اس زبان سے بڑی گہری ہے"۔انجمن ترقی اردو کے سرکاری ترجمان نے یکم اکتوبر 1939ء (ایک اکتوبر یا پہلی اکتوبر نہیں بلکہ یکم اکتوبر)کی اشاعت میں ایک نمایاں مضمون شائع کیا جس میں میرے بیان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا:۔

> "ہندی، ہندستانی اور اردو کی بحث نے ادھر چند سال سے جو رخ اختیار کیا ہے اگر اسے دیکھ کر پروفیسر جھا کے دل میں یہ امید اٹھی ہے تو ہمارے خیال میں ان کی یہ امید بہت ہی موہوم ہے کیونکہ کسی جیتی جاگتی زبان کو مٹانا اور اس کی جگہ پر ایک مردہ زبان کو جس کا رواج اس کی زندگی میں بھی ملک کے ایک چھوٹے سے حصے تک محدود تھا، از سر نو رائج کرنا مہینوں اور برسوں کا بھی نہیں صدیوں کا کام ہے۔اور دنیا کی رفتار کو دیکھتے ہوئے تو ہندستان میں اب اس کی کوئی

توقع نہیں پائی جاتی کہ مستقبل کی صدیاں محض کھنڈر ڈھونے میں
صرف کی جائیں گی"۔

اب اس طرح کی لاعلمی، تعصب اور گمراہ کن تنقید کے بارے میں بھلا کیا کہا جائے۔ اپنے اس خطبے میں جس کی اِس مضمون میں تنقید کی گئی ہے، میں نے یہ کہا تھا کہ اردو کو نقصان نہیں پہنچنے دینا چاہیے اور اگر "ہندستانی کو فروغ دیا جاتا ہے تو اردو کو لازماً نقصان پہنچے گا"۔ میں نے کہا تھا کہ اردو کے پاس عظیم ادب ہے۔ اس کے پاس اتنا بڑا خزانہ ہے کہ کوئی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ وہ ضایع ہو۔۔۔ میں اپنی بات پر پشیماں نہیں ہوں اور اس بات کو دہراتا ہوں کہ مستقبل میں کل ہند زبان بننے کی اہل صرف وہی زبان ہو سکتی ہے جو سنسکرت سے آزادنہ طور پر الفاظ مستعار لے گی۔

ہندستانی کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ یہ بیمار ہو چکی ہے۔ اس نے ادیبوں کے تمام حلقوں کو ناراض کیا ہے۔ اردو کے پُر جوش حامیوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی تاوقتیکہ یہ بالکل اردو سے مشابہ نہ ہو۔ "ہماری زبان" کا کہنا ہے:

> "اگر اس میں سہل اردو کے سوا دوسرے عناصر شامل کیے گئے تو نہ صرف اس کا چلنا ممکن نہ ہو گا بلکہ جو تھوڑا بہت رواج اس کو ملے گا وہ ملک میں اور فساد پیدا کرے گا"۔

دوسرے لفظوں میں یہ وہ زبان ہونی چاہیے جو فارسی میں پورے طور پر ڈھلی ہوئی ہو اور جس میں شامل وہی الفاظ اور محاورے ملک کے طول و عرض میں سمجھے جائیں گے جس طرح کے اس جریدے کے اسی ادارتی مضمون میں نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے ــــ

"ممتاز عہدہ دارانِ ریاست" "رونق افروز" "طویل تقریر" "مشترکہ زبان" "علم برداروں" "شدید مزاحمتوں" "مقولوں" "ناقابلِ تقسیم مجموعے" "تہذیب و تمدن" "مخصوص" "قدیم تاریخ اور فصیح ادب کی حامل تھیں" "زحمت" "فارسی اثرات غالب تھے" "ادبی خصوصیت" "تلمیحات وغیرہ" "ترتیب" "مقبوض" "حیرت انگیز" "ارتکاب" "حسبِ ذیل" "ترقی پسند مصنفین" "تحریک کی مخالفت پر کمربستہ ہے"

"مزید ترقی میں کوشاں ہے" "شکوک اور بے اعتمادی" "ہر صاحب فہم" "اس عقیدے کا اعلان" "سرپرستانہ رویہ"۔

یہ خیال بے بنیاد نہیں ہے جس کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ جب آل انڈیا ریڈیو مشترکہ زبان کے سوال پر رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو مدعو کرتا ہے تو ان میں ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت برج موہن دتاتریہ، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر راجندر پرساد کے نام ہوتے ہیں۔ ان چھے میں سے صرف آخر الذکر ہندی سے واقف ہیں اور وہ بھی ہندستانی سے متعلق کانگریس کی کھلی ہوئی پالیسی سے گہری قربت رکھتے ہیں۔ گویا آل انڈیا ریڈیو ایک بھی ہندی اہل قلم کو تلاش نہ کر سکا۔ یہ اردو کا ایک کھلا پروپگنڈا تھا جبکہ ہندی کا کوئی بھی کارکن نہ تھا۔ ایک اور بات جس سے ہندی ادیبوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں وہ یہ ہے کہ کانگریس کے اہتمام میں ایک دوغلی (کھچڑی) زبان دیوناگری رسم خط میں شائع ہوتی ہے۔ یہ "دوغلاپن" صرف ناگری والی شکل میں نظر آتا ہے جبکہ اردو میں اس کی "طہارت" برقرار ہے، "روشنی" حکومتِ بہار کا ترجمان تھا جو گانووں والوں کے لیے اردو اور ہندی، دونوں رسم خط میں چھپتا تھا۔ اس "ہندستانی" کا ایک نمونہ یہاں پیش خدمت ہے جو بہار کے "کسانوں اور مزدوروں" کے لیے چھپتا تھا۔ میں اس کے ۲۱ر نومبر 1939ء کے دیوناگری رسم خط میں چھپے شمارے کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں ـــــ

> "خدا اسکول مذکور کی انسپکٹریس صاحبہ و۔۔۔افسران وڈاکٹر محمود صاحب کا دونوں جہان میں رتبہ بلند کرے جنھوں نے میرے محلے میں بھی نائٹ کلاس قائم کر کے ہم غریبوں کو رات کو فرصت کے موقع میں جامۂ حیوانیت اتار کر جامۂ انسانیت سے آراستہ ہونے کا موقع بخشا۔"

یہ ہندستانی تو بہار کے گانووں میں رہنے والے مسلمانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئے

گی اور ہندوؤں کی سمجھ میں تو یقیناً نہیں آئے گی جو آبادی کے 85 فی صد حصے کا احاطہ کرتے ہیں۔

حال ہی میں "لیڈر" میں ایک مضمون نگار نے اپنے مضمون میں یہ اشارہ کیا ہے کہ کانگریس ہندستانی کے سلسلے میں جو پالیسی اختیار کر رہی ہے، اس سے ہندی کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس نے مولانا آزاد کی صدارتی تقریر کے اردو اور ہندی متن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ "اردو تقریر غلطیوں سے پاک، پُر وقار اور خالص ہے لیکن ہندی تقریر کوئی پڑھے تو وہ نقلی، غیر فطری اور لنگڑی لولی نظر آئے گی"۔ اس نے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ اردو متن تو خالص اردو میں ہے لیکن دیوناگری متن میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہے اور الفاظ بے جوڑ اور بالکل غیر فطری ہیں۔ ناگری متن میں اس طرح کی بے ربط ترکیبیں ہیں۔ "سمتا کے اصول"، "ہمارے دینک جیون کی بے شمار حقیقتیں"۔

ایک اور بات پر غور کرنا ضروری ہے۔ گوالیار میں چند ماہ قبل میں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ ایک نئی زبان ایجاد کرنے کی کوشش میں ہندی اور اردو کو ختم کرنے کا فیصلہ، اس کے حامیوں کے لیے متعدد رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "بامبے کرانکل" نے لکھا تھا۔۔۔ "ہندی اور اردو کو ختم کرنے کی احمقانہ تجویز کسی نے پیش نہیں کی ہے"۔ کسی اخبار سے بحث کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ حرف آخر تو ہمیشہ ایڈیٹر ہی کی بات کو مانا جاتا ہے لیکن قاری شاید یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ لکھنؤ اور دلی کے ریڈیو اسٹیشن "ہندی" اور "اردو" کے الفاظ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ہندستان کے پی ای این نے آسامی، گجراتی، کنڑ وغیرہ زبانوں کے لیے کالم وقف کیے ہیں لیکن "ہندی" اور "اردو" کا ذکر نہیں کیا۔ گویا ہندی اور اردو کے ادب ایک ہی جیسے ہیں اور الگ الگ اگر ان کا ذکر کیا جائے تو ان کی اہمیت آسامی سے بھی کم ہوگی! لیکن "نیو انڈین لٹریچر" جس کی ادارت کا کام اہم زبانوں کے "نمائندوں پر مشتمل بورڈ" کے ذمّے ہے اور جس میں بنگالی اور گجراتی وغیرہ کے نمائندے موجود ہیں، اردو اور ہندی نمائندگی سے محروم ہیں البتہ ہندستانی کا نمائندہ شامل کیا گیا ہے۔ یہ سب خطرے کی علامتیں ہیں۔۔۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی

فرقہ یا صوبہ اپنی زبان چھوڑ کر کوئی دوسری زبان اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔اس کے ساتھ اس کی بہترین روایات جڑی ہوئی ہیں۔اس سے اس کا بہترین ورثہ جڑا ہوتا ہے۔اس کی آوازیں اس کے لیے شہد سے بھی میٹھی ہوتی ہیں۔

بین اقوامی مقاصد کے لیے انگریزی کا استعمال ناگزیر ہے۔انگریزی اب تک ہماری قانون سازیہ اور ہماری اعلیٰ عدالتوں کی زبان رہی ہے۔ہم اس کی خواہ کتنی ہی مزاحمت کریں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا جلسہ، انگریزی کی "قوت اتحاد" کے بغیر منعقد نہ ہو پاتا۔فیروز شاہ مہتہ، سریندر ناتھ بنرجی، بپن چندر پال، دادا بھائی نوروجی، گوکھلے انگریزی کی مدد کے بغیر پورے ملک میں بیداری لانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ہندستانیوں نے قریب ایک صدی تک اس زبان کا علم حاصل کیا ہے اور ہمارے رہنما آسانی سے اسے استعمال کر سکتے ہیں۔یہ عوام کی زبان نہیں ہو سکتی لیکن مرکزی قانون سازیہ، عدالتوں اور بین صوبائی اجتماعات میں یہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ یہ اظہار کا آسان وسیلہ بنی رہے گی۔اگرچہ اب کسی ہندستانی کا وہ ولولہ باقی نہیں رہا کہ وہ انگریزی کا ادیب بن کر شہرت کمائے گا لیکن اس زبان نے ہمارے اندر قومیت کا شعور بیدار کرنے میں جو گرانقدر خدمت انجام دی ہے اس کے لیے ہمیں اس کا ممنون ہونا چاہیے۔ آزادی، ذمہ دار حکومت اور جمہوریت جیسے تصورات انگریزی مصنفین کی تحریروں سے ہی اخذ کیے گئے ہیں۔ان میں Burke، گوڈون، بل، شیلے، سون برن، مورے اور دوسرے مصنفین کی تحریریں شامل ہیں جن میں ایسے جذبات موجزن ہیں جو تعمیر و ترقی میں ہمارے اعتماد کو پختہ بناتے ہیں اور ہمارے اندر جنگ آزادی میں کامیابی حاصل کرنے کا عزم پیدا کرتے ہیں۔انگریزی کا استعمال یا اس کا غلط استعمال کر کے تمام ہندستانی یکساں طور پر فائدے میں ہیں یا گھاٹے میں ہیں۔کسی بھی مدراسی کو دلی یا لکھنؤ میں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہاں کے لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔کسی بھی بنگالی کو یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ قواعد کی رو سے جنس کے فرق سے ناواقف ہے۔

سی۔ راج گوپال آچاریہ

اس سوال پر کوئی تنازعہ نہیں ہے کہ ہندستانی کو، ہندستان کی قومی زبان ہونا چاہیے۔ تنازعہ تین باتوں پر ہے۔ اول یہ کہ اس کا نام کیا ہو؟ دوئم یہ کہ کون سا رسم خط استعمال کیا جائے؟ اور سوئم یہ کہ اس زبان میں کس طرح کے الفاظ استعمال کیے جانے چاہئیں۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس زبان کو ہم کس نام سے پکاریں بشرطیکہ ہم سب کی سمجھ میں آئے کہ اس نام سے ہماری مراد کیا ہے۔ انگریزی کو "Angaise" کہا جائے، "انگریزی" کہا جائے یا "انگلستانی" کہا جائے، یہ بذات خود کوئی سنجیدہ سوال نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ہم اِس زبان کے لیے "ہندی" کی اصطلاح استعمال کریں، جیسا کہ مغلوں کے عہد میں اسے کہا جاتا تھا یا اس سے قدرے طویل لفظ "ہندستانی" سے کام چلائیں یا اسے "اردو" کا نام دیں، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ "ہندستانی" باقی دونا موں کے مقابلے زیادہ مقبول ہوگا اور اس میں اعتراض کی کم ہی گنجائش ہوگی۔ کسی بھی نام کو مقبول بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے استعمال کیا جائے اور دوسرے اگر اس کی جگہ کوئی اور نام استعمال کرتے ہیں تو انھیں ایسا کرنے سے منع نہ کیا جائے۔ کوئی بھی رسم خط بحث یا استدلال سے نہیں بلکہ اس کے مثبت استعمال سے رائج ہوتی ہے۔

کسی پر بھی کوئی رسم خط لادنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچوں کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے والدین کی مرضی کے مطابق کوئی بھی رسم خط اختیار کریں۔ پرانے ادب کو کسی نئے رسم خط میں دوبارہ لکھنا آسان نہیں ہوتا کہ ہم اسے تسلیم کرنے کے لیے اب فیصلہ صادر کریں؛ اگر ہم مقامی زبان، رسم خط کو قومی زبان کے لیے چھوڑ دیں تو اس سے

قومی زبان کا پرچار کرنے میں آسانی ہوگی۔ دیوناگری رسم خط مراٹھی اور ہندی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور سنسکرت کے لیے تو یہ تمام صوبوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں اسے فوقیت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود پنجاب اور یوپی میں اردو کے لیے جو فارسی رسم خط استعمال کیا جاتا ہے اسے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بڑی اچھی بات ہوگی کہ بغیر کسی ردّو کد دونوں رسم خط کے استعمال کی آزادی دی جائے۔ دو رسم خط میں لکھی جانے والی زبان کسی طرح کی رکاوٹ بننے کی بجائے یکجہتی قائم کرنے کا ایک اضافی وسیلہ بن سکتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایک مالدار زبان کا طرۂ امتیاز یہ ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہی خیال کے اظہار کے لیے ایک سے زائد الفاظ موجود ہوں، جنھیں بولنے یا لکھنے والے اپنی خواہش سے موزونیت اور حسنِ اسلوب کے تقاضوں کے تحت استعمال کر سکیں۔ ڈکشنریوں میں شامل وہ تمام الفاظ جو فارسی اور عربی سے اخذ کیے گئے یا جو سنسکرت سے لیے گئے یا وہ الفاظ جو خود ہندی اصل کے ہیں؛ یہ سب کے سب زبان کو جاندار اور توانا بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ کسی بھی خاص قسم کے لفظ پر پابندی عائد کر کے ہم زبان کے ساتھ بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ لفظوں کے انتخاب کا حق بولنے یا لکھنے والے کو ملنا چاہیے۔ یہاں ایک مثال دی جاتی ہے کہ کس طرح ایک ہی بات کو کئی انداز سے کہا جا سکتا ہے۔ "میں یہ بات جانتا ہوں۔" یا "میں اس بات سے واقف ہوں۔" یا "یہ بات میرے علم میں ہے۔" یا "یہ بات مجھے معلوم ہے"۔ اسی طرح ایک آدمی ایک بات کو یوں کہہ سکتا ہے۔ "یہ قطعۂ آراضی میں نے اسے دے دیا"۔ اور یوں بھی کہ "یہ زمین میں نے اسے بطور عطیہ دے دی۔" یا یوں کہ "میں نے اس جائداد کا حق ملکیت اس کے نام منتقل کر دیا"۔ اگر ہم اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ایک ایسی زبان کی، جسے زندگی کے ہر شعبے میں چالیس کروڑ افراد استعمال کرنے والے ہیں، کیا ضرورتیں اور کیا تقاضے ہو سکتے ہیں تو اندازہ ہوگا کہ ان لوگوں کی بات بڑی بے تکی ہے جو زبان میں ایک ہی طرح کے الفاظ شامل کرنے کے حق میں ہیں اور دوسری طرح کے الفاظ کے استعمال کی مخالفت کرتے

ہیں۔الفاظ کے انتخاب کا معاملہ پورے طور پر ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے جو انھیں استعمال کرتے ہیں۔وہ خود ہی اس کا فیصلہ کریں گے کہ ان کا مدعا کیا ہے، کس انداز سے وہ اپنے خیال کا اظہار کریں گے نیز یہ کہ اسلوب اور موزونی کے تقاضے کیا ہیں۔

مندرجہ بالا تجزیے سے میرے ذہن میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندستان کی قومی زبان کے مسئلے پر لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شمالی ہند میں ہندی اور اردو کے سوال پر جو بھی تنازعات موجود ہیں، ان کے باعث دونوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ جنوبی ہند کی حد تک اردو اور ہندی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اس فضول سی بحث میں ایک مشترکہ کاز برباد ہوتا نظر آتا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہ سوال بہت سے محبانِ وطن کے لیے لہو گرم رکھنے کا بہانہ بنا ہوا ہے۔

تیج بہادر سپرو

پچاس سال قبل تک پنجاب اور بہاریا ان صوبوں کے کچھ حصوں میں مجھے اس زبان میں کچھ زیادہ فرق نہیں نظر آتا تھا جسے ہندو اور مسلمان بولتے اور لکھتے تھے۔ گزشتہ تیس برسوں سے ایک ایسا رجحان پروان چڑھ رہا ہے جس کے تحت ہندو اس زبان کو سنسکرت کے مشکل اور ناموزوں الفاظ سے بوجھل بنا رہے ہیں اور اسی طرح مسلمانوں میں خاص طور سے پنجاب اور دکن کے مسلمانوں میں عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ داخل کرنے کا رجحان پنپ رہا ہے۔ اگر یہی رجحان برقرار رہتا ہے تو وہ وقت دور نہیں جب ہندوؤں کی اپنی الگ زبان ہوگی اور مسلمانوں کی الگ اور چونکہ زبان مختلف پہلوؤں سے تہذیبی زندگی سے بہت قریبی رابطہ رکھتی ہے اس لیے مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ کہیں ہم دو متضاد ثقافتوں کو تو فروغ نہیں دے رہے ہیں۔ میں اس بات کا زبردست حامی رہا ہوں کہ جو الفاظ اس زبان کے خمیر میں رچ بس گئے ہیں انھیں ہر حال میں باقی رکھنا ہے، خواہ وہ عربی فارسی سے آئے ہوں یا سنسکرت سے۔ مجھے انگریزی اور فرانسیسی جیسی غیر ملکی زبانوں کے ایسے الفاظ کو نکال باہر کرنے کا بھی کوئی جواز نظر نہیں آتا جو مسلسل استعمال کی وجہ سے ہماری زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ اردو اسی طور پر پروان چڑھی ہے اور مستقبل میں بھی اسی طرح فروغ پائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ مجھ جیسے لوگ جسے اردو کہتے ہیں وہ گانوؤں میں نہیں سمجھی جاتی۔ شاید یہ اس حد تک صحیح ہے کہ مشرقی اضلاع میں جو زبان بولی اور لکھی جاتی ہے اس میں سنسکرت الفاظ کی

تعداد زیادہ ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح مغربی اضلاع میں لکھی اور بولی جانے والی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر مغربی اضلاع کے کسی عام آدمی سے کسی ایک خاص لفظ کے بارے میں پوچھیے کہ یہ عربی کا ہے یا فارسی کا تو شاید اس کا جواب یہی ہوگا کہ اسے معلوم نہیں۔ اسے وہ اپنا ہی لفظ سمجھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کا ارتقا شمالی ہند میں سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے قدرتی طور پر ہوا۔ یہ حالات کی ضرورت تھی، اس نے باہمی اختلافات کو کم کیا اور ہندوؤں کو یہ موقع دیا کہ وہ مسلمانوں کو سمجھیں اور مسلمانوں کو یہ موقع ملا کہ وہ ہندوؤں کو سمجھیں۔ اب اس زبان کی جگہ ہم لوگ ایک ایسی زبان وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے "ہندستانی" کہا جائے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ محض اردو کو بے دخل کرنے کی کوشش ہے جس کے تحت ان الفاظ کو ہٹا کر جو اس زبان میں رچ بس گئے ہیں، ان کی جگہ سنسکرت الفاظ کو داخل کیا جائے گا۔ یہی وہ معاملہ ہے جس پر مجھے شدید اعتراض ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہمیں اس زبان کو "قومی زبان" بنانے پر اتنا اصرار کیوں ہے؟ میں تو اسی سے مطمئن رہوں گا کہ اس کی وہی حیثیت باقی رہے جو شمالی ہند میں گذشتہ 2000 سال سے اسے حاصل رہی ہے۔ تیلگو، تامل، گجراتی اور بنگالی زبانیں بھی اتنی ہی ہندستانی ہیں جتنی ہندی۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں ان صوبوں میں اپنے بچوں کو تیلگو، تمل، گجراتی یا بنگالی کے ذریعے تعلیم دوں تو میں اس کا برا مانوں گا۔

غلام السیّدین

مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ دوسرے ان تمام مسائل کی طرح، جن کا تعلق مجموعی طور پر اس طویل و عریض ملک سے ہے، کئی طرح کی مشکلات کا باعث بن رہا ہے اور یہ مزید پیچیدگی اس وقت اختیار کر لیتا ہے جب بے جا تعصبات، غلط فہمیاں اور ضد جیسی چیزیں راہ پا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ قنوطیت پسند واقع ہوئے ہیں یا منفی رجحان کے حامل ہیں، ان کا سوچنا یہ ہے کہ چونکہ اس ملک میں بہت سے لسانی گروہ آباد ہیں اس لیے یہاں کوئی مشترکہ زبان نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کے اس نقطۂ نظر کی تائید نہ تو تاریخی حقائق کرتے ہیں اور نہ وہ اصول جن کے تحت زبانیں ارتقاپذیر ہوتی ہیں۔ زبانیں بہر حال خیالات کے اظہار اور تبادلے کا ذریعہ ہوتی ہیں اور جب عوام کے مختلف حلقے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور زندگی کی روزمرہ کی ضروریات اس بات کے لیے مجبور کرتی ہیں کہ ایک دوسرے سے سماجی سطح پر رابطہ قائم کیا جائے تو قدرتی طور پر وہاں اظہار کا ایک مشترکہ ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ برطانیہ یا فرانس جیسے چھوٹے ممالک بھی کسی زمانے میں مشترکہ زبان کو فروغ نہیں دے سکے تھے لیکن مواصلات کے فروغ اور ملک کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے درمیان بڑھتے ہوئے رابطوں کے ساتھ ساتھ ایک مشترکہ زبان حالات کے تقاضوں کے تحت خود بخود وضع کر لی گئی۔ لہٰذا ایسا سوچنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ محض اس بنیاد پر کہ ہندستان تنوع اور رقبے کے اعتبار سے ایک بہت بڑا ملک ہے اس لیے وہ اس کا متحمل نہیں

ہو سکتا لہٰذا اسے ایک مشترکہ زبان کے فوائد سے محروم کر دینا چاہیے۔

بہر حال یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر یہ درست ہے کہ سماجی میل جول اور بڑھتے ہوئے رابطوں کے تحت ناگزیر طور پر ایک مشترکہ زبان وجود میں آجاتی ہے تو پھر ہندستان ایسی زبان وضع کرنے میں اب تک ناکام کیوں رہا؟ اس کی وجہ معلوم کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ ماضی میں جغرافیائی فاصلے، مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان آسانی سے رابطہ قائم کرنے کی راہ میں مانع رہے۔ لہٰذا ہمہ گیر نوعیت کی مشترکہ زبان کو فروغ دینے کے لیے حالات سازگار نہ تھے لیکن اب جبکہ سائنس نے ان فاصلوں پر قابو پالیا ہے اور رسل ورسائل کے تیز رفتار ذرائع نے سفر کو آسان بنادیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ جلدی جلدی آجا بھی سکتے ہیں تو ایسی زبان کو فروغ دینے کے لیے حالات زیادہ سازگار ہوگئے ہیں۔

لیکن ماضی میں بھی ایک اعتبار سے کوئی نہ کوئی مشترکہ زبان ہمیشہ ہی رہی۔ برطانوی دور حکومت سے پہلے کے زمانے میں فارسی مشترکہ زبان کا رول ادا کرتی تھی۔ ہاں یہ درست ہے کہ یہ عوام کے چھوٹے سے حلقے تک محدود تھی سرکاری ملازمین، عدالتوں سے وابستہ حلقوں اور تعلیم یافتہ افراد کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جن کے کسی وجہ سے بین صوبائی رابطے تھے۔ ظاہر ہے انھیں ایک مشترکہ زبان کی ضرورت تھی۔ اب بھی دیکھیے: تعلیم یافتہ حلقوں کی ایک مشترکہ زبان موجود ہے یعنی انگریزی اور اگر قومی زندگی کو اس تعلیم یافتہ اقلیت کے مفادات اور مسائل کے تنگ دائرے تک محدود کردیا جائے تو انگریزی اسی طرح آئندہ بھی اپنا رول ادا کرتی رہے گی۔ یہ تعلیمی اعتبار سے غیر صحت مند اور سیاسی اعتبار سے قابلِ اعتراض بات ہوگی لیکن یہ ایک قابلِ غور تجویز ہو سکتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اشارہ کیا کہ تکنیکی اور سائنسی ترقیات اپنے دامن میں بڑی دور رس نوعیت کی سماجی اور سیاسی تبدیلیاں لائی ہیں اور تمام ممالک کے لوگوں کو اس طرح ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ یہ صورتِ حال پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس نے لوگوں کے سیاسی شعور کو بڑھاوا دیا ہے اور اس ضرورت کا

احساس دلایا ہے کہ عوام کے ہر طبقے کے لوگوں کے مسائل کا مطالعہ کیا جائے اور انھیں سمجھا جائے۔ جمہوری اداروں کے فروغ نے لمبی مدت سے نظر انداز کیے گئے "عام آدمی" کو منظر عام پر لا کھڑا کیا، سیاسی حقوق عطا کیے تیز تعلیم و ثقافت کے فروغ کے لیے سہولیات مہیا کیں۔ کسی زمانے میں یہ نعمتیں اعلیٰ طبقوں تک محدود تھیں لیکن اب عام آدمی بھی ان سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ آج عام آدمی کو بھی اسی شدت سے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت ہے جس شدت سے ماضی میں تعلیم یافتہ اقلیت کو تھی کیونکہ قومی زندگی سے متعلق پالیسی اور پروگرام ترتیب دینے میں اسے بھی اپنا رول ادا کرنا ہے۔ آج کے نئے سماجی، سیاسی اور سائنسی منظر نامے میں مشترکہ زبان کے لیے شروع کی گئی تحریک کو مزید تقویت دی جا رہی ہے۔ تعلیم اور مواصلات کی سہولیات کے ساتھ ساتھ اس رجحان میں بھی شدت آئے گی جسے روکا نہیں جا سکے گا۔

اس پر "روک" تو یقیناً نہیں لگائی جا سکے گی لیکن اگر حالات کے قدرتی بہاؤ کا راستہ روکنے کے لیے سیاسی اور فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی تو اسے آسانی سے پٹری سے ہٹایا جا سکتا ہے، تاخیر ہو سکتی ہے یا پھر اسے غلط سمت میں موڑا جا سکتا ہے۔ مانا کہ ایک مشترکہ زبان کو فروغ دیا جا سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ کون سی زبان "ہونی چاہیے؟" اس سیاق و سباق میں "ہونی چاہیے" ایک مشکوک سی بات ہوئی کیونکہ اس معاملے میں یہ سوال ذاتی پسند یا ناپسند پیش کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ اگر انگریزی یا پشتو یا چینی زبان کے لیے میری کوئی خاص کمزوری ہے تو میں اچھی طرح بحث نہیں کر سکتا کہ اسے مشترکہ زبان بنایا جائے۔ سوال یوں کیا جائے تو شاید بہتر ہو "وہ کون سی زبان ہو سکتی ہے؟" یعنی یہ کہ موجودہ حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے معقولیت پسندی سے سوچا جائے کہ معینہ مدت میں کس زبان کے مشترکہ زبان بننے کا امکان موجود ہے۔ اب یہ بات واضح ہو جائے گی کہ پہلی شرط جو اس زبان کو پوری کرنی چاہیے وہ یہ ہوگی کہ وہ ملک کے سب سے بڑے لسانی گروہ کی بول چال کی زبان کے طور پر پہلے ہی سے رائج ہو۔ مثال کے طور پر

بنگالی، تمل اور گجراتی پورے طور پر ترقی یافتہ اور ترقی پسند زبانیں ہیں لیکن وہ خاص جغرافیائی خطوں تک محدود ہیں اور انھیں بولنے والوں کی تعداد نسبتاً چھوٹی ہے۔ لہٰذا ان زبانوں کے تو مشترکہ زبان بننے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔۔۔ اس کے برعکس "ہندستانی" ایک ایسی زبان ہے جسے اب بھی ہندستان کی پوری آبادی کا نصف سے زائد حصہ بولتا اور سمجھتا ہے۔ اس کو جو مقبولیت حاصل ہے اور جتنے بڑے علاقے کا یہ احاطہ کرتی ہے اس اعتبار سے کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جن صوبوں میں پورے طور پر ترقی یافتہ مقامی زبانیں موجود ہیں وہاں بھی اس کی مقبولیت کا اندازہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی کو ایک سوال کے جواب میں موصول ہونے والے خطوط سے کیا جا سکتا ہے۔ سوال تھا۔ "آپ کس زبان میں نشریات کو ترجیح دیتے ہیں؟" جواب کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

ہندستانی.......2567

گجراتی......... 1742

مراٹھی..........1559

دوسرے لفظوں میں غیر "ہندستانی" والے صوبوں میں بھی 40 فیصد افراد نے ہندستانی میں نشر ہونے والے پروگراموں کو پسند کیا۔ ایک اور سوال کیا گیا۔ "اگر ایک ہی زبان میں پروگرام نشر کیے جائیں تو آپ کس زبان کو ترجیح دینگے؟" 3650 افراد نے ہندستانی کے حق میں رائے دی جبکہ گجراتی اور مراٹھی کے حق میں مجموعی طور پر 1755 افراد نے ووٹ دیے۔ گویا ہندستانی کے حق میں 70 فیصد ووٹ پڑے۔ یعنی زبردست اکثریت نے اسے پسند کیا۔ کلکتہ کے 3559 سامعین نے ہندستانی کے حق میں اور صرف 399 نے بنگالی کے حق میں ووٹ دیے۔ مدراس کے جن لوگوں نے ہندستانی کو ترجیح دی ان کی تعداد 3325 تھی جبکہ تیلگو اور تمل کے حصے میں مجموعی طور پر صرف 613 ووٹ آئے۔ حالیہ دنو ں میں صوبائیت اور لسانی عصبیت کا جو فروغ ہوا ہے اسے اگر ذہن میں رکھ کر صورت حال پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اعداد و شمار اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ

ہندستانی ہندستان کی لینگوا فرینکا ہے۔

اب میں اس مسئلے کے آخری پہلو کی طرف آتا ہوں جو اس وقت سب سے زیادہ متنازعہ ہے اور جو تعصبات اور غلط توضیحات سے مزید پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ ہندستانی ہے کیا؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسی کسی زبان کا وجود ہی نہیں ہے اور یہ کہ یہ ایک ایسا نام ہے جسے ان لوگوں نے ایجاد کیا ہے جو اس کا پروپگنڈا کر کے اس کے پردے میں اپنی بدنیتی کو چھپانا چاہتے ہیں تاکہ بھولے بھالے لوگوں پر اپنی پسند کی زبان تھوپ سکیں۔ اردو کے حامیوں کو یہ خوف لاحق ہے کہ کسی دن صبح اٹھتے ہی انھیں یہ پتہ چلے گا کہ ان پر ہندی تھوپ دی گئی ہے۔ ہندی کے حامی اس شک میں مبتلا ہیں کہ ہندستانی کے پردے میں اردو کو مشترکہ زبان بنایا جارہا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے اس سنسکرت آمیز ہندی سے خلط ملط کر رہے ہیں جسے حالیہ برسوں میں فروغ دیا گیا ہے جبکہ کچھ لوگ "خالص پسندی" کے قائل ہیں اور وہ مشترکہ زبان کے حق میں خالص ہندی یا خالص اردو کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسی کوئی زبان مشترکہ زبان بننے کی اہل نہیں ہو سکتی جو ملک کے دونوں بڑے اور اہم فرقوں ـــــ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی اختلاط کے نتیجے میں وجود میں نہ آئی ہو اور جس کے فروغ میں دونوں کا بھرپور تعاون شامل نہ رہا ہو۔ ہندستانی زبان دو ضروری شرائط پوری کرتی ہے۔ اوّل یہ کہ یہ پورے ہندستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ سنسکرت اور فارسی دونوں کی لسانی روایات کی آمیزش سے وجود میں آئی ہے۔ ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں اور سماجی اور اقتصادی سطح پر مشترکہ سرگرمیوں سے جڑے بھی رہے ہیں لہٰذا انھوں نے روزمرّہ کے استعمال کے لیے اسے ایک شاندار، لچکدار اور حساس ذریعۂ اظہار کے طور پر اختیار کیا۔ یہ زبردست قوت تاثیر کی بھی حامل ہے کیونکہ یہ درباروں یا علمی اداروں کی نسبتاً کمزور فضا کی پروردہ نہیں ہے بلکہ اس نے گانووں اور بازاروں سے زندگی پائی ہے اور اس کا دامن لوک

گیتوں، شاعری اور عام مردوں اور عورتوں کے جذبات و احساسات کا گہوارہ ہے۔ یہاں کوئی تلخ گو نقاد یہ سوال اٹھا سکتا ہے۔ "تو پھر اتنا حوصلہ کیوں نہیں پیدا کیا جاتا اور اسے اردو یا (ذاتی میلان کے مطابق) ہندی کیوں نہیں کہا جاتا"؟ جواب یہ ہے کہ ہندستانی اس لیے ہندی نہیں کہی جا سکتی کہ جدید ہندی زبان کو "خالص" بنانے کی دھن میں عربی اور فارسی کے الفاظ کو نکالا جا رہا ہے اور پھر یہ عوام کے کسی قابل ذکر حلقے کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہندو مسلم تعاون کے نتیجے میں وجود میں آنے کی شرط بھی پوری نہیں کرتی۔ بلاشبہ یہ اردو سے زیادہ قریب ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ تنگ نظر ہندو یا مسلمان کچھ بھی کہتے رہیں لیکن کوئی بھی ایمانداری سے اس بات کی تردید نہیں کر سکتا کہ اردو زبان کو فروغ دینے اور اسے مالا مال بنانے میں ہندو شعرا و ادبا نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ مزید برآں اردو اپنی تاریخ کے ہر موڑ پر کشادہ دل رہی اور اس نے کھلے دل سے مختلف زبانوں سے الفاظ مستعار لیے اور اس طور پر اپنے آپ کو توانا اور قوتِ اظہار کا حامل بنایا۔ لیکن اپنی ادبی وابستگیوں کے باعث اس کا جھکاؤ اکثر عربی اور فارسی کے الفاظ کی طرف رہا جن میں سے کچھ پر عوامی مقبولیت کی مہر نہ لگ سکی۔ لیکن اب ایک خوشگوار رجحان یہ نظر آنے لگا ہے کہ بعض وہ ادیب بھی جو کبھی بڑی آراستہ اور پُر تصنع زبان لکھنے کے قائل تھے، اب آسان اور سادہ زبان لکھنے کی طرف مائل ہوئے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ تحریری زبان بول چال کی زبان کے قریب آسکے۔ ترقی پسند مصنفین میں ہندی سے الفاظ لینے کا رجحان خاصہ نمایاں ہے اور اگر فرقہ وارانہ تعصبات راہ میں حائل نہ ہوئے ہوتے تو اردو اور ہندی کی آمیزش کا عمل کافی تیزی اور آسانی سے آگے بڑھتا۔ بہر حال اس کے باوجود ہندی اور اردو کے درمیان اب بھی بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ بلاشبہ یہاں اس مصنوعی ہندی کی بات نہیں ہو رہی ہے جسے کچھ ملک دشمن حلقے عربی اور فارسی کے ان تمام عناصر سے پاک کر دینا چاہتے ہیں جن سے ماضی میں یہ فیضیاب ہوئی تھی۔ یہاں اس طمطراق والی اردو کا بھی ذکر

نہیں ہے جسے کچھ طہارت پسند اور عاقبت نااندیش اردو والے بے وجہ عربی اور فارسی کے ایسے مشکل الفاظ سے بوجھل بنادینا چاہتے ہیں جن کے آسان مترادفات خود ہندستانی زبان میں موجود ہیں۔ بلکہ یہاں اس اردو اور ہندی کا ذکر ہورہاہے جو گذشتہ کئی صدیوں تک معمول کے مطابق قدرتی طور پر ارتقاپذیر ہوئی ہیں۔ خلافت اور عدم تعاون تحریک کے ابتدائی دنوں میں جب مشترکہ مقاصد کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوشگوار قسم کا باہمی تعاون کا ماحول پیدا ہوا تھااور جب سیاسی کارکن اس بات کے لیے بے چین تھے کہ ان کی باتیں عوام کے وسیع تر حلقے میں سمجھی جائیں، تو آمیزش کا یہ عمل غیر شعوری اور ناگزیر طور پر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بعد کے کچھ واقعات نے اس عمل کو دھکا پہنچایا لیکن اسے مستقل ناکامی تصور کرنا غیر ضروری قنوطیت پسندی ہوگی۔ جو لوگ لسانی ارتقا کی نفسیات کا ادراک رکھتے ہیں انھیں یقین کے ساتھ یہ سوچنا چاہیے کہ جب موجودہ تلخی اور تصادم کے بادل چھٹ جائیں گے تو وہ عمل دوبارہ شروع ہوجائے گا۔ دوسرا عامل، جس کا حوالہ میں پہلے ہی دے چکا ہوں اور جو اس عمل کو کافی توانائی عطا کرے گا، وہ ہے سیاسی زندگی کا پھیلاؤ جس نے عوام کے بہت بڑے حلقے کو سیاسی حدِ ادراک کے اندر لا کھڑا کیاہے۔ اب ان "سیاسی شرفا" کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ اپنی تقریروں اور پروپگنڈے کو اپنے ایک منتخب حلقے تک محدود رکھیں۔ انھیں اب اپنادائرہ کار بڑھانا ہوگااور ان لاکھوں عوام سے رابطہ قائم کرناپڑے گاجو گانوؤں میں رہتے ہیں، کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں اور جو اپنے رہنماؤں کی اس زبان کو نہیں سمجھ پاتے جو بڑی شستہ اور شائستہ ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو مصنوعی اور کتابی بھی ہوتی ہے۔ وہ زمین کے لوگ ہیں اوران کی زبان بھی زمینی ہونی چاہیے :قدرتی، حقیقت پسندانہ، واضح اور آسان۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ بقا کی کسوٹی یہی ہے۔ سیاسی زندگی کے فروغ کے ساتھ جب یہی کسوٹی باقاعدہ کام کرنا شروع کردے گی تو بول چال کی زبان اور اخباروں کی زبان، بہر حال قدرتی سلاست کی طرف لوٹ جائے گی اور جن الفاظ کو زبردستی نکالا

جارہا ہے یا جنھیں زبردستی داخل کیا جارہا ہے، ان کے حقیقی مقام کا پتہ چل جائے گا کہ انھیں ہندستان کی مشترکہ زبان کے ذخیرۂ الفاظ کے اندر رہنا ہے یا باہر۔ بلاشبہ یہ زبان شاعری یا ادب کے معاملے میں ادبی ہندی یا ادبی اردو کی جگہ نہیں لے سکتی کیونکہ اہلِ نظر کے اپنے قانون ہوتے ہیں اور شاعر، ناول نگار اور مفکر پر کسی خاص اسلوب یا خاص طرز کی زبان نہیں لادی جاسکتی۔ لیکن معمول کی اور روزانہ کی گفتگو نیز تحریری شکل میں عام خیالات کے اظہار کے لیے ایک مشترکہ زبان یعنی ہندستانی مرکزیت کی حامل زبان ہوگی جو ابتدائی دور کی ہندی کے بہت قریب اور آسان اردو کے قریب تر ہے اور جو اس طور پر فروغ پائے گی کہ ان رابطوں کو استوار کرسکے اور کرے گی جن کے تحت اس عظیم ملک کے لوگ متحد ہوسکیں گے۔ اب یہ ہمارے ادیبوں، مقرروں اور اساتذہ کا کام ہے جنھیں اس ملک کا مستقبل عزیز ہے کہ وہ اسے اس منزل تک پہنچانے کی جدوجہد کریں۔

☆☆☆

سمترا نندن پنت

اس ملک کے تعلیم یافتہ افراد عام طور سے اس بات پر متفق ہیں کہ ہندستان کو ایک قومی زبان کی ضرورت ہے۔ایک زبان کی ضرورت کا احساس واضح طور پراس لیے پیدا ہوا کیونکہ قومی آزادی کے جذبے نے استحکام حاصل کرلیا ہے لیکن اس بات پر ابھی باقاعدہ طور پر غور نہیں کیا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ ہندی۔اردو یا ہندستانی کے تنازعے کی شکل میں جو مسئلہ سامنے آیا ہے،اسے کس حد تک حل کیا جاسکے گا۔

یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ بنگالی، گجراتی ،مراٹھی اور جنوب کی ترقی یافتہ زبانوں اوران کے شاندار ادب کی موجودگی کے باوجود قومی زبان کا مسئلہ ہندی —اردو کے سوال اوراس کی ہمہ جہت پیچیدگیوں سے وابستہ ہوگیا۔ایسا کیوں ہوا،اس پر بہت احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے دو خاص وجوہ ہیں۔

(1)اس حقیقت کا ادراک کہ دراوڑی زبانوں کو چھوڑ کر ہندستان کی باقی تمام صوبائی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں۔

(2)ہندو اور مسلمان تہذیبوں کے درمیان جو نفرت تھی اور جو ابھی تک دبی ہوئی تھی،وہ عام سیاسی بیداری پیدا ہونے کے باعث کھل کر ٹکراؤ کی شکل میں سامنے آگئی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مراٹھی، گجراتی اور بنگالی جیسی صوبائی زبانیں بنیادی طور پر اسی کلچر کی نمائندگی کرتی ہیں جس کی نمائندہ ہندی ہے کیونکہ یہ تمام زبانیں براہِ راست

سنسکرت ہی سے نکلی ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر ان زبانوں کی طرف سے ہندی کے قومی زبان بنائے جانے کے خیال کی شدید مخالفت نہیں ہو رہی ہے۔ بنگالی، چونکہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے اس لیے اس کی جانب سے کچھ مزاحمت ہوئی اور یہ اصرار کیا گیا کہ اسی کو مشترکہ زبان بنایا جائے۔ لیکن ہندی کو چونکہ زبردست مقبولیت حاصل ہے اور یہ نسبتاً آسان بھی ہے نیز یہ کہ ہندی بولنے والوں کی آبادی بہت بڑی ہے اور بنگالی کے تلفظ میں کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں، اس لیے بنگالی کا دعویٰ پیچھے رہ گیا۔ اردو کی جڑیں بہر حال عربی اور فارسی میں پیوست ہیں اور یہ ایک مختلف تہذیب کی نمائندہ ہے۔ یہی وہ اصل وجہ ہے جو اسے قومی زبان بنائے جانے کے راستے میں ایک ایسی رکاوٹ ہے جسے دور کرنا ناممکن ہے۔ حقیقت میں ہندی اور اردو کے درمیان جو باہم تضاد ہے وہ دو مختلف تہذیبوں کا تضاد ہے جس کا اظہار ہماری قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہوتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو تہذیبی فرق ہے اسے نظر انداز کر کے ہمارے سیاست دانوں نے مسئلے کا ایک آسان ساحل یہ تلاش کیا ہے کہ ہندستانی کو فروغ دیا جائے جو ہندی اور اردو کی آمیزش کی علامت ہے۔ اس طرح کا بے سر پیر کا جو حل پیش کیا جاتا ہے اسے اس سے زیادہ کامیابی نہیں مل سکتی کہ انڈین نیشنل کانگریس اس کے وسیلے سے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی وجہیں مندرجہ ذیل ہیں ـــــ

(1) علم صوتیات کے مطابق سنسکرت کا جو آوازوں کا نظام ہے وہ عربی اور فارسی کی آوازوں کے نظام سے مختلف ہے۔ نتیجے کے طور پر یہی فرق ہندی اور اردو کی آوازوں کے نظام میں بھی در آیا۔ کسی بھی زبان کی شاعری یا تخلیقی ادب کا سب سے بڑا سہارا اگر موسیقی کی لطافت اور زیر و بم کا حسن ہوتا ہے تو پھر صوتی آہنگ کے تقاضوں کے پیش نظر سنسکرت، فارسی اور عربی عناصر کی حامل دوغلی زبان ہندستانی، کبھی بھی اعلیٰ شاعرانہ اظہار کا وسیلہ نہیں بن سکتی۔

(2) نثر میں بھی دیکھا جائے تو عام مکالموں یا آسان بیانیہ اور کہانیوں کے دائرے سے ہم

جیسے ہی نکلتے ہیں تو سنجیدہ یا باریک نوعیت کی تحریر کے لیے ہمیں سنسکرت فارسی یا عربی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اگر ہماری زبان سے سنسکرت، عربی یا فارسی کے الفاظ نکال دیے جائیں تو جو کچھ باقی بچے گا اس سے ہماری بات چیت کی، یا دوسری معمولی ضروریات تو پوری ہو سکتی ہیں لیکن ادبی یا علمی کاموں کے لیے یہ بالکل ہی ناقص ثابت ہو گی۔ نہ تو یہ کالی داس اور بھو بھوتی کے کرداروں کو زبان عطا کر سکے گی اور نہ غالبؔ اور ذوقؔ کو اظہار کا وسیلہ فراہم کر سکے گی۔ اس طرح کی زبان اقبالؔ اور رویندر ناتھ ٹیگور کے افکار کو اظہار کی قوت نہیں عطا کر سکتی۔ سائنسداں، مورخین اور سیاست داں کے لیے بھی یہ کار آمد نہیں ثابت ہو سکتی۔

لہٰذا موجودہ حالات میں مناسب یہی ہے کہ ہندی اور اردو کو بخش دیا جائے تاکہ اپنی الگ الگ شناخت قائم رکھتے ہوئے وہ ارتقاپذیر ہوتی رہیں۔ درایں اثنا ہندی بولنے والوں کو چاہیے کہ اپنی اردو کی معلومات میں اضافہ کریں اور اردو والے کچھ اور زیادہ ہندی سیکھیں۔ اُس وقت تک ایک قومی زبان کا سوال اٹھانا فضول ہے جب تک کہ ہندو اور مسلمان ایک اعلیٰ اور وسیع تر کلچر میں شامل ہو کر تہذیبی یک رنگی حاصل نہیں کر لیتے۔ اور یہ صورت حال سیاسی آزادی حاصل کر لینے کے بعد پیدا ہو گی۔'

اس طرح یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں لسانی یکجہتی کا معاملہ وسیع تر تہذیبی یکجہتی کے مسئلے سے جڑا ہوا ہے اور صرف ہندستان ہی کیا پوری دنیا کو مستقبل قریب میں اپنی تہذیبی اقدار کو از سر نو پرکھنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ ہمارا دور سائنس اور فلسفے کا دور ہے۔

یہ مشینوں کی مقبولیت اور ان کے حسن کا زمانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مشین کے ہاتھوں دنیا کا چہرہ بدل رہا ہے۔ مشینوں نے فاصلے کم کیے اور متصادم نسلوں، تہذیبوں اور قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کیا۔ ایک سائنسی اور انسانی تہذیب کی تشکیل کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کو اپنی ثقافتی بنیادوں میں زبردست تبدیلی لانا ہو گی جس میں

مختلف اقوام کے کلچر بنیادی مشترکہ اقدار کے ساتھ ایک قومی انداز کے کلچر کی شکل میں جلوہ گر ہوں گے۔ اسی عالمی تہذیب کے تحت جو بنیادی نوعیت کے مختلف سماجی حالات پر مبنی ہوگی ہندو اور مسلمان کلچر اپنی اپنی شناخت ختم کر کے ایک ہو جائیں گے۔ اسی وقت صحیح معنوں میں ثقافتی اور سیاسی سطح پر ہندو مسلم یکجہتی قائم ہوگی اور اسی وقت یہ ممکن ہو سکے گا کہ ملک کے لیے ایک قومی زبان وضع کی جائے۔

مستقبل میں ہندستان کی جو بھی قومی زبان ہوگی، اس میں سنسکرت عناصر کی تعداد بہر حال بہت بڑی ہوگی جس کے حسن اور موسیقی سے پورے ملک کے ادیب فیضان حاصل کریں گے۔ ممکن ہے جنوبی ہند کے ادیب مستثنیٰ رہیں۔ لیکن یہ نئی زبان اپنی روح کے اعتبار سے قدیم سنسکرت سے مختلف ہوگی۔ جاگیردارانہ دور کی زوال پذیر قدروں اور محدود قسم کے شخصی نظریات والی تہذیب سے اس کا کوئی علاقہ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ فکر و اظہار کا ایک ایسا مضبوط، متحرک اور سماجی اعتبار سے کار آمد وسیلہ ثابت ہوگی جو عربی، فارسی، اور دوسری زبانوں سے اپنی بنیادی نغمگی اور حسن کو مجروح کیے بغیر آزادانہ طور پر الفاظ مستعار لے گی۔ یہ ہندو مذہب کی انفرادیت کی عکاس نہیں رہ جائے گی اور مذہبی کردار ختم ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے وہ مسلم تہذیب کے قریب آجائے گی۔ درحقیقت یہ ایک صحت مند انسان دوستی کی علامت بن جائے گی۔

اسی طرح کی قومی زبان ایک ایسا عامل ثابت ہو سکتی ہے جو دوسرے اہم عوامل کی طرح ملک کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں اپنا نمایاں رول ادا کر سکے۔ اور جب یہ زبان اپنا وہ مقام حاصل کر لے گی تو لوگ اسے پڑھنے میں اسی طرح فخر محسوس کریں گے جس طرح آج ایک غیر ملکی زبان انگریزی پڑھتے وقت محسوس کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ چند صدی بعد جب اشتراکیت اور مشینی تہذیب کا فروغ علاحدہ قومی کلچر کو برقرار رکھنے کی مرغوبیت کو ختم کر چکا ہو تو انسانیت ایک نئی کروٹ لے اور ایک

بین اقوامی زبان وضع کرنے کی کوشش کرے کیونکہ مستقبل کا عالمی نظام انسان اور انسان کے درمیان حائل مصنوعی دیواروں کو ڈھادے گا اور اس طرح ایک نئی زبان کی ضرورت پیدا ہو جائے گی جو انسانی زندگی کے نئے تقاضوں کو بحسن وخوبی پورا کر سکے گی۔

موجودہ حالات میں ہمیں یہ بات بہر حال نہیں بھولنی چاہیے کہ ہماری قومی زبان کے مسئلے کا ہماری تہذیبی یکجہتی کے مسئلے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ یکجہتی ہماری سیاسی آزادی کے بعد ہی آئے گی جو اشتراکیت اور مشین کے ذریعے لائی گئی برکتوں پر مبنی ہوگی نہ کہ ماضی کے فرسودہ خیالات پر جن کی آج کوئی اہمیت نہیں۔ مختصر یہ کہ انسانیت کا مستقبل سائنس، مشینوں اور زندگی کی اشتراکی تعمیر نو کے ہاتھ میں ہے۔

☆☆☆

محمد دین تاثیر

سب سے اچھی اور مثالی بات تو یہ ہوگی کہ دنیا میں صرف ایک ہی زبان ہو۔ لیکن حقائق یہ ہیں (دنیا کو تو اس کے حال پر چھوڑیے) کہ ہندستان کی لسانی تاریخ کے بالکل ابتدائی زمانے سے ہی بولیوں کے کم از کم دو قبیلے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ نام نہاد ہند آریائی گروپ میں بھی یہی صورت حال رہی۔ اس سے پہلے آسٹری (Austric) اور دراوڑی زبانیں تھیں۔ دراوڑی نے آسٹری کو نکال باہر کیا لیکن دراوڑی سے قبل کا ذخیرۂ الفاظ اب بھی باقی ہے۔ ہند آریائی نے دراوڑی کو جنوب کی طرف دھکیل دیا اور اگرچہ شمال میں دراوڑی کے لسانی اثرات زوال کا شکار ہو گیے لیکن جنوب کا یہ اٹوٹ حصہ بن گئی۔ لیکن یہ تمام باتیں ما قبل تاریخ کی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ سنسکرت کی پیدائش، پرورش و پرداخت ہندستان سے باہر ہوئی۔ اس کے پہلو بہ پہلو فارسی کی اپنی ایک آزاد تاریخ ہے لیکن لمبے عرصے سے بچھڑی ہوئی ان بہنوں کی اولادوں نے بالآخر ہندستان میں آکر ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف جہاں سنسکرت کے حروف تہجی اصلاً سامی (جنوبی عرب) ہیں وہاں فارسی نے صدیوں بعد عربی کے اصلاح شدہ رسم خط کو اپنا لیا۔ یکجہتی اور تنوع کی کتنی مثالیں موجود ہیں لیکن زبانوں کی فراوانی کے باوجود جو ہر گروپ کا احاطہ کر لیتی ہیں، ہمارے عوام ان باتوں سے ناآشنا اور لاعلم ہیں۔

یہ بڑی پیچیدہ صورتِ حال ہے۔اب اس میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی الجھنیں اور پیچیدگیاں بھی جوڑ دیجیے۔ابتر ہوتے ہوئے اس منظر کی ڈور اُن دیکھے ہاتھوں میں ہے۔طاقتور غیر ملکی اور مقامی استحصالی طبقے دن رات، لوگوں کو رجھانے، دہانے، اُکسانے اور بھڑکانے میں مصروف ہیں۔گویا وہ اپنے ڈھنگ سے کٹھ پتلی کا تماشہ دکھا رہے ہیں۔

چنانچہ یکجہتی اور قوم پرستی کی اس خیالی بحث میں پڑنا فضول ہے۔لسانی صورتِ حال ایک ٹھوس مسئلہ ٹھوس طریقے سے پیش کر رہی ہے لہٰذا ہمیں ٹھوس طریقے سے اس سے نمٹنا بھی پڑے گا۔

سب سے پہلے تو اردو ہندی مخاصمت کو لیجیے۔یہ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ یہ کہیں موجود نہیں ہے یا یہ کہ اسے خصوصی مفادات کے حامل حلقوں نے پیدا کیا ہے۔یہ ہر جگہ موجود ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ غیر ملکی حکمرانی اور خصوصی مفادات کے حامل حلقوں کا پیدا کردہ ہے لیکن ہماری تو بہت ساری مشکلات اُنہی کی پیدا کردہ ہیں۔لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بالکل زندہ ہے اور کچوکے لگا رہا ہے۔ہم اپنی آنکھیں بند کر کے اور اس کے وجود سے انکار کر کے اسے ختم نہیں کر سکتے۔حال میں یہ مسئلہ موجود ہے اور ماضی میں اس کی ایک تاریخ تھی۔

فارسی بولنے والوں کی آمد سے قبل شمالی ہند لسانی سطح پر ابتری کا شکار تھا۔بولیاں زبانوں سے الجھ رہی تھیں۔جب مرکزی ریاست مستحکم ہو گئی تو وسطی خطے کی سورسینی بولی کو جو ہندستان کی راجدھانی دلی کے آس پاس بولی جاتی تھی، قدرتی طور پر بالادستی حاصل ہونے لگی۔اس فروغ پذیر زبان میں فارسی الفاظ کا شامل ہونا بھی قدرتی تھا۔اس زمانے کے ہندستانی افسران نیز دوسرے تعلیم یافتہ حلقوں نے نئی درباری زبان کے الفاظ کو بخوشی اپنی زبان میں داخل کر لیا۔آج بھی کچھ اسی طرح کا عمل جاری ہے۔اب اس کی جگہ انگریزی الفاظ نے لے لی ہے۔اُس زمانے میں فارسی کا ذخیرۂ الفاظ تھا۔آج ہم انگریزی آمیز ہندستانی پر ہنستے ہیں اور انگریز ہمارے گریجویٹ بابوؤں کی "ہندستانی انگریزی" پر ہنستے ہیں۔اس وقت کچھ

یہی صورتِ حال فارسی آمیز ہندستانی اور ہندستانی آمیز فارسی کی تھی۔ زبانوں کی آمیزش کا یہ عام اصول ہے (بحوالہ Windisch's "Zur Theorien der Mischsprachen und Lehnworter") کہ "ایسا نہیں کہ قوموں کے غیر ملکی زبان سیکھنے سے ان کی زبان مخلوط ہو جاتی ہے بلکہ خود ان کی زبان، غیر ملکی زبان کے زیر اثر آمیزش قبول کر لیتی ہے"۔ یہ کوئی سیاسی دباؤ کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ لسانیات کا ایک اصول ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جرمن بادشاہ فریڈ ریک اعظم کی فرانسیسی تحریروں میں جرمن کا ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے لیکن خود جرمن زبان فرانسیسی زبان اور محاوروں سے بھری پڑی ہے۔ یہی بات افغانوں اور مغلوں کے دور میں ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقے پر بھی صادق آتی ہے۔ عوام ثقیل الفاظ نہیں استعمال کرتے تھے۔ ان کی ضرورت کے لیے فارسی کی سیاسی، عدالتی اور درباری اصطلاحیں کافی تھیں (فارسی کے یہ الفاظ تمل تک میں موجود ہیں) لیکن سورسینی بولی کافی دور دور تک پھیل گئی۔ یہاں تک کہ وسطی اور شمالی ہند کی لینگوا فرینکا بن گئی اور یہ جنوبی ہند، اور مشرقی بنگال کے شہروں اور قصبوں تک میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ "ہندستانی" بن گئی۔ مغل بادشاہوں اور نوابوں کی بھی بول چال کی زبان یہی بنی۔ دلی کے آخری بادشاہ اور اودھ کے آخری فرماں روا نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس مشترکہ زبان میں خوب شعر کہے۔ لیکن میں ان طاقتوں کو بھولا جا رہا ہوں جو اپنے ڈھنگ سے کام کر رہی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے حکام اس آمیزش کے عمل کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ میں یہاں سر چارلس جیمس لیال، کے سی ایس آئی سی آئی ای (Sir Charles James Lyall, K.C.S.I., C.I.E.) کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہندستانی کا ہندی روپ، اردو نثر کے ساتھ ہی ساتھ فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ نے ایجاد کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس ہندستانی کو ہندو استعمال کریں"۔ اس کے بعد سے یہی ہوتا رہا۔ اس کی ایک شکل ہندوؤں کے لیے تھی اور ایک مسلمانوں کے لیے۔

میں جانتا ہوں کہ اس پر بڑی شد و مد سے تبصرہ کیا جائے گا کہ یہ جو الگ الگ راستے

بنا دیے گئے انھیں پھر سے ایک کیوں نہ کر دیا جائے؟ لیکن کہنا زیادہ آسان ہے کرنا مشکل۔ لیکن ہندستان میں عدم اتحاد کا یہی ایک نقطہ نہیں ہے۔ کلچر ایک بڑا ڈھانچہ ہوتا ہے اور زبان اس کا چھوٹا سا حصہ ہوتی ہے جو اسی کلچر کی محض ترجمان ہوتی ہے۔ (یورپ میں کئی زبانوں کے باوجود کلچر کی سطح پر ایک طرح کا اتحاد موجود ہے) ہمارے یہاں جو اختلافات ہیں وہ زبانوں سے متعلق مشکلات کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔

"اردو" اور "ہندی" میں ہندستانی کی تقسیم حقیقتاً وقت کی ایک نشانی ہے۔ جہاں تک اردو (ہندستانی) بول چال کی زبان رہی اور شاعری اور آسان نثر کا وسیلہ بنی رہی وہاں تک تو کوئی فرق نہیں تھا لیکن جب زبان نے ترقی کی اور اعلیٰ نوعیت کے علمی کام ہونے لگے اور سائنسی کتابوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا تو تکنیکی اصطلاحات نیز کچھ خاص قسم کے اسما کے سوال نے بڑی اہمیت اختیار کرلی۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے کوئی مرکزی تنظیم نہ تھی۔ عربی اور فارسی جیسی زندہ زبانوں سے بنی بنائی اصطلاحیں فوری طور پر لے لی گئیں۔ چونکہ فارسی اب درباری زبان نہیں رہ گئی تھی اور ہندستانی ذریعہ تعلیم نہیں تھی اس لیے یہ فارسی آمیز اردو ایک مصنوعی زبان بن گئی جسے کچھ ہی لوگ سمجھ پاتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ نے بہت اچھا درس دیا۔ ہندستانی کی ایک نئی شکل ایجاد کی گئی جس کا سرچشمہ سنسکرت (مردہ لیکن مقدس زبان) بنی۔ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قوم پرستی انھیں ہندی کی طرف لے گئی اور مسلمان اردو کے ساتھ چل پڑے۔ اب اس زبان کے دونوں روپ اپنی تمام تر خصوصیات، اچھائیوں، برائیوں، غرور اور امنگوں کے ساتھ عنفوان شباب کی منزل میں داخل ہو چکے ہیں۔ ان کا الگ ہونا اچھا ہی رہا کم از کم علمی حلقوں کا یہی تاثر ہے۔

کیا انھیں سابقہ حالت میں واپس لا کر پھر ایک دوسرے میں ملا دینا چاہیے؟ شاید یہاں "ملانا چاہیے؟" کی جگہ "ملایا جا سکتا ہے؟" کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس طرح مسئلے کو زیادہ حقیقت پسندانہ انداز سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس مسئلے کو ذرا الگ کر کے اور باریکی سے بھی، غور کریں تو اس بات کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ تاریخ کے عمل کو

مخالف سمت میں گھمایا جائے۔

تو پھر آپ متحدہ طور پر قومی جدو جہد کیسے شروع کریں گے جب آپ کے پاس ایک سے زائد زبانیں ہیں؟ یہی وہ سوال ہے جو ان لوگوں کو پریشان کر رہا ہے جو پورے ہندستان کے لیے ایک زبان کی وکالت کر رہے ہیں۔ لیکن "زبان" اور "قوم" کو لازم و ملزوم نہیں سمجھنا چاہیے۔ افغانستان میں دو زبانیں ہیں لیکن قوم ایک ہی ہے۔ سوئیزر لینڈ میں چار زبانیں ہیں (تنہا چھوٹے سے کینٹن آف برن میں دو زبانیں اور دو مذاہب ہیں)۔اب برطانیہ اور امریکہ کو دیکھیے دونوں کی زبان ایک ہی ہے لیکن قومیں الگ الگ ہیں۔ ہمیں انتظامیہ کے مسئلے کو پریشان کن نہیں سمجھنا چاہیے۔ کینڈا اور یونین آف ساؤتھ افریقہ۔یہ ہمارے بعض صوبوں سے بھی بڑے نہیں ہیں لیکن ان دونوں میں دو دو زبانیں رائج ہیں اور بڑی آسانی سے ان کا کام چل رہا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زبانیں اور اس سے بھی زیادہ رسم خط صرف خیال کی علامتیں ہیں۔یہ صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں۔ علامت کا کلمہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی پوجا کی جائے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عوام کی صحیح خطوط پر رہنمائی کریں، ان تک ممکنہ حد تک آسان ذرائع سے اپنی بات پہنچائیں اور یہ سب کچھ اس زبان کے ذریعے کریں جو ان سے قریب ہے، جو ان کی مادری زبان کے قریب ہے۔ ہم انھیں جدوجہدِ آزادی کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مشترکہ زبان کو فروغ دینے اور لاکھوں کروڑوں ناخواندہ افراد کو سکھانے کے لیے لمبی مدت درکار ہوگی۔ ظاہر ہے اتنی مدت تک آپ آزادی کا انتظار نہیں کر سکتے۔ اور ایک بار جب آپ نے آزادی حاصل کر لی تو زبان کے مسئلے پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں باقی رہے گی۔ زبانوں کی رنگا رنگی سیاسی طور پر ضرر رساں نہیں ثابت ہوگی کیونکہ ان اختلافات کی بنیاد پر آپ کا استحصال کرنے والا کوئی طبقہ نہ ہوگا۔ کلچر کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ لسانی گروہوں کی رنگا رنگی کلچر کی یکجہتی کو تباہ نہیں کرتی اور نہ ہی تہذیبی رنگا رنگی آزادی کے لیے شروع کی جانے والی قومی جدو جہد کے استحکام کو رد کرتی ہے۔ زبان، ادب اور کلچر کو صرف کوئی مقصد

بامعنی بناتا ہے اور ہندستان کی زبانیں، ادب اور کلچر ایسے متنوع مواد پیش کرتے ہیں جو استحصال سے آزادی دلانے کی جد وجہد میں کافی معاون ثابت ہوں گے۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہوں گا کہ جب تک ہندستان آزاد نہیں ہوتا، ہندستان کے خاص حلقوں کی لسانی اور تہذیبی یکجہتی کو توڑنے کی ہر کوشش ناممکن بھی ہوگی اور نقصان دہ بھی۔ اگر ایک زبان پر ہمارا اصرار رہا تو خصوصی مفادات کے حامل حلقوں کو ایک ہتھیار مل جائے گا اور وہ عوام کو الجھانے کی کوشش کریں گے۔ ہماری پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ موجودہ لسانی حلقوں کو مضبوط بنائیں۔ مختلف زبانوں میں مناسب ڈھنگ کی کتابیں لکھیں اور ان کے ذریعے آزادی کے حقیقی جذبے کا پرچار کریں۔

ہمیں عوام کو اضافی زبانیں اور نئے رسم خط سکھانے کی کوشش کر کے انھیں پریشانی میں مبتلا بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جو اُن کی مادری زبان نہیں ہے اسے سیکھنے سے انھیں کوئی رغبت نہ ہوگی۔ اگر ہم پرائمری سطح کی بھی تعلیم انھیں دینا چاہیں اور ایک سے زیادہ زبان یا رسم خط انھیں سیکھنا پڑے تو وہ ناخواندہ رہنے میں ہی عافیت سمجھیں گے اور پرائمری سطح کی تعلیم میں تو ایک زبان بھی مناسب انداز سے سیکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جب ہم آزاد ہو جائیں گے اور خوشحالی کی جانب بڑھیں گے تو ایک آدمی کوئی زبانیں سکھانے کے متحمل بھی ہو سکیں گے۔ ابھی اس پیچیدہ اور صبر آزما عمل پر دولت، توانائی اور وقت برباد کرنا فضول ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کئی دشمن ہمہ وقت ہماری تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اردو ہندی (اور ہندی، تمل) جیسے تنازعات خطرناک حد تک ہماری توانائی ضائع کر چکے ہیں۔ تو پھر اس کا حل کیا ہوگا؟ ہمارے سامنے سوویت یونین (U.S.S.R.) کی مثال ہے۔ اس عظیم سوشلسٹ وفاق سے متنوع کلچر اور زبانوں کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے اگر ہم کچھ سیکھنا چاہیں تو اس کے لیے کیمونسٹ ہونا لازمی نہیں ہے۔ انقلاب سے پہلے زاروں (روس کے مطلق العنان بادشاہوں) نے پوری قلمرو کو "روسیانے" کی کوشش کی۔ جہاں کہیں بھی اسکول تھے روسی زبان لازماً اور جبراً پڑھائی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سفید نسل کے لوگ اور

وسط ایشیائی علاقے پسماندہ رہ گئے۔اسکیمو کی حیثیت وہی ہو گئی جو اس وقت ہندستان میں بھیلوں کی ہے۔اس کے بعد انقلاب آیا۔ایک طبقے اور ایک نظریے کی آمریت یا مساوات کے اصول پر مبنی ریاست قائم ہوئی۔"قومی کلچر" کے خیال کو لینن نے خالص بورژوائی خیال قرار دیا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ لسانی، قومی اور ریاستی امتیازات "کافی لمبے عرصے تک باقی رہیں گے۔ بلکہ عالمی پیمانے پر پرولتاری آمریت قائم ہو جانے کے بعد بھی باقی رہیں گے۔"متنوع قسم کی زبانوں کے مسئلے سے نمٹتے وقت انھوں نے محسوس کیا کہ ایک زبان کی پالیسی اور سب کو "روسیانے" کی اسکیم، سامراجی نظریے کی دین تھی۔ نظریے کی یکسانیت زبان کی یکسانیت کا تقاضہ نہیں کرتی۔ آزادی کے راستے میں ایک سرخ لکیر کیوں کھینچی جائے؟ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ سوویت یونین میں تنہا اوّل گریڈ کے اسکول 66 مختلف زبانوں میں تعلیم دے رہے ہیں۔ روسی اکادمی برائے سائنس اور مشرقی زبانوں کے انسٹی ٹیوٹ نے اسکیمو اور ازبیک جیسی زبانوں کے لئے بھی حروف تہجی، قواعد اور فرہنگیں تیار کر لیں۔اس سے پہلے ان چیزوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ مقصد خواندگی کو فروغ دینا ہے کوئی خاص زبان سکھانا نہیں۔ روس خاص (R.S.F.S.R) کے مقابلے میں پسماندہ علاقوں کو تعلیم کے لیے فی کس تین گنی زیادہ رقم ملتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ایک ایسا ملک جہاں تعلیم کی شرح ہندستان ہی کی طرح بہت کم تھی، وہ کم از کم تعلیمی اعتبار سے دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں سے ایک ہے۔ اگر یہاں دو سفید فام کمیونسٹ دشمن روسی پروفیسروں ہینس اور ہیسن (Hans and Hessen) کا حوالہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔انھوں نے کہا ہے کہ "اس کے باوجود کہ جانبدارانہ انداز کی تعلیم کو فروغ دیا گیا یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام روسی اقلیتوں میں قومی بیداری کی نئی لہر آئی اور یہ صورتِ حال خود تابناک مستقبل کی بشارت دیتی ہے"۔

ہندستان کی صورتِ حال اس وقت کافی حد تک زار کے زمانے کے روس جیسی ہے۔ سوویت یونین میں جو کامیاب تجربے کیے گئے وہ ہمیں بہتر راستہ دکھاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس زبان کے استعمال اور ترقی کی حوصلہ شکنی کی جائے جو اس وقت ہندستان کے بازاروں میں عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ ہندی اور اردو کا الگ الگ انداز سے جو ارتقا ہوا اس نے اس بات کو ناممکن اور ناپسندیدہ بنادیا ہے کہ ان زبانوں کی جگہ "ہندستانی" کو لا کھڑا کیا جائے جو کسی زمانے میں کھلتی ہوئی زبان تھی اور اس طور پر آگے بڑھ رہی تھی کہ کم از کم شمالی ہند میں لینگوا فرینکا کی حیثیت اختیار کر سکتی تھی۔ اس نو وضع شدہ ہندستانی کو دراوڑی آبادی پر بھی نہیں تھوپنا چاہیے۔ یہ ایک فضول اور شرانگیز قسم کی بات ہوگی اس کے برعکس ہندستان کی تمام زبانوں کی اس مقصد سے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے کہ وہ ترقی کریں تاکہ وہ اعلیٰ سیاسی، سائنسی اور ادبی خیالات کے اظہار کا مضبوط وسیلہ بن سکیں۔

مجھے شک ہے کہ ہمارے بعض پرجوش قوم پرستوں کے دل میں کچھ غلط تصورات گھر کر گئے ہیں اور انھی خیالات کو وہ آزادی کا اصل منشا سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قوم پرستی ہی آخری منزل نہیں ہے بلکہ یہ اونچے آدرش کے حصول کا ایک وسیلہ ہے یعنی انسانی آزادی کے حصول کا ایک ذریعہ! مندرجہ ذیل حوالوں میں بہت کچھ پوشیدہ ہے۔

(1) ایسوسی ایٹڈ پریس، ناگپور 30/ستمبر 1938ء "(مدھیہ پردیش) کی اسمبلی نے پورا دن ایک ترمیم سے متعلق بحث میں صرف کیا جس کے تحت "اردو یا ہندستانی" کو تسلیم شدہ زبان کی تعریف میں شامل کیے جانے کی تجویز تھی۔ اسمبلی کے موجودہ ضابطے کے مطابق اب تک اس کا اطلاق صرف ہندی یا مراٹھی پر ہوتا تھا۔۔۔ اپوزیشن کے تقریباً تمام ممبران نے ترمیم کے حق میں رائے دی اور کانگریس وزارت پر زور دیا کہ وہ کراچی کی اس کانگریس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے میں قطعی پس و پیش نہ کرے جس میں اقلیتوں اور ان کی زبان اور تہذیب کا تحفظ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اگر کانگریس صوبے کے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے ترمیم کو منظور کرنا چاہیے۔/ کانگریس حکومت کی طرف سے وزیر خزانہ نے ترمیم کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ جن لوگوں نے کانگریس کو قومی تنظیم ماننے سے

انکار کیا ہے وہ کانگریس حکومت کی توجہ اقلیتوں سے متعلق کراچی قرارداد کی جانب نہیں مبذول کرسکتے۔ انھوں نے مسلم ممبران سے اس سوال پر غور کرنے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ ایک اقلیت کو ایوان کی اکثریت سے ایک غیر معقول مطالبہ منوانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جن مسلم ممبران نے اس کا مطالبہ کیا ہے انھیں اردو میں تقریر کرنے کی اجازت پہلے ہی سے ملی ہوئی ہے۔ لیکن ان کے مطابق ان تقریروں کا ریکارڈ اردو میں نہیں مرتب کیا جاسکتا کیونکہ مطلوبہ تعداد کے معیار پر یہ پوری نہیں اترتیں"۔

(2) وزیر تعلیم بابو سمپورنانند نے بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا کے استقبالیہ خطبے کا جواب دیتے ہوئے ان لوگوں کو یہ مشورہ دیا۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندستانی بھی کہا جاتا ہے، ہمارے جنوبی ہند کے بھائی آسانی سے سیکھیں تو یہ بات ضروری ہوگی کہ ہندی زبان میں سنسکرت کے الفاظ کافی بڑی تعداد میں شامل کیے جائیں"۔

اس کا تعلق براہ راست نہ تو ہندستانی کو مقبول بنانے کے کاز سے ہے اور نہ ہی حصول آزادی سے۔ لیکن ہندستانی ہے کیا؟ مہاتما گاندھی کہتے ہیں (ایسوسی ایٹیڈ پریس بمبئی 20/اکتوبر 1935ء)

"جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے، ہندستانی اس کی تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے جسے بین صوبائی رابطے کے لیے کل ہند زبان کے طور پر وضع کیا گیا ہے۔ ہندی اردو تنازعے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ کانگریس کے تصور والی ہندستانی کی شکل ابھی واضح نہیں ہو سکی ہے۔ یہ اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گی جب تک کہ کانگریس کی کارروائیاں خصوصی طور پر ہندستانی میں ترتیب دینے کا سلسلہ نہیں شروع ہو جاتا۔۔ وہ ہندستانی جو بنگالیوں یا جنوبی ہند کے باشندوں کے سامنے بولی جائے گی، اس میں قدرتی طور پر سنسکرت اصل کے الفاظ زیادہ ہوں گے۔ وہی تقریر جب پنجاب میں پیش کی جائے گی تو اس میں عربی اور فارسی اصل کے الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوگی"۔

اگر ابھی ہندستانی کی شکل واضح ہی نہیں ہو سکی ہے اور مختلف صوبوں کے لیے مختلف انداز کی ہندستانی سے کام چلانا ہے تو اسے ابھی سے لازمی قرار دینے کی کیا ضرورت پیش آئی اور وہ بھی ایسے صوبے میں جس کے لیے یہ تقریباً غیر ملکی زبان ہے؟ کیوں نہ دو مختلف انداز کی ہندستانی کو ہندی اور اردو ہی کا نام دیں؟ غیر سنسکرت دراوڑی اور سنسکرت بنگالی دونوں کے لیے سنسکرت آمیز ہندی کیوں ہو؟ اس وقت تک انتظار کیوں نہیں کر لیتے جب تک کہ اس کی باقاعدہ شکل نہ وضع کر لی جائے؟ لیکن گاندھی جی "ہے" اور "ہونے والا ہے" میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔

10 ستمبر 1938ء کو انھوں نے کہا "اگر ہم خلوص کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہندستانی راشٹر بھاشا ہے یا ہونے والی ہے تو ہندستانی کے علم کو لازمی قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔ اس کے بعد یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ "انگریزی کے اسکولوں میں لاطینی لازمی ہوا کرتی تھی اور شاید اب بھی ہے اس کے مطالعے سے انگریزی کے مطالعے پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے برعکس ایک عالی مرتبہ زبان کے علم سے انگریزی مالامال ہوئی"۔ ان کی اس بات سے دراوڑی زبان کا حلقہ بھلے ہی مطمئن ہو جائے لیکن میری مجبوری یہ ہے میں اتنی لمبی جست نہیں لگا سکتا کہ ایک "ناآفریدہ" زبان اور ایک "عالی رتبہ زبان" کے درمیان کا فاصلہ عبور کر سکوں۔ ایک حقیقت ہے اور ایک محض خواہش۔

ہندستانی، وہ بنیادی زبان جس کے خط وخال ابھی قطعیت کے ساتھ سامنے بھی نہیں آئے، عالی رتبہ زبان نہیں ہے اور نہ تو اس کا مقصد ہندستان کی باقاعدہ ترقی یافتہ زبانوں، مثلاً اردو، تمل، بنگالی، ہندی وغیرہ کو مالامال کرنا ہے اور نہ ہی وہ اس کی اہل ہے۔ اسے ہندستان کے شہروں کے بازاروں کی زبان اور شمالی ہند کے دیہی علاقوں کی عوامی بولیوں پر مبنی ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں ایک ٹھوس تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہم زبان سے متعلق ایک بنیادی کمیٹی تشکیل دیں جو خاص طور سے نوجوان ادیبوں اور ماہرین لسانیات پر مشتمل

ہو۔("نوجوان" کی اصطلاح عمر کے لیے نہیں بلکہ ذہن کے لیے استعمال کی گئی ہے۔لفظ "ترقی پسند" میں نے اس لیے استعمال نہیں کیا ہے کہ اسے ایک خاص حلقے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے) انھیں بنیادی الفاظ کی ایک فہرست اس طور پر ترتیب دینی چاہیے جو معنویاتی اعتبار سے ضروری ہوں۔۔۔اس کے بعد ہم اس کے لسانیاتی پہلو کی جانب بڑھیں۔ہم فیلن (Fallon) کی انگلش ہندستانی ڈکشنری کو اپنی بنیاد بنائیں۔ہندستان کے مختلف حصوں مثلاً پنجاب، یوپی اور حیدرآباد سے تین اردو داں ممبران کو لائیں۔یہ ممبران ایسے ہوں جو ہندی قطعی نہ جانتے ہوں لیکن اپنی مقامی بولی سے واقف ہوں۔وہ ایسے غیر فارسی الفاظ کی فہرست تیار کریں جنھیں وہ سمجھتے ہوں۔اسی طرح ایسے تین ہندی داں ممبر ہونے چاہئیں جو اردو بالکل نہ جانتے ہوں اور وہ غیر سنسکرت الفاظ کی فہرست مرتب کریں۔اس بنیادی لسانیاتی فہرست کا بنیادی معنویاتی فہرست سے موازنہ کیا جائے۔جب ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بنیادی معنویاتی الفاظ، اردو۔ہندی فہرست کے الفاظ سے لگانہ کھائیں تو ان کے متبادل دونوں زبانوں سے دیے جانے چاہئیں۔اسی طور پر ہماری بنیادی فرہنگ تیار ہوگی۔یہاں میں ایک مثال دوں۔

فرض کیجیے کہ معنویاتی الفاظ کی بنیادی فہرست میں (جسے آپ کسی بھی زبان میں تیار کرسکتے ہیں۔۔۔ترجیحاً انگریزی میں) لفظ "NORTH" درج ہے اور آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ کی لسانیاتی فہرست میں ہندی۔اردو کا کوئی مشترکہ لفظ اس کے لیے نہیں ہے۔نہ تو اس میں "شمال" درج ہے اور نہ "اتر"۔تو پھر اس صورت میں آپ ان دونوں لفظوں کو اس میں شامل کردیجیے۔یعنی "شمال اتر"۔اس طرح کے جداگانہ الفاظ کو نظر انداز کرنے کے لیے معمولی قسم کا سمجھوتہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔صرف وہی الفاظ شامل کیے جانے چاہئیں جو غیر ہندی داں اردو والوں کے لیے مانوس ہوں۔اس پورے کام کو حقیقت پسندانہ اور حقیقی طور پر انجام دینا چاہیے۔آرزومندانہ نہیں۔اگر ناگزیر محسوس ہو تو سمجھوتہ بعد کے مرحلے میں کیا جاسکتا ہے بلاشبہ جہاں بنیادی معنویاتی لفظ کے لیے مشترکہ لسانیاتی لفظ موجود

ہے۔ مثلاً Revolution کے لیے انقلاب اور Society کے لیے سماج تو پھر ان کی جگہ جداگانہ الفاظ شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مانوس مترادفات میں سے جب کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ ماضی کی کلاسکس میں کون سا لفظ زیادہ استعمال میں رہا ہے۔

اس بنیادی ڈکشنری کو بعد میں بڑھایا جاسکتا ہے اور اس میں قدیم عوامی (لوک) ڈراموں مثلاً "آلہا اودل" اور "ہیر رانجھا" نیز بعد کے ادبی ڈراموں مثلاً آغا حشر اور دوسرے ڈرامہ نگاروں کی تحریروں کے ذخیرۂ الفاظ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اور بھی کچھ مآخذ تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً "کسانوں" اور "مزدوروں" کے عوامی جلسوں کی رپورٹوں اور روز مرہ گفتگو کے گراموفون رکارڈ سے بھی الفاظ لیے جاسکتے ہیں۔ بعد میں پیشہ ورانہ، سیاسی اور دوسری طرح کی اصطلاحات کے لیے خصوصی فرہنگیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہاں بھی طریقۂ کار وہی اپنایا جائے گا جو پہلی بنیادی ڈکشنری کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ یعنی لسانیاتی اور معنویاتی فہرستیں تیار کی جائیں گی اور مجوزہ طریقے کو بروئے کار لایا جائے گا۔

یہ بڑی اور جامع ڈکشنری اردو اور ہندی، دونوں رسم خط میں ایک ساتھ شائع کی جانی چاہیے لیکن لاطینی رسم خط میں الگ سے؛ اردو اور ہندی ڈکشنری کی اشاعت ان زبانوں کے ایسے ادیبوں کے لیے اچھی ثابت ہوگی جو آسان زبان میں لکھنا چاہتے ہیں لیکن متعدد انداز کی بولیوں کے باعث ایسا کر نہیں پاتے۔ لاطینی رسم خط والی اشاعت کانگریس اور دوسری جماعتوں کے ان لیڈروں کے لیے کار آمد ثابت ہوگی جو بین صوبائی تنظیموں سے وابستہ ہیں اور عوام سے جن کا واسطہ پڑتا ہے۔

میں رسم خط والی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ لاطینی، ناگری اور اردو، ان تینوں رسم خط میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ لاطینی اور ناگری کے لکھائی اور چھپائی والے رسم خط الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ ایک غیر ضروری سی پیچیدگی ہے۔ اردو رسم خط میں اعراب کا معاملہ بھی اسی طرح کی الجھن میں ڈالتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں بذاتِ خود خاص اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ یہ تو خیالات کے اظہار کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے جو صورتِ

حال ہے اس میں ہمیں کم از کم ایک یورپی زبان کا جاننا ضروری ہے اور اسی لیے لاطینی رسم خط سے واقف ہونا ہمارے رہنماؤں کے لیے ضروری ہے۔ ہندستانی کو پہلے مرحلے میں ہمارے گروپ لیڈروں کی زبان بننا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے عوام میں مقبول بنانا ہے یہ کام اولین طور پر ریڈیو، سینما، گراموفون رکارڈ اور تھیٹر وغیرہ کے توسط سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد کے مرحلے میں پرائمرز (قاعدے) کتابیں، رسالے اور مصوّر رسالے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہندستانی کی تعلیم کو فروغ دینے کا کام ہم ذخیرۂ الفاظ اور ابتدائی قواعد ترتیب دینے کے بعد ہی انجام دیں گے۔ اور اسے سیکھنا کانگریس مندوبین اور دوسرے ان تمام حلقوں کے لیے لازمی ہوگا جو بین صوبائی سیاسی تنظیموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ ہندستانی کا علم اتنی ہی سختی سے لازمی قرار دیا جائے گا جتنی سختی سے کانگریس ہاتھ کے بنے ہوئے کھدر کے پہننے کو لازمی قرار دیتی ہے۔ اس طرح شروع شروع میں تو ہندستانی ہر ایک کی "سمعی" اور چند ایک کی "بصری زبان" ہوگی لیکن عوام کو جبراً نہیں پڑھایا جانا چاہیے خاص طور سے اس مرحلے میں جب کہ ابھی ہم نے ہندستانی کے بنیادی عناصر تک کی "شکل" وضع نہیں کی ہے۔ سنسکرت اور فارسی کے جداگانہ الفاظ مستعار لینے کی گاندھی جی کی تجویز، غلط فہمی تو پیدا کرے گی ہی لیکن اس سے قطع نظر، حقیقی بنیادی زبان وضع کرنے کے کام کو اس سے بھی زیادہ مشکل بنادے گی، جتنا مشکل یہ اس وقت ہے۔ ان جداگانہ الفاظ کو استعمال کر کے زبان کا حصہ بنانے کی کوشش اصل ہندستانی کی راہ میں ایک دوسری رکاوٹ پیدا کر دے گی۔ یہ جداگانہ الفاظ جیسا کہ پہلے کہا گیا، روزمرّہ کے اردو اور ہندی الفاظ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

سوویت یونین سے ہم ایک سبق تو سیکھ ہی سکتے ہیں۔ میں اپنی اس بات کو پھر دہراتا ہوں کہ "زبان" اور "قوم" لازم وملزوم نہیں ہیں۔ اور یہ کہ ہمارا مقصد خیال کی اشاعت ہے نہ کہ عوام پر کسی ایک خاص شکل میں زبان یا رسم خط تھوپنا۔ مثالی بات تو یہی ہوگی کہ پوری دنیا کے لیے کوئی ایک زبان ہو۔ ہمارا اولین مقصد تو فی الحال یہ ہے کہ خصوصی مفادات کے حامل حلقوں کے ہاتھوں ہونے والے ہر طرح کے استحصال کا قلع قمع کیا جائے۔

☆☆☆

بشیر احمد

ہندستان کی قومی زبان کے سوال کا، ہندستان کے قومی مسئلے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک کا حل دوسرے کے حل کے لیے راہ ہموار کرے گا۔ جس دن ہندستانی قومی زبان کے سوال پر سچے دل سے اتفاق کرلیں گے اسی دن سیاسی مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گا اس لیے زبان کے مسئلے کا حل اوّلین اہمیت کا حامل ہے۔ جن لوگوں کا ہندستان کی یکجہتی پر پختہ یقین ہے، انھیں اپنی تمام تر توانائی اسی کام کی تکمیل پر صرف کرنی چاہیے۔

ہمیں حقیقت کا سامنا کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر ہند میں اتنی متضاد پارٹیاں اور مفادات ہیں کہ کبھی کبھی تخریب کار طاقتیں، ان طاقتوں پر حاوی ہو جاتی ہیں جو یکجہتی کے لیے کام کرتی ہیں۔ یہاں ہندو اور مسلم دو اہم فرقے ہیں، جن کے درمیان واقعی کچھ اختلافات موجود ہیں۔ جو لوگ یکجہتی قائم کرنے کے خواہش مند ہیں اور پُر امید بھی ہیں وہ خواہ کچھ بھی کہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ ابھی حل طلب ہے اور اس بات کا امکان بھی نظر نہیں آتا کہ سہولت سے حل ہو سکے گا۔

زبان کے مسئلے میں بھی کچھ وہی بات نظر آتی ہے۔ قومی زبان بننے کی امیدوار دو زبانیں ہیں ــــ ہندی اور اردو۔ اردو کی حمایت کرنے والوں میں مسلمان زیادہ ہیں اور ہندی کی حمایت کرنے والوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ یہ دونوں فرقے اور دونوں زبانیں ایک دوسرے سے دور چلی گئی ہیں اور بدقسمتی سے جو اجنبیت آج ان کے درمیان موجود ہے اتنی

پہلے کبھی نہیں تھی۔

ایسا کیوں ہے؟ایک مختصر تاریخی جائزہ اس کا جواب دے گا۔عہدِ وسطیٰ میں صدیوں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب، زبان اور کلچر نے ایک دوسرے کو متاثر کیا اوران میں آپس میں یگانگت بھی پیدا ہوئی۔ جہاں تک زبان کا سوال تھا،دربار کی سرکاری زبان اگرچہ فارسی تھی لیکن اس کے باوجود وقت کے اثرات اوردونوں فرقوں کے باہمی خوشگوار تعلقات نے کم ازکم ملک کے وسیع ترحصے میں ایک مشترکہ زبان کو ضرور فروغ دیا جو مختلف مرحلوں میں مختلف ناموں سے جانی گئی اور کبھی ہندی یعنی ہندستان کی زبان کبھی ریختہ' کبھی ہندستانی، کبھی اردوئے معلیٰ اور بالآخر اردو کہلائی۔

اردو ایک ملی جلی زبان تھی اور ہے اور اس کے بیشتر الفاظ سنسکرت، عربی اور فارسی سے ماخوذ ہیں۔اس کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ اس نے اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے اور جہاں کہیں سے بھی لفظ ملے اس نے ان کا استقبال کیا گویا اس کا رویہ ہمہ گیر نوعیت کا تھا۔اردو ایک قدرتی سمجھوتے کی دین ہے۔قدرتی اور آسان طریقے سے اس میں آمیزش بھی ہوئی۔ یہ دو تہذیبوں کا نقطۂ وصال بن گئی،ایک سب سے خوش آئند بات یہ ہوئی کہ اس کا نام نہ تو ملک کے نام پر پڑا اور نہ فاتح یا مفتوح قوم کے نام پر۔اردو ایک غیر جانبدار لفظ ہے جو اہمیت کے اعتبار سے تقریباً بین اقوامیت کا حامل ہے۔

برطانوی استمرار کے آجانے کے بعد فارسی کی اہمیت گھٹتی گئی۔ مغربی حکمرانوں نے اردو کو فارسی کا قدرتی جانشین تسلیم کیا کیونکہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد اسے سمجھتی تھی۔اس طرح 1835ء میں اردو سرکاری زبان بنی۔اس کے خلاف کسی بھی حلقے سے کوئی بھی آواز نہیں اٹھی ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بنگال، بہار اوراڑیسہ کے زمینداروں اور کچھ دوسرے لوگوں نے 1861ء میں وائسرئے سے یہ اپیل کی کہ نئی تشکیل شدہ ہائی کورٹ میں ساری کارروائیاں اردو میں عمل میں لائی جائیں،اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ بہت

سے ایسے تعلیم یافتہ ہندو، جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی، عوامی جلسوں اور اجتماعات میں اردو ہی میں تقریر کیا کرتے تھے بلکہ برطانوی حکمراں بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ اس طرح اردو بتدریج پورے ملک میں مقبول ہو گئی۔

لیکن اس کی مقبولیت کو نظر بد لگ گئی اور زبان کے مسئلے کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا گیا۔ جواہر لال نہرو اپنے مقالے "زبان کا سوال" میں کہتے ہیں۔۔۔

> "انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ لفظ ہندی اور اردو کو الگ الگ معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ یہ علاحدگی بڑھتی گئی۔ شاید یہ بڑھتے ہوئے قومی شعور کی علامت تھی جس نے پہلے ہندوؤں کو متاثر کیا جنھوں نے خالص ہندی اور دیوناگری رسم خط پر زور دینا شروع کیا۔ شروع شروع میں قوم پرستی ان کے لیے ناگزیر طور پر ہندو قوم پرستی کی ایک شکل تھی۔ اس کے کچھ دن بعد مسلمانوں کے دل میں رفتہ رفتہ اپنے طرز کی قوم پرستی بیدار ہونے لگی جو مسلم قوم پرستی تھی اور انھوں نے اردو کو اپنا خاص ورثہ سمجھنا شروع کیا۔" پنڈت جی ہم لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ "زبان کے معاملے میں یہ علاحدگی پسندی قوم پرستی کے پورے فروغ کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گی"۔

لیکن اس علاحدگی پسندی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور آج جو خلیج دکھائی دیتی ہے، وہ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

ہندی کے لیے احتجاج بہار میں 1867ء میں شروع ہوا اور اس کا دوسرا مرحلہ 1900ء میں یوپی میں نظر آیا جہاں سر انتھونی میکڈونیل کی سرپرستی میں اسے عدالت کی متبادل زبان بنایا گیا۔ ہندی ساہتیہ سمیلن 1910ء میں قائم ہوا اور تب سے گاندھی جی پورے ہندستان میں ہندی سے متعلق مہم میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ کانگریس

نے 1931ء میں ہندستانی سے متعلق قرارداد منظور کی لیکن جو آگ بھڑک چکی تھی، وہ بجھ نہ سکی۔ اپریل 1936ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا پہلا اجلاس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انھوں نے "ہندی اتھوا ہندستانی" کو پریشد کی زبان قرار دیا جس کا مطلب تھا ملک کی مستقبل کی قومی زبان۔ انجمن ترقی اردو کے مولانا عبدالحق نے جب اس نئی مصنوعی زبان کے نام پر اعتراض کیا تو گاندھی جی نے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا کیونکہ یہ قرآن مجید والے رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔

اس کی وجہ سے پورے ملک میں احتجاج کا ایک طوفان سا برپا ہو گیا اور پنڈت سندر لال اور پنڈت نہرو سمیت بہت سے ہندوؤں کی جانب سے گاندھی جی کے اس اردو مخالف نظریے پر شدید تنقید ہوئی۔

پنڈت نہرو نے ایک مشہور پمفلٹ "زبان کا سوال" اگست 1937ء میں لکھا اور اسی مہینے میں زبان کے تنازعے پر عبدالحق اور راجندر پرساد معاہدہ عمل میں آیا۔

لیکن یہ دوری دن بہ دن بڑھتی ہی گئی۔ اکتوبر 1938ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے لکھنؤ اجلاس میں اردو کے حق میں قرارداد پاس کی۔ 18/دسمبر کو پورے ہندستان میں یوم اردو منایا گیا اور انجمن ترقی اردو کے نئے صدر سر تیج بہادر سپرو نے ملک کے عوام کے نام یہ اپیل جاری کی کہ وہ اردو کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں اور ہندو مسلم مشترکہ کلچر کی اس آخری مضبوط کڑی کو بچانے کی کوشش کریں۔ 1937ء سے 1939ء کے دوران جب سات صوبوں میں کانگریس کی وزارت تھی تو حالات مزید خراب ہو گئے۔ 1931ء کی کانگریس قرارداد کا بظاہر پاس کرتے ہوئے کانگریس حکومتوں نے ہندستانی کی حمایت تو کی لیکن ہندستانی کے پردے میں دراصل انھوں نے ہندی کے کاز کی حمایت کی۔

بات اتنی نہ بگڑی ہوتی جتنی کہ بگڑ گئی، اگر گاندھی جی، سمپورنانند اور بعض دوسرے ذمہ دار افراد نے انتہائی سنسکرت آمیز ہندی استعمال نہ کی ہوتی۔

تین سال قبل کانگریس نے جب نظم و نسق سنبھالا تھا، اسی وقت اگر اس نے

جرأت مندانہ موقف اختیار کیا ہوتا اور اردو کو ہندستان کی قومی زبان قرار دے دیا ہوتا تو اسی جست میں سیاسی مسئلہ بھی حل ہو گیا ہوتا۔ مسلمانوں کو اگر یقین ہو گیا ہوتا کہ مشترکہ ہندو مسلم کلچر کی علامت محفوظ رہے گی تو ان کے دل سے ہندوؤں کے تئیں شک وشبہ کا غبار چھٹ گیا ہوتا۔ اور یقینی طور پر فرقہ پرستی کا مسئلہ حل کرنے کی جانب پائدار قسم کی پیش رفت ہوتی۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اردو بہر حال سنسکرت ہی کی پیداوار ہے یعنی اس کی بنیاد ہندو ہے جس کا بالائی ڈھانچہ جزوی طور پر مسلمان ہے لہٰذا یہ دو تہذیبوں کے درمیان ایک سمجھوتے کی آئینہ دار ہے لیکن گاندھی جی اور ان کے بہت سے ہندو مداحوں کی ہندی ـــــ ہندستانی کا رجحان یہ ہے کہ فارسی عربی اصل کے سارے الفاظ کو اچھوت تصور کیا جائے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہندستان کے لیے اسی زبان کو اختیار کریں جو صرف ایک حلقے (بھلے ہی وہ بڑا حلقہ ہو) کی نمائندگی کرتی ہے یا پھر اس زبان کو تسلیم کریں جو حقیقتاً ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں کو بہت اچھی طرح جوڑتی ہے۔؟ مسلمانوں نے خود اپنی تہذیبی زبان (فارسی) کو ترک کر دیا اور اس کی جگہ اردو (سنسکرت اور فارسی۔ ملی جلی) کو اختیار کیا۔ اور اب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی بے تعلق ہو جائیں۔ وہ اس سے کیونکر متفق ہو سکتے ہیں؟ جدید "سیاسی" ہندی کو تمام تسلیم شدہ عربی اور فارسی الفاظ سے پاک کرنے کی دانستہ کوشش اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ جس مقصد کو سامنے رکھا گیا ہے وہ ایک مشترکہ سماجی ڈھانچے کی آئینہ داری نہیں کرتا بلکہ پورے طور پر ہندو بالادستی کو یقینی بنانا چاہتا ہے۔

تنہا کانگریس ایک ایسی جماعت تھی جو صورت حال کو سنبھال سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس اس نے یہ سوچا کہ اسے ہندوؤں کے ساتھ "بے انصافی" نہیں کرنا چاہیے جن کی بہت بڑی تعداد اس کے حامیوں کی ہے اور وہ قدیم ویدوں والے کلچر کی جانب متوجہ ہو رہے ہیں۔

ہندوؤں کا ایک بہت بڑا حلقہ ہندو احیا کا خواب دیکھنے لگا اور ہندی کو حیات نو عطا کرنے کی تحریک کا مقصد یہی ہے کہ اس سمت وہ ایک اہم رول ادا کرسکے۔ اس حلقے کی رہنمائی کرنے والوں میں پنڈت مالویہ بھی ایک تھے لیکن ہندوؤں کا ایک دوسرا حلقہ مشترکہ ہندو مسلم کلچر کے ماحول میں پروان چڑھا تھا اس نے اس تحریک کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کی زندگی میں مغل کلچر اب بھی اہم رول ادا کر رہا تھا۔ وہ اس کلچر کو خالصتاً مسلم کلچر نہیں تصور کرتا تھا۔ اس کے نزدیک اردو ایک مشترکہ ورثے کی علامت تھی۔ وہ ہندو اسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مسلم دور حکومت میں جب بیشتر مسلمان فارسی استعمال کرتے تھے تو ہندوؤں نے ہی اس زبان کو وضع کرنے میں اپنا تعاون پیش کیا جسے اس زمانے میں ہندی کہا گیا اور بعد میں اسی نے اردو کی شکل اختیار کرلی۔ اسے کوئی صرف مسلمانوں کی پروردہ کیونکر کہہ سکتا ہے؟ اس حلقے کے سب سے اہم رہنما سر تیج بہادر سپرو تھے۔ ان روشن خیال ہندوؤں نے ان ہندوؤں سے جو اب بھی اردو سے جڑے ہوئے تھے، یکجہتی کے نام پر بے حد مخلصانہ اپیل کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندستان کے دو اہم فرقوں کے درمیان رابطہ قائم کرنے والی اس واحد کڑی کو مستحکم بنانے کی کوشش کریں کیونکہ مستقبل کی آخری امید یہی ہے۔

دوسری بڑی طاقت 'جس نے اس سلسلے میں نمایاں رول ادا کیا ہے' وہ ہے مہاتما گاندھی کی ذات! جہاں کہیں بھی وہ سیاسی افق پر نمودار ہوئے، ہندستانیوں خاص طور سے ہندوؤں کے دلوں میں نئی حرارت پیدا کردی۔ انھوں نے ان کے سامنے قدیم سادہ ہندو تصورات کے نمونے پیش کیے۔ ان لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ ہندی مہاتما گاندھی کے پلیٹ فارم کا ایک تختہ بن گئی تھی۔ اسے ہندستان کی مشترکہ قومی زبان بننا تھا۔ بیشتر ہندوؤں نے ان کے پروگرام پر عمل کیا اور پرانی ہندو مسلم مفاہمت ختم ہوگئی۔ ہندوؤں نے عربی اور فارسی کے ان الفاظ سے ہندی کو پاک کرنا شروع کردیا جو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ اس زبان میں شامل ہوگئے تھے۔

مسلمانوں نے اردو اور اس کلچر کے، جس کی یہ نمائندگی کرتی ہے، تحفظ کا فرقہ

وارانہ نعرہ بلند کیا۔اب اردو سے محبت کرنے والے ہندو حیرانی اور الجھن میں پڑ گئے۔ہندو قوم پرستی کی شناخت ہندی سے ہونے لگی۔ان کی پوزیشن کیا ہونے والی تھی؟ان میں سے بیشتر خاموش ہو رہے۔ہندوؤں میں جو زیادہ دور اندیش طبقہ تھااس نے محسوس کیا کہ ایک جھٹکے میں ہندستان کی قرون وسطی کی تاریخ کو نہیں مٹایا جاسکتا۔اس ملک کے آٹھ کروڑ عوام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔جدید ہندستان سے موت کا سودا کیے بغیر قدیم ہندستان کی جانب واپس نہیں جایا جاسکتا۔وقت کے پہیے کو مخالف سمت کون موڑ سکتا ہے؟زبان میں تو کچھ انگریزی اور یوژپی لفظ بھی شامل ہو چکے ہیں جو باقی رہیں گے۔قدرتی طور پر جو غیر ملکی عناصر آچکے ہیں ان کا استقبال کیا جانا چاہیے۔یہ ہمیں فائدہ پہنچائیں گے۔ہمیں زندگی سے متعلق اپنے نقطۂ نظر میں کشادگی پیدا کرنا ہوگی،ہمارا قوم پرستی کا تصور تنگ نظری پر نہیں مبنی ہونا چاہیے۔بہتر تو یہ ہوگا کہ اپنے مستقبل کی بنیاد ہم تہذیبی رنگارنگی پر رکھیں جس میں قدیم وجدید اور عہد وسطی سب کی نمائندگی ہو سکے۔

اگر تعصبات کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو اردو ایک طرف اپنے فارسی رسم خط اور سنسکرت نیز دوسرے قدیم ہندستانی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ اور دوسری طرف عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ اس مشترکہ کلچر کی بہتر نمائندہ ثابت ہوگی۔

اردو، جیسا کہ اب گاندھی جی نے بھی اعتراف کر لیا ہے، مسلمانوں ہی کی مخصوص زبان نہیں ہے۔یہ دراصل شمالی ہند کی زبردست اکثریت کی بول چال کی زبان ہے۔ہندی کے حامی اس کو ہندی کہتے ہیں۔بابو راجیندر پرساد جیسے ہندی کے کٹر حامی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بول چال والی زبان ہندی نہیں ہے۔اپریل 1936ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا"وہ ہندی جو آجکل کتابوں میں نظر آتی ہے،وہ چند ہی لوگوں کی مادری زبان ہے۔اگر ہندی کو ایک زندہ زبان بننا ہے تو اسے بائیکاٹ والا اصول نہیں اپنانا چاہیے۔یہ فارسی اور عربی کے جتنے زیادہ الفاظ اپنے اندر جذب کرے گی،اتنی ہی ایک زبان کے طور پر مستحکم اور عظیم تر بنے گی"۔(ملاحظہ فرمائیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہنامہ جامعہ مئی 1936ء) لیکن اس نیک مشورے پر توجہ نہیں دی گئی اور عربی اور فارسی الفاظ کے بائیکاٹ کا سلسلہ ادھر چار برسوں میں مزید شدت اور تیزی اختیار کر گیا۔ اس کی شہادت مہاتما گاندھی کے اپریل 1936ء کے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے صدارتی خطبے، یوپی کانگریس کے سابق وزیر بابو سمپورنانند کی تقریروں اور فروری 1938ء کی ہری پورا کانگریس اجلاس کی سبھاش بوس کی صدارتی تقریر میں مل جاتی ہے۔ باوا آدم کے زمانے کی یہ زبان تو بیشتر ہندو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ گاندھی جی نے اس بات کی وکالت کی ہے کہ ہندستانی جب جنوبی ہند میں بولی جائے تو اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کیے جائیں جبکہ شمال میں فارسی الفاظ کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے۔ اب اس طرح کی زبان بھلا قومی زبان یا سرے سے کوئی زبان بھی بن سکتی ہے؟

کانگریس حکومت کے دوران کانگریس کے لیڈروں نے ہندی کے حق میں اس طرح کا مسلسل پروپگنڈا کیا۔ جو لیڈر ایک دن کانگریس میں دکھائی دیے وہی دوسرے دن ہندی کانفرنس میں نظر آئے۔

ستمبر 1938ء کی آل انڈیا کانگریس سیاسی کمیٹی کی اس قرارداد کو جس کا مقصد کانگریس کے لیڈروں کو ہندی کی تبلیغ سے باز رکھنا تھا بے دردی سے اٹھا کر پھینک دیا گیا۔ فرقہ وارانہ تنگ نظری بے نقاب ہوگئی۔ کانگریس حلقوں میں "قدیم ہندستان میں واپس جانے" کا نعرہ گونجنے لگا اور اس میں مہاتما گاندھی کی بھاری بھر کم شخصیت نے اہم ترین رول ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں کانگریس کے بہت سے مسلمان لیڈر کانگریس کی زبان سے متعلق پالیسی سے بددل ہوگئے۔ (اس کا اندازہ ایک ممتاز کانگریسی مسلم اخبار "مدینہ" بجنور کی 25/ ستمبر 1940ء کی اشاعت سے ہوتا ہے جس میں اس مسئلے پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سمجھوتوں کی بنیاد پر آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو ناکام بھی ہو چکے ہیں مثلاً یوپی کی ہندستانی اکادمی۔ بہار کمیٹی زیادہ سرگرم رہی ہے۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق ہندستانی ڈکشنری پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن اردو ہندی

کے اس جھگڑے میں ہندستانی کی حالت سب سے زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ اسے ہر شخص اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ آخر اس رسہ کشی کا انجام کیا ہوگا؟ یوں تو اس مسئلے کا حل بڑا آسان نظر آتا ہے لیکن اس سے نمٹنا اتنا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے جیسا کہ بابو راجندر پرساد نے خود اعتراف کیا ہے کہ جدید ہندی ایک مصنوعی زبان ہے۔ اس زبان کو معرضِ وجود میں لانے والے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ایک استاد للو لال جی تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں یہ کام انجام دیا۔ انھوں نے اردو کی کتابوں سے عربی اور فارسی تمام عام فہم الفاظ خارج کر دیے اور ان کی جگہ سنسکرت کے پرانے الفاظ داخل کیے اور اس طرح ایک نئی مصنوعی زبان وجود میں آ گئی۔ یہ جدید ہندی تھی جو اس پرانی ہندی سے مختلف تھی جس سے اردو نکھر کر سامنے آئی تھی۔ اس کے بعد کی تحریری ہندی کا بیشتر حصہ اس سنسکرت آمیز طرز کا تھا جو حقیقی زندگی کے تقاضوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی۔ دراصل یہ زبان کی "شدھی" کا عمل تھا۔ یہ زبان اتنی خالص تھی کہ پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ عربی اور فارسی سے قطعی پاک ہندستانی کے حق میں زبردست پروپگنڈا کیا گیا۔ اس نئی "محبوب" زبان کو فروغ دینے میں کانگریس حکومتوں اور کانگریس کمیٹیوں کی پوری طاقت لگی ہوئی ہے اور ریڈیو اور سنیما کے پردوں کا بھی اس مقصد کے لیے خوب استعمال ہو رہا ہے۔

بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طریقے سے کوئی نئی زبان نہیں وضع کی جا سکتی اور نہ عوام پر لادی جا سکتی ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جدید پروپگنڈا ماحول کو زہر آلود بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ سامعین کے بہت بڑے حلقے کے کانوں میں ہر روز "طہارت پسندی" کے بھدے نمونے انڈیلے جا رہے ہیں (مثال کے طور پر آزادی کی جگہ "سوتنترتا" تجویز کی جگہ "پرستاؤ" مشہور کی جگہ "پرسدھ" اعلان کی جگہ "گھوشنا" وغیرہ وغیرہ۔)

اس ضمن میں یہ حوالہ بڑا دلچسپ ہوگا کہ پنڈت نہرو نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ اردو شہروں کی زبان ہے اور ہندی گانووں کی۔ یہ تبصرہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دیہی

علاقوں میں چند ہی افراد ایسے ملیں گے جو مہاتما گاندھی کی "ہندی اتھوا ہندستانی" کو سمجھ سکیں۔اردو بلاشبہ شہروں کی زبان ہے لیکن دیہی علاقوں کی بہت سی وہ بولیاں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں وہ ہندی کی بہ نسبت اردو سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔شمالی ہند کی دیہاتی بولیوں میں عربی اور فارسی الفاظ کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ "خالص" ہندی کے ادیب اور مقرر اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔(ملاحظہ کیجئے کانگریس نواز رسالہ "کلیم" مارچ1938ء کا شمارہ نیز کانگریس کے اردو ترجمان "ہندستان" کا 4 تا11 دسمبر1933ء کا شمارہ)۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو "ہندی" کے مقابلے میں بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔گاندھی جی اس وقت ہکا بکا رہ گئے جب مولوی عبدالحق نے انھیں ایک بار بتایا کہ اردو میں ہندی کے الفاظ اور محاورے ،خود ہندی سے بھی زیادہ ہیں(یہ اپریل1936ء کا واقعہ ہے۔)ایسا اس لیے ہے کہ اردو نے عہدِ وسطیٰ کی اس مقبول ہندی سے آزادانہ طور پر الفاظ لیے جو اس زمانے کے ہندو بولتے تھے۔اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ کئی اعتبار سے یہ ایک زندہ زبان ہے۔انیسویں صدی میں ایک ایسا وقت ضرور آیا جب اردو بھی عارضی طور پر عالمانہ فقروں اور محاوروں سے بوجھل ہو گئی تھی۔سر سیّد احمد خاں نے اسے اس دلدل سے نکالا اور ایک نئی زندگی عطا کی۔

ہندی کے ادیب بھی عربی اور فارسی الفاظ کے بائیکاٹ کی تنگ نظری پر مبنی اپنی پالیسی ترک کردیں اور عام فہم الفاظ اور محاورے استعمال کریں تو ہندی اردو سے قریب تر ہوتی جائے گی اور ایک مقام پر آکر یہ دونوں بہت قریب ہو جائیں گی۔

اس کے بعد معاملہ صرف رسم خط کا باقی رہ جائے گا اور ہندستان یا تو دونوں رسم خط کو اپنالے گا یا اس ایک رسم خط کو جو اسے کم و بیش درجن بھر مشرقی ممالک سے رابطہ قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆

پٹّبھی سیتا رمیّا

قومی زبان کے مسئلے پر اب عوامی بحث کا دروازہ کھولنا بے وقت کی راگنی لگتا ہے کہ اس میں اب کافی دیر ہو چکی ہے۔ یہ مسئلہ تو 1917ء میں طے ہو گیا تھا اور بعد میں ہندستانی کو مشترکہ زبان بنائے جانے کے فیصلے کی کانگریس کی طرف سے توثیق بھی کر دی گئی تھی۔ اپنا فیصلہ نافذ کرنے سے قبل جو کہ فطری بھی تھا اور اسی لیے ناگزیر بھی، کانگریس اس سلسلے میں اس عمل کو نہیں روک سکتی تھی اور نہ روکا جس کے تحت معقول پیش رفت ضروری تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہندستانی کی کئی شکلیں وجود میں آگئیں۔ ایسے صوبوں میں بھی جہاں ایک ہی زبان رائج ہے اور بولیوں میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے ایک ضلع کی بولی دوسرے ضلع سے مختلف ہو جاتی ہے اور اس حد تک مختلف ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھی بولیوں کی پہچان رکھنے والا کوئی بھی آدمی ایک ہی جملے سے سمجھ جاتا ہے کہ اس سے بات کرنے والے کا تعلق کس ضلع سے ہے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ پٹنہ میں ہم ایک عورت کی دکھ بھری داستان سمجھنے سے قاصر رہے جو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں اپنی شکایت درج کرانے آئی تھی۔ دوسرے دن وہ پھر آئی اور راجندر بابو تک نے یہ کہا کہ اسے کچھ سمجھانا بہت مشکل تھا۔

ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف ہندی یا ہندستانی کے ہندستان گیر پیمانے کے فروغ نے بھانت بھانت کی ایسی زبانیں وضع کر دیں جن میں جملوں اور محاوروں کی ترکیبیں متعلقہ صوبائی زبان کے طرز پر وضع ہونے لگیں۔ بنیادی افعال جداگانہ

انداز میں استعمال ہونے لگے اور جملوں کی ساخت بھی مختلف زبانوں میں مختلف نوعیت کی ہونے لگی۔ تیلگو میں ماضی معطوفہ اور اسم مصدر کا استعمال بطور صفت عام ہے جبکہ ہندی رہندستانی میں اس کا وجود تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ ہم ہمیشہ قواعد اور محاوروں کی بات کرتے ہیں۔ مقامی لہجے اور بات چیت کے ہر صوبے کے مخصوص انداز کی بات نہیں کرتے۔ آندھرا کے لوگ اپنا صوبائی انداز بڑے آزادانہ طور پر انگریزی میں کھینچ لاتے ہیں جو ان کے ہونٹوں پر بڑا دلچسپ لگتا ہے۔ تمل والے اپنے لہجے میں این(N) ایل(L) کو" "گاڑھا" بنا دیتے ہیں۔ ملیالم والوں کا ناک سے بولنے کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ مراٹھی اپنے جملوں کے ساتھ کشتی کرتے ہیں اور آخری الفاظ کو پیچھے کی طرف کھینچتے ہیں اور پہلے کے الفاظ کو آگے کی طرف دھکا دیتے ہیں۔ گجراتی، انگریزی بولے یا ہندستانی وہ اپنے نرم اور نسوانی لہجے سے آسانی سے پہچان لیا جاتا ہے۔ بنگالی ہر "آ" کو "او" میں بدل دیتا ہے خاص طور سے اس وقت جب یہ لفظ کے شروع یا آخر میں آتا ہے۔ ان سب کا مخصوص انداز اس وقت بھی آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے جب وہ ہندستانی بولتے ہیں۔ گویا اس وقت مشترکہ زبان کے اپنے اپنے صوبائی روپ ہیں خواہ انھیں قواعد کی رو سے دیکھا جائے یا محاورے یا لہجے کے اعتبار سے۔ مزید پیچیدگیاں اس وقت پیدا ہوئیں جب ان میں سے ہر ایک زبان نے ہندوؤں کی کلاسیکی زبان یعنی سنسکرت کو اپنے اپنے طور پر صوبائی زبان میں جذب کرنا شروع کیا۔ سنسار سنسکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب تیلگو میں "خاندان" ہوتا ہے جبکہ شمالی ہند کی ہندی میں اس کے معنی دنیا کے ہوتے ہیں۔ مہاراشٹر میں یہ خاندان اور دنیا، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر سنسکرت کا ہی لفظ "اَپواد" شمالی ہند کی ہندی میں "اعتراض" کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ تیلگو میں اس کا مطلب ہوتا ہے "غلط الزام"۔ جب یہ بات سوامی ستیہ دیو سے کہی گئی تو انھوں نے بتایا کہ ہندی میں بھی کہیں کہیں "اپواد" "غلط الزام" ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم جنوبی ہند والوں کو ہندی یا ہندستانی کی دو چیزیں بہت پریشان کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فاعل کے ساتھ لفظ "نے" استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے یہ

کہ لفظوں کی تذکیر و تانیث کا مسئلہ ہوتا ہے۔ تیلگو میں تذکیر و تانیث کا معاملہ بہت آسان ہے۔ جنس کا اندازہ لفظوں سے ہوتا جاتا ہے اوز موئث اور اسم نا جنس کی تصریف ایک ہی رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سنسکرت میں لفظوں کی تذکیر و تانیث ہوتی ہے اور حیرت انگیز طور پر لفظ "مترم" جس کے معنی دوست کے بھی ہیں اور سورج کے بھی اسم نا جنس ہے جبکہ لفظ "داراب" جس کے معنی بیوی کے ہیں ہمیشہ جمع ہوتا ہے۔ بہر حال جب ہم جنوب والے ہندی یا ہندستانی پڑھیں تو ہمیں "نے" اور تذکیر و تانیث کی قید سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ بالآخر بات تو ایک ہی ہوتی ہے کیونکہ "نے" کے استعمال کے سلسلے میں جو دشواری پیش آتی ہے اس کا محور تذکیر و تانیث نیز واحد جمع کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک اور بات مفید ثابت ہوگی وہ یہ کہ ماضی معطوفہ اور اسم مصدر کو بطور صفت آزادانہ طور پر استعمال کر کے فقرے کو مختصر کر دیا جائے۔

اس سلسلے مین یہ بات بھی الجھن میں ڈالنے والی ہے کہ ہندستانی کو مسلمانوں کی زبان تصور کیا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے پرانے بنگال (بنگال، بہار اور اڑیسہ) کے تین کروڑ مسلمان صرف بنگالی یا پھر بہاری یا اڑیہ کی کوئی بولی استعمال کرتے ہیں۔ تمل ناڈو کے مسلمان تمل اور کیرالا کے تین لاکھ مسلمان ملیالم بولتے ہیں۔ آندھرا کے مسلمان ہندستانی بھی بولتے ہیں اور تیلگو بھی لیکن ہندستانی کو وہ عام طور سے ترجیح دیتے ہیں لہٰذا جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہندستانی بولنے والوں کی بہت بڑی اکثریت ہے تو ہم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے لیکن ہمیں اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندی یا ہندستانی وہ واحد زبان ہے جو ہندستان کی مشترکہ قومی زبان بن سکتی ہے۔

یہ ہندی یا ہندستانی ہے کیا؟ مجھ پر بہت سے لوگ الزام لگاتے ہیں بلکہ کچھ لوگ تو مذاق اڑاتے ہیں کہ میں نے فارسی اور عربی کے بہت سے لفظ زبانی یاد کر لیے ہیں لیکن انھیں استعمال کرنا نہیں جانتا۔ مجھے پہلی بات کا اعتراف ہے اور دوسری بات کے لیے اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا ہوں لیکن اس معاملے میں مجھے بھی کچھ کہنے کا حق حاصل ہے۔ الٰہ آباد سے مغرب کے ہندو، وہی مشترک زبان بولتے ہیں جو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اسے وہ کہتے تو

ہندی ہیں لیکن اس کا جھکاؤ اس زبان کی طرف زیادہ ہے جسے ہمیں ہندستانی یا اردو کہنا چاہیے۔ ان دو عظیم فرقوں کے درمیان اپنے مذہب اور الگ الگ مفادات کے تعلق سے جو نئی بیداری آئی ہے، اس کا "سہرا" برطانوی حکومت کے سر جاتا ہے جس نے اختلاف کا ایسا بیج بو دیا کہ زبان اور سیاسی خیالات میں بھی بیگانگی پیدا ہو گئی۔ اور یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندو اپنی زبان کو سنسکرت الفاظ سے بھر دینا چاہتے ہیں جبکہ مسلمان اپنی مادری زبان کو عربی اور فارسی کے غیر ضروری عناصر سے بوجھل بنانے کے درپے ہیں۔ یہ معاملہ بہر حال اکثریت اور اقلیت کا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی پوری آبادی، جو آٹھ کروڑ افراد پر مشتمل ہے، ہندستانی نہیں بولتی اور کلاسیکی ہندستانی بولنے والوں کی تعداد تو اور بھی کم ہے۔ لیکن ان کی نصف آبادی اردو یا ہندستانی ضرور بولتی ہے۔ ایک ایسا ملک جس کی آبادی چالیس کروڑ کے قریب ہے، اس میں دس فیصد کی آبادی کوئی معمولی آبادی نہیں ہوتی لہٰذا قومی زبان کا کردار متعین کرنے میں اس آبادی کا رول اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

زبان کے سوال پر احساسات میں جو شدت پیدا ہو گئی ہے اس کا اندازہ حال ہی میں مرکزی قانون سازیہ میں اٹھائے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات سے ہوتا ہے۔

مرکزی اسمبلی میں 20/ مارچ 1940ء کو سر ضیاء الدین کے سوالات —

کیا اپنے اناؤنسمنٹ اور پروگرام نیز اپنے اشاعتی لٹریچر میں آل انڈیا ریڈیو نے لفظ "اردو" کا استعمال ترک کر دیا ہے اور اس کی جگہ ہندستانی کا لفظ اختیار کر لیا گیا ہے؟ سر ضیاء الدین نے قومی اسمبلی میں سوال اٹھایا۔

سر اینڈریو کلاؤ نے جواب دیا کہ آل انڈیا ریڈیو "ہندستانی" کی اصطلاح بلاشبہ لگاتار استعمال کر رہا ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ لفظ "اردو" کا استعمال ترک کر دیا گیا ہے۔

سوال:۔ کیا ہندستان میں "ہندستانی" نام کی کسی زبان کا وجود ہے؟

جواب:۔ جی ہاں

سوال:۔ کیا آل انڈیا ریڈیو کی ایسی کوئی پالیسی ہے جس کے تحت ہندستانیوں کے

لیے اردو ہندی کے علاوہ "ہندستانی" کے نام سے ایک اضافی زبان وضع کی جارہی ہے۔ اور دونوں زبانوں کو نقصان پہنچا کر ایسا کیا جارہا ہے؟

جواب:۔ جی نہیں، آل انڈیا ریڈیو کی پالیسی یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایک ایسے ذخیرۂ الفاظ کو فروغ دیا جائے جسے سامعین کا بڑے سے بڑا حلقہ سمجھ لے۔

سوال:۔ کیا حکومت اس بات سے واقف ہے کہ کچھ دنوں سے اردو زبان کے خلاف پورے ملک میں بڑے پیمانے پر پروپگنڈا کیا جارہا ہے؟

جواب:۔ جی نہیں۔

سر ضیاء الدین نے پوچھا کہ کیا حکومت کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ اس طرح کے سیاسی تنازعات کے معاملے میں غیر جانبدار رہا جائے، اور اگر ایسی پالیسی ہے تو کیا آل انڈیا ریڈیو کو یہ ہدایت دی جائے گی کہ اس پالیسی کا پاس کرے اور اردو زبان میں ہندی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کر کے اسے برباد نہ کرے؟

سر اے کلاؤ:۔ حکومت اسے بنیادی طور پر ایک لسانی معاملہ تصور کرتی ہے اور اگر اس کے کچھ سیاسی مضمرات ہوں گے تو حکومت بہر حال کسی بھی فریق کی طرفداری نہیں کر سکتی۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ آل انڈیا ریڈیو اردو زبان کو برباد کر رہا ہے۔ اس کی تو ہمیشہ ہی سے یہ پالیسی رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نامانوس فقروں سے احتراز کیا جائے، خواہ وہ کسی بھی زبان سے آئے ہوں۔

سوال: کیا حکومت آل انڈیا ریڈیو کو یہ ہدایت دینے جارہی ہے کہ اردو کی جگہ "ہندستانی" کا لفظ استعمال نہ کرے؟

جواب:۔ نہیں۔ اس کی وجہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔

ضمنی سوالات کے دوران سر ضیاء الدین نے پوچھا کہ ممبر برائے مواصلات ہندی اور اردو کے درمیان کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟ سر اینڈریو کلاؤ نے کہا کہ ان کا خیال ہے کہ آل انڈیا ریڈیو ان ہدایات پر عمل کر رہا ہے جن کے تحت ہندستانی کی یہ تعریف وضع کی گئی ہے

کہ یہ بنیادی طور پر گنگا کے بالائی دو آبہ کی زبان اور ہندستان کی لنگوا فرینکا ہے اور جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں لکھی جاسکتی ہے نیز یہ کہ ادبی سطح پر جب اسے بروئے کار لایا جائے تو فارسی اور سنسکرت الفاظ کے بے مہار استعمال سے یکساں طور پر احتراز کیا جائے۔ مزید ضمنی سوالات کے جواب میں سر اینڈر یوکلاؤ نے کہا کہ تمام زندہ زبانیں تبدیلی کے عمل سے گذرتی ہیں اور وہ خود اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اردو اور ہندی میں جو نمایاں فرق ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ایک میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے اور دوسری میں سنسکرت الفاظ کی۔

ان تمام اختلافات اور دشواریوں کے درمیان جن سے شمالی ہند خود پریشان اور الجھا ہوا ہے ہم جنوبی ہند کے لوگ کیا کریں؟ ہمیں شدید قسم کی الجھن در پیش ہے اس لیے نہیں کہ ہندستان کے لیے ایک مشترکہ زبان کے تصور یا فیصلے سے ہمیں اختلاف ہے بلکہ اس لیے کہ اس معاملے میں کوئی حتمی اور واضح بات سامنے نہیں آتی کہ آخر ہمیں کون سی زبان سیکھنی ہے؟ مدراس میں کانگریس حکومت نے ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کی اور اس کا قاعدہ بھی شائع کیا لیکن اگر شمال ہی کے دوست ہندی اور اردو کے نام پر لڑتے رہے تو کیا ہم جنوب والے اس سلسلے میں اپنی سرگرمیوں کو اس وقت تک کے لیے معطل کر دیں جب تک کہ شمال کے لوگ اپنے اختلافات دور نہیں کر لیتے۔ یہ مسئلہ اب صرف شمالی ہند نیز اردو کا نہیں کہ جو اس وقت ہنگامی نوعیت کے تنازعے میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ ہم جنوب والے بھی اس سلسلے میں رول ادا کرنے کا دعویٰ پیش کرتے ہیں اور میری ناقص لیکن غور خوض پر مبنی رائے یہ ہے بنیادی الفاظ کی ایک فہرست کے علاوہ کم از کم ایک ہزار الفاظ اور محاوروں پر مبنی ایک ایسی فہرست بھی تیار کی جانی چاہیے جس میں دونوں طرف کی کلاسیکی زبانوں سے یکساں طور پر استفادہ کیا گیا ہو۔ ہندو اور مسلمان دونوں ان الفاظ کو لازمی طور پر سیکھیں کیونکہ ان میں سے نصف کے قریب الفاظ دونوں حلقوں کے لیے اجنبی ہوں گے۔

روز مرہ استعمال کے ایسے بہت سے الفاظ کی مثال ہم پیش کر سکتے ہیں جنھیں

دونوں فرقوں کے لوگوں کو لازمی طور پر سیکھنا چاہیے۔دونوں طرح کے الفاظ کا استعمال ضروری نہیں ہوگا البتہ بہت بڑے مجمع کو خطاب کرنے کے لیے دونوں کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔ایسی زبان کا استعمال جسے سمجھنے میں کسی ایک آدمی کو بھی دشواری ہو مناسب نہیں ہوتا اور جب معاملہ سینکڑوں افراد کا ہو تب تو اور زیادہ غیر مناسب ہوتا ہے۔ہمارے معاشرے کی جو نوعیت ہے اس کا فطری تقاضہ ہے کہ ہندو کم از کم ایک ہزار عربی اور فارسی کے الفاظ لازمی طور پر سیکھیں اور اسی طرح مسلمان بھی سنسکرت کے اتنے ہی الفاظ سیکھیں۔اگر وہ انتہائی سنسکرت آمیز یا انتہائی فارسی آمیز زبان استعمال کرنا چاہیں گے تو انھیں ایک دوسرے سے دور ہو جانے سے روکنا مشکل ہوگا۔زبان اسی وقت اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے جب وہ ہمہ گیر نوعیت کی ہو۔بلاشبہ یہاں ہمہ گیر سے مراد محدود پیانے کی ہمہ گیریت ہے ہمارا اصل مقصد تو ایک دوسرے کو سمجھنا اور سمجھانا ہوگا۔

☆☆☆

دھیریندر ورما

ہندی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ "غریب کی بیوی پورے گانو کی بھابھی ہوتی ہے"۔ یہ کہاوت اس وقت پورے طور پر ہندستان کے دس کروڑ سے زیادہ ہندی بولنے والوں پر صادق آتی ہے جو تعداد میں سب سے زیادہ ہیں لیکن ان میں تنظیم کا فقدان ہے۔

ہندستان میں دوسری زبانیں بولنے والے یا تو ایک ہی صوبے میں رہتے ہیں مثلاً بنگالی، آسامی اور پنجابی (ان کے علاوہ اڑیہ اور آسامی بھی اسی زمرے میں شامل ہونے والے ہیں) یا پھر کئی زبانیں بولنے والے گروپ ایسے کسی صوبے میں رہتے ہیں جسے انتظامی سطح پر ایک صوبہ مانا گیا ہے۔ اس زمرے میں تمل اور تیلگو بولنے والے شامل ہیں جو مدراس پریسیڈنسی میں رہتے ہیں۔ یہی صورت حال مراٹھی، گجراتی اور سندھی بولنے والوں کی ہے جو بمبئی پریسیڈنسی میں آباد ہیں۔ کنڑ بولنے والوں کا صدر مقام میسور، ملیالم کا ملیالم ٹراونکور، کشمیری اور نیپالی کا نیپال ہے۔ لیکن ہندی بولنے والوں کا حلقہ کچھ اتنا وسیع ہے کہ انتظامی سہولیات کے پیش نظر یہ کئی صوبوں میں بٹا ہوا ہے۔ پانچ برطانوی صوبوں کی ادبی زبان ہندی ہے۔ ان میں صوبہ متحدہ آگرہ واودھ (جس کا نام انڈین نیشنل کانگریس نے صوبہ ہندر کھا ہے) بہار خاص، سنٹرل پروونسز (سی پی) دلی اور اجمیر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی بولنے والے ایسے دوسرے متعدد صوبوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں جنھیں دو انتظامی ایجنسیوں میں شامل کیا گیا ہے۔ مثلاً راجپوتانہ ریجنسی اور سنٹرل انڈیا ریجنسی۔ دوسرے لفظوں میں ہندی بولنے والے پورے شمالی ہند کے وسطی خطے (قدیم مدھیہ دیش) پر قابض ہیں جو

مغرب میں جیسلمیر سے سندھ اور گجرات کی سرحد سے شروع ہو کر مشرق میں بھاگلپور یعنی بنگال کی سرحد تک اور شمال میں ہری دوار سے شروع ہو کر جس کی سرحد پنجاب سے ملتی ہے جنوب میں بستر تک مدراس پریسیڈینسی کی سرحد پر ختم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اتنی بڑی آبادی کے باعث مختلف قسم کی پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ یہ پیچیدگیاں مختلف نوعیت کی ہیں۔ مثلاً انتظامی اور اقتصادی، مذہبی اور سماجی، ادبی اور لسانی غرضیکہ بے شمار پریشانیاں در پیش ہیں۔ بہر حال اس وقت میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندی زبان اور اس کے رسم خط سے متعلق ان تنازعات تک گفتگو کو محدود رکھا جائے جو اس وقت بڑی شدت سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

ہندی اور اردو تنازعہ

اردو کا ارتقا اور ہندی کی دوسری بولیوں سے اس کا رشتہ

حالیہ تنازعات کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ تمام کے تمام بیرونی لوگوں سے متعلق ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا بھی تعلق ایسے کسی مسئلے سے نہیں ہے جو خود ہندی والوں کی قدرتی مشکلات کے باعث پیدا ہوا ہو۔ یہاں میں نے "بیرونی" کی اصطلاح لازمی طور پر غیر ہندستانیوں کے لیے نہیں استعمال کی ہے بلکہ اس کا خصوصی اطلاق ان ہندستانیوں پر ہوتا ہے جو ہندی بولنے والی آبادی کے لیے اجنبی ہیں۔ خواہ ایسا لسانی سطح پر ہو یا تہذیبی سطح پر۔ ان میں جو پہلا اور سب سے بڑا تنازعہ ہے، اسے عام طور سے ہندی اردو تنازعے کا نام دیا گیا ہے اور کچھ سرکاری اور نیم سرکاری ہمدردوں کے طفیل اس سوال نے تکونی شکل اختیار کر لی ہے۔ یعنی ہندی اردو اور ہندستانی۔

اس مسئلے کی اصل جڑ تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ان حالات کا اجمالاً جائزہ لیا جائے جن کے تحت ہمارے ملک میں اردو کا ارتقا ہوا۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اردو ہندی ہی کی ایک شکل ہے جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے اور کبھی

کبھی تو قواعد بھی انہی زبانوں کی در آتی ہے اور اس کا ادب ایران، وسطی ایشیا اور عرب سے تہذیبی سطح پر فیضان حاصل کرتا ہے۔ شروع میں جن غیر ملکیوں نے ہندستان میں مہم جوئی کی وہ کئی زبانیں بولتے تھے مثلاً عربی، فارسی، ترکی اور منگولی وغیرہ۔ لیکن ہندستانی حکمرانوں کی زبان فارسی رہی۔ چونکہ انھوں نے اپنی حکومتیں شمالی ہند میں قائم کی تھیں اس لیے وہاں کے لوگوں سے رابطے قائم رکھنے کے لیے انھوں نے دلی کے آس پاس بولی جانے والی بولی کا سہارا لیا لیکن اس مقامی بولی میں در اصل غیر ملکی الفاظ کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس کی ایک مثال یوں دیکھیے— ''ہم مصنفین میں سب سے زیادہ نقص یہ ہے کہ ہم لوگ قارئین کے جذبات کا اندازہ نہیں کر سکتے''۔ اب اسی بات کو متوازی طور پر آج انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے ہندی داں یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ ''ہم رائٹرز میں سب سے بڑا defect یہ ہے کہ ہم لوگ readers کی feelings کو realise نہیں کر سکتے''۔ ادبی مقاصد کے لیے جب اس کا استعمال ہوا تو یہی ملی جلی مقامی زبان عربی، فارسی رسم خط کی قدرے تبدیل شدہ شکل میں لکھی جانے لگی۔ اسے عام طور پر اردو رسم خط کہتے ہیں۔ سیاسی وجوہ سے اس بولی نے کسی حد تک اہمیت حاصل کر لی اور ہندی بولنے والے ان لوگوں نے اسے اختیار کر لیا جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور جو ہندی والے علاقے کے شہروں میں آباد تھے۔ فارسی کے بعد یہی ان کے لیے بہترین زبان تھی کیوں کہ فارسی میں مہارت حاصل کرنا مشکل امر تھا۔ عملی ضروریات کے تحت ان ہندوؤں کو بھی یہ زبان سیکھنا پڑی جو ملک کی انتظامیہ میں ملازمت کے خواہاں تھے۔ اردو کے ارتقا کی مختصر کہانی یہی ہے۔

ایک ہندستانی بولی پر مبنی نیم سرکاری غیر ملکی شکل والی اس زبان کے شانہ بشانہ لوگ ہندی کی دوسری بولیوں کو بھی ادبی اور مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ مارواڑی، برج، اودھی اور میتھلی ان میں سے کچھ خاص بولیاں تھیں۔ ہر ایک کا ستارہ صدیوں تک چمکا۔ ہندوؤں کے حقیقی قومی کلچر کو انہی بولیوں کے وسیلے سے اظہار کا موقع ملا۔ ان بولیوں کو بلا تفریق مذہب سب لوگ استعمال کرتے تھے رَس کھان نے معیاری برج

میں شاعری کی اور جائسی نے خالص اودھی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ مسلمانوں کی حکمرانی جب تک قائم رہی، کھڑی بولی اردو کو ہندوؤں نے غیر ملکی چیز سمجھا اور عام طور سے لوگ پوری دیانت داری سے اس سے گریز کرتے۔ البتہ سرکاری اور نیم سرکاری حلقے مستثنیٰ تھے۔ لیکن دلی سے مغل حکومت کے خاتمے کے بعد یہ تعصب دھیرے دھیرے کم ہو گیا۔ انیسویں صدی میں ہندوؤں نے کھڑی بولی کو ادبی زبان کے طور پر اختیار کیا۔ لیکن اسے غیر ملکی اثرات سے نجات دلانے کے بعد ہی انھوں نے ایسا کیا یعنی غیر ملکی الفاظ رسم خط اور غیر ملکی ادبی تصورات سے اسے پاک کیا اور اس کی حقیقی مقامی شکل کو بحال کیا۔ یہی جدید کھڑی بولی ہندی ہے جو اس وقت پانچ برطانوی صوبوں اور دو مندرجہ بالا ہندستانی ریجنسیوں میں رہنے والے ہندی والوں کی تسلیم شدہ ادبی زبان ہے۔ اب ہم آسانی سے کھڑی بولی ہندی اور کھڑی بولی اردو کی تقابلی پوزیشن کو سمجھ سکتے ہیں۔

کلچر ـــــ ہندی اور اردو کے درمیان حقیقی تنازعہ

اردو کی موجودہ سرکاری پوزیشن میں ایک قابل ذکر تبدیلی ضرور آئی ہے پہلے اردو کو شاہی سرپرستی حاصل تھی جب کہ اس زمانے میں ہندی کی بولیوں کو نسبتاً اس طرح کے فائدے حاصل نہیں تھے۔ اس اعتبار سے آج کے زمانے میں ہندی اور اردو ایک ہی سطح پر آگئی ہیں۔ آج اردو کو جو سرکاری سرپرستی حاصل ہے وہ محض لسانی سطح پر ہے ادبی سطح پر نہیں۔ اگرچہ شاہی سرپرستی چھن گئی لیکن اردو کے پرستار بہرحال باقی رہے۔ ان میں وہ ہندو تھے، جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور زیادہ تر شہری علاقوں میں آباد تھے اور ان کی اپنی مادری زبان سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ ان میں پہلے کی نسلوں کے وہ عام ہندو بھی شامل تھے جن کی تربیت انیسویں صدی کے تہذیبی ماحول میں ہوئی تھی۔ ہند کے اہم شہروں میں رہنے والے کائستھ اور کشمیری اس طبقے کے مثالی نمونے ہیں لیکن ان کی تعداد اور قوت تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ مزید برآں اگرچہ ہندی بھی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے لیکن

یوپی کی عدالتوں میں اب بھی اردو کی روایت باقی ہے۔اسی وجہ سے یوپی کی عدالتوں سے وابستہ افراد اردو زبان اور رسم خط کا انتخاب کرتے ہیں۔

ہمارے حکمرانوں کی قومیت میں تبدیلی آجانے کے باعث نئے زمانے میں اردو کا مستقبل پہلے جیسا روشن نہیں رہا۔ ہم نے دیکھا کہ اردو کچھ خاص سیاسی حالات میں ارتقاپذیر ہوئی۔ وہ صورت حال تو بہت پہلے ختم ہو گئی۔ ہمارے موجودہ حکمرانوں کی مذہبی زبان لاطینی ہے عربی نہیں۔ان کی سرکاری زبان انگریزی ہے فارسی نہیں اور وہ جو رسم خط استعمال کرتے ہیں وہ رومن ہے۔ فارسی، عربی نہیں۔ عملی نقطۂ نظر سے اب اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انتظامی کاموں کے لیے ہندی عوام اردو زبان اور رسم خط کے لیے اصرار کریں۔ موجودہ حالات میں انگریزی آمیز ہندی اور رومن رسم خط کا مقدمہ زیادہ مضبوط ہے لیکن ہندی اور اردو کا جو فرق ہے وہ صرف الفاظ اور رسم خط کا نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ کھلی ہوئی سچائی یہ ہے کہ ہندی دیوناگری رسم خط کے ساتھ ہندی عوام کی بطور قومی زبان نمائندگی کرتی ہے جبکہ اردو زبان اور رسم خط غیر ملکی تہذیبی اثرات کی علامت ہے۔ لہٰذا ہندی اور اردو کے درمیان اصل تنازعہ تہذیبی سطح پر ہے۔انتظامی امور کے معاملے میں تو اردو کی اہمیت کب کی ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس تنازعے کا حل الفاظ اور رسم خط کا معاملہ چھیڑ کر نہیں تلاش کیا جا سکتا۔اس کے لیے تہذیبی تضاد کے ان ماخذوں کا مسئلہ سلجھانا ہو گا جن کی یہ دونوں زبانیں نمائندگی کرتی ہیں۔اس طرح ہندی عوام کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی زبان کے قومی روپ اور رسم خط کے فروغ پر اصرار کریں گے یا ایک ایسی زبان اختیار کریں گے جس کی تزئین و آرائش غیر ملکی زیورات کی مرہون منت ہے۔ یہ وہ سوال ہے جو صورتِ حال کا معقولیت پسندی کے ساتھ جائزہ لیے جانے کا تقاضہ کرتا ہے۔

ہندیوں کی صوبائی زبان ہندی

ہندی کو ہندیوں کی قومی زبان بنائے جانے کا سوال محض جذبات کا نہیں بلکہ بھر

پور معقولیت پسندی کا آئینہ دار ہے۔ ہندی کو اختیار کر کے ہندی آبادی ایک طرف سنسکرت، پالی اور پراکرت میں محفوظ اور اپنے قدیم ادب، رسم خط اور کلچر سے قریب رہے گی تو دوسری طرف ہندستان کی تقریباً تمام جدید زبانوں اور ان کے ادب سے رشتہ استوار کرے گی۔ ان میں بنگالی، مراٹھی، گجراتی، اڑیہ اور آسامی زبانوں کے علاوہ جنوب کی زبانیں مثلاً تمل، تیلگو، ملیالم حتیٰ کہ سنگھالی بھی شامل ہے۔ہندستان کی یہ تمام قومی زبانیں، سنسکرت، پالی اور پراکرت کے سرچشموں سے فیضان حاصل کرتی ہیں۔ ہندی زبان اور رسم خط کو ترک کر کے اور اس کی جگہ اردو اختیار کر کے ہندی والے نہ صرف یہ کہ اپنے قدیم کلچر سے رشتہ توڑلیں گے بلکہ پورے ہندستان سے بھی کٹ کر رہ جائیں گے اور اس کے عوض ان کے حصّے میں پنجاب کے ایک حلقے کی مشکوک صحبت (کیوں کہ پنجاب میں بھی سکھ پنجابی کے لیے آواز اٹھا رہے ہیں، جو پورے پنجاب کی مادری زبان ہے)، حیدر آباد کی اکلوتی ریاست (جہاں لوگ اپنی اپنی مادری زبانوں یعنی مراٹھی، تیلگو اور کنڑ کی آبیاری کر رہے ہیں) اور شاید ایک متوقع صوبہ سندھ آئے گا جس کی آبادی صرف 35 لاکھ کے قریب ہے۔ ان حالات میں اپنی پسند ظاہر کرنے میں بھلا کون پس و پیش کرے گا؟

مشترکہ زبان یا ہندستانی کا کمزور موقف

ہندستانی کا معاملہ تو اور زیادہ کمزور ہے، ہندستانی سے مراد ایک قسم کی آسان اردو ہے جو اپنے آپ میں اعلیٰ ادبی اور علمی کاموں کے لیے ناقص اور ناموزوں ہے۔ ہندستانی اکادمی کانفرنس کے صدر مسٹر سچدانند سنہا نے ایک دن ہندستانی کے موقف کی حمایت تو کی لیکن خود ان کی تقریر انگریزی میں تھی۔ جبکہ اکادمی کے سکریٹری کی یہ کوشش کہ ہندستانی میں لکھا جائے، وہاں موجود ہندی اور اردو کے اسکالرز کے لیے یکساں پریشانی کا باعث بنی۔ اس طرح کی مصنوعی زبان میں چند آسان مضامین اور کہانیاں تو لکھی جاسکتی ہیں، اس میں ہلکی پھلکی گفتگو تو کی جاسکتی ہے یا زیادہ سے زیادہ ابتدائی جماعتوں کے لیے اس زبان کے

قاعدے تو تیار کیے جاسکتے ہیں لیکن وہیں سے راستے جدا ہونے لگتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی دو غلی زبان کی طرح مشترکہ زبان کا موقف بنیادی طور پر کمزور ہے اور اس سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچا ہے۔اس کی وجہ سے طلبہ نہ تو ہندی میں مہارت حاصل کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں اور نہ اردو میں۔ لیکن اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ان صوبوں کے ذولسانی مسئلے کا حل پیش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ شروع کے نظام کی پہلی اور دوسری شکل،زبان کے اس مشترکہ نظام سے کہیں بہتر تھی۔ طلبہ دونوں زبانوں کو،ان کی اصل شکل میں پڑھتے اور مہارت حاصل کرتے تھے۔ایک کی اعلیٰ سطح پر اور دوسری کی ابتدائی شکل میں۔ لیکن اس بات کا بھی امکان موجود تھا کہ آگے چل کر مزید بہتر صورت ہو سکتی ہے۔ہندستانی کا سوال سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی نہیں ہے۔

ہندی اور اردو مسئلہ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو تہذیبی اور انتظامی امور کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔انھیں یہ بحث کرتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ جب مسلمان اردو کو چھوڑنا ہی نہیں چاہیں گے تو پھر ہندی والے صوبوں کا،دو زبانوں کا مسئلہ حل کیونکر ہوگا۔اس بحث میں کوئی دم نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں سوال اردو کو چھوڑنے کا نہیں بلکہ ہندیوں کے لیے ایک قومی زبان اختیار کرنے کا ہے۔اس کے علاوہ ایک بات اور غور طلب ہے۔یہ جو تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ ہندی والے علاقوں میں رہنے والے تمام مسلمان اردو بولتے ہیں یا یہ کہ غیر مسلم اردو بولتے ہی نہیں،وہ بالکل بے بنیاد ہے۔یوپی میں مسلمانوں کی جو 14 فی صد آبادی ہے،اس کا بڑا حصہ دیہاتوں میں آباد ہے اور وہ اپنے ہندو بھائیوں ہی کی طرح برج،اودھی اور بندیلی جیسی مقامی بولیوں کا استعمال کرتا ہے۔(بہار اور راجستھان جیسے دوسرے ہندی صوبوں میں تو اردو بولنے والے مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی کم ہے)۔اردو کے اصل پرستار، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، مٹھی بھر ہیں یعنی ان میں بیشتر وہی لوگ

ہیں جو شہروں میں آباد ہیں اور ان کی تعداد مجموعی آبادی کے مشکل سے 5فی صد حصے کا احاطہ کرتی ہے۔ ہندیوں کی 95فیصد آبادی جب ایک زبان کے لیے اپنا ذہن بنالے گی تو باقی پانچ فیصدی بھی جلد یابدیر اسی زمرے میں شامل ہو جائیں گے۔

ہندی اردو تنازعے کا حل

یہ تمام دلائل اور مباحث ہمارے ذولسانی مسئلے کے بارے میں ایک ہی نتیجے یا فیصلے کی جانب اشارہ کرتے ہیں حالانکہ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس مسئلے کو مبالغے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ایک ہی حل ہے اور اس کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ ہندی بولنے والے عوام میں مثبت انداز کی قوم پرستی کا جذبہ بیدار ہو کہ یہی جذبہ انھیں اپنی قومی زبان ہندی کے گرد مذہب و ملت، ذات اور طبقات کا امتیاز کیے بغیر متحد کرے گا۔ ٹھیک اسی طرح، جس طرح ہر بنگالی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، برہمو سماجی ہو یا سناتنی، برہمن ہو یا کائستھ بنگالی کو اپنی مادری زبان کہتا ہے یا جس طرح فرانسیسی خواہ وہ عیسائی ہوں یا یہودی، مسلمان ہوں یا جرمن یا انگریزی نسل کے، سب ایک قوم بن جاتے ہیں اور فرانسیسی کو اپنی قومی زبان تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح ہر ہندستانی کو ہندی زبان کو اپنی قومی زبان تسلیم کرنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ میری اس بات کا غلط مطلب نہیں نکالا جائے گا۔ میں اردو کے خوبصورت ادب، زبان اور رسم خط کو پڑھنے اور سیکھنے کے قطعی خلاف نہیں ہوں' مجھے اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ صوبائی زبان کے طور پر یہ ہندی کی رقیب بن جاتی ہے۔ لگے ہاتھوں میں اس بات کا بھی اشارہ کردوں کہ یورپی ماہرین لسانیات بھی اردو کو کسی خاص صوبے کی مادری زبان نہیں قرار دیتے۔ ایک اختیاری زبان کے طور پر نچلے سے اعلیٰ درجات تک اردو پڑھنے کی گنجائش ہونی چاہیے اور جن لوگوں کا اس کی طرف رجحان ہو انھیں اس کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ اس کا مطالعہ کریں۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندستان

میں ہر صوبے کی صرف ایک ہی تسلیم شدہ زبان ہونی چاہیے جس کا ایک ہی رسم خط ہو اور پھر قومی زبان اور صوبائی رسم خط ہو۔ یعنی ہندی والے صوبوں میں ہندی اور دیوناگری، بنگال میں بنگالی، گجرات میں گجراتی وغیرہ۔ دوسری زبانوں کو خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید ہندستانی ہوں یا غیر ملکی، اختیاری زبانوں کے طور پر پڑھنے کی اجازت ہونی چاہیے ابتدائی اور جدید اردو ادب کا مطالعہ کرنے کا بھی یہی طریقہ درست ہوگا۔

ہندی میں تکنیکی اصطلاحات وضع کرنے کا مسئلہ

ایک بار جب مندرجہ بالا اصول سمجھ لیا جائے گا اور اسے اختیار بھی کر لیا جائے گا تو تکنیکی اصطلاحات کا مسئلہ بھی کچھ زیادہ پریشانی کا باعث نہیں بنے گا۔ یہ مسئلہ بے وجہ ماہرین تعلیم، اسکالرز اور ادیبوں کے ذہن کو پراگندہ کرتا رہا ہے۔ باقی ہندستان کی طرح ہندی بولنے والے بھی اپنی تکنیکی اصطلاحات کے لیے بطور خاص سنسکرت اور پراکرت سے استفادہ کریں گے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح، یورپی زبانیں تکنیکی اصطلاحات اپنی کلاسیکی زبانوں سے حاصل کرتی ہیں۔ اس اصول کو اپنا لینے سے ہندی کے تکنیکی الفاظ بنگالی، مراٹھی، گجراتی، تمل اور تیلگو کی تکنیکی اصطلاحات جیسے ہی ہوں گے۔ اگر اس کے برعکس عربی اور فارسی سے الفاظ لیے جائیں گے تو ہندی پورے ہندستان سے کٹ کر رہ جائے گی۔ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ اردو بہر حال ہندستان کی درجن بھر ادبی زبانوں میں سے صرف ایک ہے۔ اس طرح کے سبھی معاملات میں ہندی والوں کے سامنے عملی سوال یہی ہوگا کہ وہ دس سے رابطہ رکھنا چاہتے ہیں یا صرف ایک سے۔ تعلیمی اداروں کے نچلے درجات میں اگر اس طرح کی پالیسی اپنائی جائے گی کہ Island کے لیے ''جزیرہ'' اور ''دویپ'' میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جائے تو یہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا اور اس سے ہماری تہذیبی بنیادوں پر ضرب پڑے گی۔

اس کے بعد کے مرحلے میں ہم اعلیٰ سائنسی علوم کی اصطلاحات کے مسئلے پر غور

کر سکتے ہیں۔اس ضمن میں مجھے ہانگ کانگ کے ایک چینی پروفیسر کی بات یاد آتی ہے جو حال ہی میں اسی کشتی میں سفر کر رہا تھا جس میں میں بھی سوار تھا۔سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کے مسائل کے حل کے سلسلے میں پوچھے گئے میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ بی اے ڈگری کی سطح تک تو طلبہ کو رائج یا اخذ کردہ چینی اصطلاحات کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ وہ اپنی زبان کی اصل شکل کو برباد نہیں کرنا چاہتے۔البتہ اعلیٰ ترین درجات کے طلبہ، محققوں اور خصوصی مطالعہ کرنے والوں کو اس بات کی پوری اجازت ہوتی ہے کہ وہ انگریزی اصطلاحات کا استعمال کریں کیونکہ اس حلقے کا غیر ممالک سے مسلسل رابطہ رہتا ہے اور انھیں تازہ ترین تحقیق سے بھی اپنے آپ کو باخبر رکھنا پڑتا ہے۔میرا خیال ہے کہ کم وبیش انہی خطوط پر ہمارے ملک میں بھی اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔

ہندی قواعد میں اصلاح

ہندی کا ایک اور مسئلہ بھی ہے جو ابھی حال ہی میں سامنے آیا ہے۔یہ مسئلہ ہندی قواعد میں اصلاح کا ہے۔ہندی زبان کو جو صوبائی اہمیت حاصل ہے ،اس سے قطع نظر ہندستان کے باقی حصوں میں اس کی حیثیت ایک بین صوبائی رابطے کی زبان بھی ہے۔جب کوئی گجراتی کسی بنگالی سے بات کرتا ہے یا بنگالی گجراتی سے تو عام طور سے دونوں ہندی کا سہارا لیتے ہیں ۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ غیر سرکاری طور پر ہندستان کی لینگوافرینکا ہے اور انڈین نیشنل کانگریس اسے پہلے ہی سرکاری طور پر بین صوبائی زبان تسلیم کر چکی ہے۔اس کی اس خصوصی حیثیت کی وجہ سے متعدد پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔جب دوسرے صوبے کے لوگ ہندی سیکھتے ہیں تو اس میں انھیں کچھ مشکلات درپیش ہوتی ہیں کیونکہ ہندی ان کی مادری زبان سے ، کئی اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔اس کی ایک مثال لیتے ہیں۔ہندی میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ بنگالیوں کو بڑی الجھن میں ڈال دیتا ہے کیونکہ ان کی زبان میں قواعد کی رُو سے تذکیر و تانیث کا مسئلہ نہیں ہوتا۔کچھ عرصے پہلے میں نے شانتی

نکیتن کے ایک پروفیسر کا مضمون پڑھا تھا جس کی حمایت کلکتہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے بھی کی تھی۔ اس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ تذکیر و تانیث کی وجہ سے صفت اور فعل میں قواعد کی رُو سے ہندی میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، انھیں اگر یہ چھوڑ دے تب ہی بنگالی اسے ہندستان کی لنگوافرینکا تسلیم کرنے کے سوال پر غور کر سکتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ وہ اگر اس طرح کی غلطی کرتے ہیں تو اسے درگذر کیا جائے کہ ایسی غلطی تو ان سے ہوتی ہی ہے، ان کا مقصد یہ تھا کہ خود ہندی والے بھی، جو تذکیر و تانیث کے معاملے میں غلطی نہیں کرتے، اس طرح کے جملے لکھیں اور بولیں۔ "ہاتھی جاتی ہے" اور "لومڑی بولا"۔ اگر اس طرح کے مشوروں پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا تو ہندی کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا ناممکن ہے۔ ایک طرح کی دشواری بنگالیوں کو پیش آسکتی ہے تو دوسری طرح کی پریشانی پنجابیوں کو لاحق ہو سکتی ہے۔ تمل والوں کو کسی اور ہی طرح کی پیچیدگی پیش آسکتی ہے۔ اگر ہندستان کی درجن بھر زبانوں کے بولنے والوں کی آسانی کے خیال سے ہندی میں اس طرح ردوبدل ہوتا رہا تو ہندی نام کی کوئی زبان باقی نہیں بچے گی۔ ہندی کو ہندستان کی لنگوافرینکا بنانے کے لیے اتنی بڑی قیمت ادا کرنا ناممکن ہے۔ اس صورت میں میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ یہ دس کروڑ ہندستانیوں کی صوبائی زبان ہی کی حیثیت سے باقی رہے کہ اس طرح کم از کم اس کی اپنی شکل تو باقی رہے گی۔ باقی کے پچیس کروڑ ہندستانیوں کے لیے اسے بین صوبائی زبان بنانے کی غرض سے ایک ہزار ایک طریقے سے اس کو اذیت دینا اور اس کی شکل بگاڑنا میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔

دراصل یہ مشورہ ہی بڑے انوکھے انداز کا ہے۔ ہندی ہی کی طرح فرانسیسی زبان میں بھی تذکیر و تانیث کا مسئلہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "کپڑے" کو وہ "Le drap" کہتے ہیں جبکہ "لباس" کو "La robe" کہتے ہیں۔ یا اسی طرح "میری ماں" کو وہ Ma mere" کہتے ہیں "اور میرا باپ" کو "Mon mere" کہتے ہیں۔ فرانسیسی زبان میں تذکیر تانیث کا یہ نظام یورپ کے دوسرے باشندوں کے لیے بڑی پریشانی کا باعث بنتا ہے
.

جو فرانسیسی کو برّ اعظم کی زبان مانتے ہیں لیکن ایسا میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے فرانسیسیوں کو یہ مشورہ دیا ہو کہ دوسروں کی آسانی کے لیے اپنی زبان میں ترمیم یا تبدیلی کریں۔ انگریزی میں ہجے اور قواعد کا معاملہ قطعی معقول نہیں ہے لیکن میرے علم کے مطابق کبھی بھی ہندستان یا پھر جرمنی، جاپان اور ایران کے ان لوگوں کی طرف سے جو اسے تجارتی یا دوسرے مقاصد کے تحت سیکھتے ہیں، انگریزی والوں کو اس طرح کا مشورہ نہیں دیا گیا کہ وہ اس صورت میں انگریزی سیکھیں گے جب "Daughter" کو "Doter" لکھا جائے یا یہ کہ "Bring" کا فعل ماضی "Bringed" بنادیا جائے یا "Ship" کے لیے ضمیر "She" کی بجائے "it" استعمال کی جائے۔ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ ہندی کو جو بین صوبائی زبان کی حیثیت ملے گی وہ قدرتی صورتِ حال اور اس کی اہمیت کے باعث ملے گی اور یہ دوسری زبان بولنے والوں کی ضرورت ہوگی نہ کہ اس زبان یا اس کے بولنے والوں پر کسی طرح کی مہربانی۔

ہندی کی معیاری شکل

ہندی کا ایک اندرونی مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ کھڑی بولی ہندی کا استعمال ہندی کی دوسری بولیوں والے کیسے کریں۔ بہار اور بنارس گورکھپور کمشنریوں کے لوگوں کو دلی اور میرٹھ کے علاقے کے محاورے استعمال کرنے میں قدرے دشواری ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اودھ کے لوگ بھی کھڑی بولی استعمال کرتے وقت کبھی کبھی پھوہڑپن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جب مشرقی خطے کے کسی ہندی ادیب سے کوئی سہو ہو جاتا ہے اور اس کے لیے وہ تنقید کا نشانہ بنتا ہے تو وہ کچھ پشیمانی سی محسوس کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس نے جو کچھ استعمال کیا ہے اسے جائز ٹھہرائے یا پھر یہ تجویز پیش کرے کہ اس معاملے میں تھوڑی سی لچک کی گنجائش ہونی چاہیے۔ یہ رویہ بھی درست نہیں ہے۔ جب کسی خاص خطے کے وسیع تر علاقے کی بولی کو ادبی زبان تسلیم کرلیا جائے تو اس علاقے کے محاوروں اور لہجے کو ہی معیاری تصور کرنا چاہیے۔ جب

برج ہمارے ملک کی ادبی زبان تھی تو برج منڈل کے محاوروں کو معیاری تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج جبکہ کھڑی بولی کو وہ مقام حاصل ہو چکا ہے تو پھر کسی بھی معاملے میں اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں دلی اور میر ٹھ والے محاوروں اور روزمرہ کو صحیح اور معیاری تصور کرنا چاہیے۔ دہی اچھا ہے، دہی اچھی نہیں ہے۔ میں نے کھایا، ہم نہیں کھایا۔ زبان کے معاملے میں استحکام کے لیے نظم وضبط دوسرے سماجی اداروں کی طرح بہت ضروری ہے۔

دیوناگری لپی اور رومن رسمِ خط

ہندی زبان سے متعلق تنازعات کی گفتگو کے دائرے سے باہر نکل کر اب ہم دیوناگری رسم خط سے متعلق کچھ مسائل پر گفتگو کریں۔ دیوناگری رسم خط سے متعلق جو مشکلات ہیں ان میں سے بھی بیشتر کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کی زبانوں کے رسم خط اس سے مختلف ہیں۔ اس کی جگہ اردو رسم خط استعمال کرنے کا خیال تو اب پیچھے چلا گیا۔۔۔ لیکن بھلا ہو انگریزی جاننے والے ہندستانیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا جو بچپن ہی سے رومن رسم خط سے آشنا ہو جاتے ہیں، کہ ان کے طفیل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ دیوناگری کی جگہ کیوں نہ رومن رسم خط اختیار کر لیا جائے۔ کچھ عرصہ قبل پیرس کے ایک کیفے میں اپنے ایک بنگالی دوست کے ساتھ میں اس مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا۔ اس جگہ کا خوشگوار ماحول دیکھ کر اس نے مہر سکوت توڑتے ہوئے زبان کھولی۔ اس نے کہا کہ یہ بات اب ناگزیر سی لگتی ہے کہ ہندستان کی لینگوافرینکا ہندی ہی ہوگی کیونکہ لمبی مدت تک انگریزی کو برقرار رکھنا مشکل ہوگا لیکن لوگوں پر ایک نئے رسم خط کا بوجھ کیوں ڈالا جائے بنگال کے لوگ رومن رسم خط سے واقف ہیں اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ رومن رسم خط کو ہی ہندستان کے بین صوبائی رسم خط کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔

اب ہندی کی طرح دیوناگری رسم خط بھی ہندی عوام کا قومی رسم خط بن چکا ہے۔ اس کے پیچھے کم از کم 2,500 سال کی تاریخ ہے اور اردو کو چھوڑ کر ہندستان کے

دوسرے رسم خط کے یہ قریب ہے اس لیے ہندی عوام کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اسے ترک کر کے ایک غیر ملکی رسم خط اختیار کریں۔ ہمارے لیے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دیوناگری کو بین صوبائی رسم خط تسلیم کیا جاتا ہے یا نہیں۔ ایک لمحہ کے لیے فرض کیجئے کہ 100 سال کے لگاتار پروپگنڈے کے بعد ہم نے دیوناگری کی جگہ رومن رسم خط کو اپنالیا اور فرض کیجئے کہ ہندستان سے برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ جاپانی حکومت برسر اقتدار آجاتی ہے تو کیا اس وقت ہم رومن رسم خط کو بھلا کر جاپانی رسم خط کو اختیار کرلیں گے ؟ اپنی چیزوں یا اداروں کی جگہ غیر ضروری طور پر غیر ملکی چیزیں اختیار کرنے کا خیال، آرام کرسی پر بیٹھنے والے سیاست دانوں کا بڑا پسندیدہ موضوع ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد مٹھی بھر ہوتی ہے جو بہت بڑے شہروں میں رہتے ہیں یا پھر ان میں کچھ اسکالرز بھی شامل ہوتے ہیں جو اپنی تہذیبی شناخت کھو چکے ہیں۔ ملک کے اصل عوام بھلا اس طرح کے خیال کو کیوں اپنے پاس بھٹکنے دیں گے جو خودکشی کا اعلانیہ ثابت ہو؟

ہندی رسم خط میں اصلاح

جہاں تک ہندی رسم خط کی اصلاح کا معاملہ ہے یہ ایک قطعی مختلف چیز ہے لیکن جس طرح اس مسئلے پر باتیں ہونے لگی ہیں وہ بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں ہیں۔ ایک دن میں نے نام نہاد خصوصی مہارت رکھنے والے ایک صاحب کا مضمون پڑھا جس میں انھوں نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ دیوناگری رسم خط میں تبدیلی کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے حروف اس مشین میں مناسب انداز سے نصب نہیں ہوپاتے جو اصلاً رومن رسم خط کے لیے ایجاد کی گئی تھی۔ یہ تو بالکل وہی بات ہوئی کہ کوئی پرانا سوٹ (Second hand Suit) خریدنے جائے اور سوٹ اس کے جسم کے ناپ کا نہ ہو تو دکان دار یہ کہے کہ جسم میں نقص ہے لہٰذا اسے کاٹ چھانٹ کر ایسا بنادیا جائے کہ سوٹ جسم پر فٹ آجائے۔ میں نے کبھی کسی ایسی تحریک کے بارے میں نہیں سنا جو رومن رسم خط کی اصلاح کے لیے چلائی گئی ہو۔ حالانکہ یہ

رسم خط نقائص سے پاک نہیں ہے۔ خواہ عام چھپائی کا معاملہ ہو یا Lino-type مشین کا، یہ چیزیں رسم خط کی ضرورت کے مطابق ایجاد کی گئیں لیکن جب ہمارا معاملہ ہوتا ہے تو الٹی بات کہی جاتی ہے۔

ابھی حال ہی میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہندی ساہتیہ سمیلن نے ہندی رسم خط میں اصلاح کے سوال پر غور کیا ہے۔ گاندھی جی کے پاس خود تو اتنا وقت نہیں ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے معاملات کی تفصیل میں جائیں لہٰذا انھوں نے قدرتی طور پر یہ کام اپنے حامیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مشیروں نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ گجراتی رسم خط کے طرز پر ہندی کو بھی چاہیے کہ ہر حرف کے اوپر جو خط کھینچا جاتا ہے اسے ترک کر دے۔ حالانکہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہندی کے رسم خط کی یہ نمایاں خصوصیت ہے۔

میں ایک بار اور ہندی عوام سے کہوں گا کہ وہ اپنی دشواریوں کا حل تلاش کرنے کے لیے دوسروں کے یہاں نہ جائیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے بنگال کے ممتاز شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک انٹرویو کے بارے میں پڑھا۔ متعدد سوالوں کے علاوہ انٹرویو کرنے والے نے عظیم شاعر سے یہ سوال بھی کیا کہ ہندستان کے مشترکہ رسم خط کے طور پر دیوناگری رسم خط کس حد تک موزوں ثابت ہوگا۔ رپورٹ کے مطابق، شاعر نے مسکرا کر کہا "اسی مقصد کے لیے بنگالی رسم خط کے بارے میں کیا خیال ہے؟"۔ میں حقیقتاً یہ بات سمجھ نہیں پایا کہ اچانک سارے نقائص ہمارے ہی رسم خط میں کیوں در آئے حالانکہ کم از کم ہندستان کے دوسرے تمام رسم خطوں سے یہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندی رسم خط میں سنگین نوعیت کا کوئی نقص نہیں ہے۔ کچھ چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے بارے میں تو غور کیا جا سکتا ہے مثلاً ष کی جگہ श اور ऋ کی جگہ रि استعمال کیا جائے یا مراٹھی میں रा کی جگہ ण استعمال کیا جائے۔ لیکن یہ تو قطعی مختلف بات ہے۔

خلاصہ

یہاں میں نے ہندی زبان اور رسم خط سے متعلق اہم تنازعے پر مختصر گفتگو کی ہے۔ یہ وہ تنازعات ہیں جن کے باعث عوام کے ذہن پراگندہ ہوئے ہیں اور یہ حال ہی میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ زبان یا رسم خط میں اچانک اور بغیر سوچے سمجھے اہم تبدیلی کرنا مناسب نہیں ہوتا، خاص طور سے اس صورت میں جب وہ قدیم روایات اور عوام کے جذبات کے منافی ہوں۔ ترکی اور آئرلینڈ کی مثالیں سامنے ہیں جہاں تبدیلی "قومیائے" جانے کی سمت تھی، مخالف سمت کو نہیں۔ ترکی نے عربی کو ترک کر دیا اور ترکی زبان کو ریاست کی زبان قرار دیا۔ اس نے عربی رسم خط کو ترک کر دیا لیکن چونکہ وہاں کوئی مناسب قومی رسم خط موجود نہ تھا اس لیے رومن رسم خط کو اپنا لیا گیا۔ آئرلینڈ نے انگریزی کو ترک کر کے اپنی قومی بولی کو اپنا لیا۔ کیا یہ مثالیں ہمارے مسائل پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں؟ جہاں تک اصلاح کا سوال ہے مجھے معلوم ہے کہ فرانسیسی اکادمی (French Academy) جیسا پرانا اور مستحکم ادارہ بھی ابھی تک فرانسیسی زبان میں کوئی اہم تبدیلی کرنے کا اہل نہ ہو سکا۔ بہر حال میں یہاں اس پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہندی زبان اور رسم خط سے متعلق مسائل کا جائزہ خود ہندی والوں کو لینا چاہیے اور وہ بھی اپنی خامیوں اور خوبیوں کے نقطۂ نظر سے۔ "اجنبی" لوگوں کی رائے پر خاص طور سے ان لوگوں کی جو ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن تہذیبی سطح پر ہم سے مختلف ہیں کافی سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے غور کرنا چاہیے۔ یہ ایک ایسی وارننگ ہے، جس میں شاید بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔

ہمایوں کبیر

ہندستانیت کے احساس کی حوصلہ افزائی کرنا، آج کا ہمارا ایک اہم کام ہے کیونکہ اسی پر آزاد وفاقی جمہوریہ کی قسمت کا دارومدار ہے اور یہی سیاسی طور پر تمام باشعور ہندستانیوں کی منزل مقصود بھی ہے۔ ہمارے جیسے وسیع ملک میں جہاں حملوں کی تابڑتوڑ لہریں کئی طرح کی نسلوں کو کھینچ لائیں؛ تہذیبی اور تاریخی سطح پر تنوع پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ ان اختلافات کی وجہ سے جو علاحدگی پسندانہ رجحانات پروان چڑھتے ہیں ان کے باوجود ہندستان کی تاریخ، اتحاد قائم کرنے والی ایک ایسی گہری اسپرٹ کی بھی پردہ کشائی کرتی ہے جو اس بات کی مظہر بن جاتی ہے کہ ہندستانی تہذیب کو یکے بعد دیگرے باہر سے آنے والوں نے ان عناصر سے مالا مال کیا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ یکجہتی قائم کرنے والے اس عمل میں کسی نہ کسی مشترکہ زبان کا رول بہت اہم رہا ہے اور ہم ہندستان کی تاریخ کے ہر دور میں یہ دیکھتے ہیں کہ ایک مشترکہ زبان وضع کرنے کی کوشش کی گئی۔ سنسکرت جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے اسی طرح کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ لفظ سنسکرت کے معنی شائستہ یا مہذب کے ہوتے ہیں اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پورے ہندستان میں مہذب افراد کی زبان تھی جو "پراکرت" یعنی اس قدرتی انداز کی زبان سے مختلف تھی جو مختلف علاقوں کے ناخواندہ

لوگ بولتے تھے۔ پالی جو بنیادی طور پر ایک پراکرت بولی تھی بودھ مت کے فروغ کے ساتھ اہمیت اختیار کرتی گئی اور شاید ایک ایسا وقت بھی آیا جب اس نے خود سنسکرت کی بالادستی کو چیلنج کر دیا لیکن جب بودھ مت پر ہندو نشاۃ ثانیہ نے غلبہ حاصل کر لیا تو سنسکرت کی پہلے والی حیثیت پھر بحال ہو گئی۔ دلی میں جب افغان اور اس کے بعد ترک اقتدار پر قابض ہوئے تو سنسکرت کی جگہ فارسی کو غلبہ حاصل ہو گیا لیکن سنسکرت جس وسیع تر علاقے تک پھیلی ہوئی تھی وہ فارسی کے حصے میں شاید کبھی نہ آیا۔ بہرحال فارسی ہندستان کے بہت بڑے حصے کے مہذب اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی زبان بن گئی۔ اس میں وہ علاقے بھی شامل تھے جنھوں نے سلطانوں کے اقتدار کے خلاف مزاحمت کی تھی۔ اردو یعنی لشکر کی زبان تقریباً خود بخود فروغ پا رہی تھی۔ اس کی بنیاد پراکرت تھی اور اس نے اسلامی مآخذ سے آزادانہ طور پر فیض حاصل کیا اور اس طرح نسلوں اور علاقوں کے درمیان اظہار کا ایک ذریعہ بن گئی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد فارسی اور اردو نے انگریزی کے لیے جگہ خالی کر دی کیونکہ یہ حکمرانوں کی زبان تھی اور ان کے کلچر کی نمائندگی کرتی تھی لیکن اس مرحلے میں یہ تبدیلی خود ایک مشترکہ زبان کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے۔

ایسی مشترکہ زبان کی ضرورت کا احساس جو ہندستان کی مختلف نسلوں، تہذیبوں اور روایات سے تعلق رکھنے والے حلقوں کے درمیان رابطے کا کام دے، ہندستان کی تاریخ کا ایک بڑا سبق ہے۔ اور ایسا اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ بیشتر ہندستانی زبانوں کے ڈھانچوں میں یکسانیت ہے اور بیشتر معاملات میں ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی مشترک ہے۔ غیر ممالک کے لوگ بلاشبہ اس بات کو دہراتے رہتے ہیں کہ ہندستان کی حیثیت ایک برِاعظم جیسی ہے اور زبانوں کے معاملے میں یہاں برِاعظم جیسی رنگارنگی پائی جاتی ہے لیکن دوسری بہت سی گھسی پٹی باتوں کی طرح یہ بات بھی جزوی طور پر ہی درست ہے۔ بالائی ڈھانچے میں پائے جانے والے بہت سے اختلاف کے باوجود ہندستان کی متعدد صوبائی زبانوں کے درمیان بنیادی نوعیت کی یکجہتی یا مماثلت موجود ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تلفظ، لہجہ اور آوازوں کے

اتار چڑھاؤ میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کے باوجود یکسانیت صاف جھلکتی ہے۔اس کا اندازہ ایک معمولی آدمی بھی اجمالی مشاہدے کے بعد کر سکتا ہے۔

بہر حال انھی بالائی اختلافات نے خواہ مخواہ بنیادی مماثلت کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ماضی میں ترسیل کی دشواریوں نے ان اختلافات کو بڑھاوادیا۔ آج ترسیل اور رابطے کے معاملے میں آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ انگریزی کو بہت بڑے پیانے پر فروغ حاصل ہوا۔ان دشواریوں کے باوجود جن سے سنسکرت اور فارسی شاید آزاد تھیں،اور اردو یقیناً آزاد تھی ،انگریزی اتنی تیزی سے پھیلی جتنی تیزی سے ماضی میں کوئی بھی مشترکہ زبان نہیں پھیل سکی تھی۔یہ اتنی تیزی سے ہماری زندگی میں سرایت کر گئی ہے کہ آج ایک ایسا مکتب خیال بھی پیدا ہو گیا ہے جو یہ یقین کرنے لگا ہے کہ ہندستان کا کام انگریزی کے بغیر نہ آج چلے گا اور نہ آئندہ کبھی۔ان کا کہنا ہے اور جس کا بڑی حد تک جواز بھی موجود ہے کہ اس نے ہندستانی قومیت کا شعور بیدار کرنے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔اس نے جتنے بڑے پیانے پر ہندستان میں مشترکہ زبان اور انداز فکر کو بڑھاوادیا ہے اتنے بڑے پیانے پر اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔یہ مشترکہ اقتصادی اور سیاسی رابطوں کی علامت ہے۔

حد تو یہ ہے کہ اقتصادی اور سیاسی آزادی کی جدوجہد میں بھی انگریزی کا ایک رول ہے۔ابھی حال تک ہندستان کا سیاسی طور پر بیدار اور باشعور طبقہ انگریزی داں ہوا کرتا تھا بلکہ اب تک کچھ وہی صورت حال ہے۔کانگریس اور دوسرے کل ہند قسم کے سیاسی اداروں میں آج بھی بحث ومباحثے انگریزی ہی میں ہوتے ہیں۔ابھی حال تک جو تقریریں سب سے زیادہ سمجھی اور پسند کی جاتی تھیں وہ انگریزی زبان ہی میں ہوتی تھیں یعنی ایک غیر ملکی زبان میں۔حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی دو قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ تقریریں تو کبھی کبھی مادری زبان میں بھی کی جا سکتی ہیں لیکن انھیں بھی انگریزی تقریر کا ہندستانی روپ کہا جا سکتا ہے۔ان تقریروں میں خیالات اور ذہنی رویے، بحث کے موضوعات اور انداز اظہار یہاں تک

کہ جملوں کی ساخت بھی انگریزی جیسی ہوتی ہے البتہ الفاظ ہندستانی زبان کے ہوتے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے بالغ نظری سے جب اس مسئلے پر غور کیا تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ ہندستان کے اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی آزادی حاصل کرنے سے قبل ہی غیر ملکی زبان کا جور و جبر ختم ہو جانا چاہیے۔ آزادی تو بیدار ہونے والے عوام کی توانائی کے سہارے ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور انھیں بیدار کرنے اور اس جدوجہد میں شامل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کی جائے۔ آزادی کامل حاصل کرنے کا عزم کرنے والی کانگریس کے ایک انقلابی عوامی تنظیم بن جانے کے بعد، مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ ایک بار پھر ابھر کر سامنے آگیا ہے۔

اس محاذ پر انگریزی کا بلاشبہ ایک رول رہا ہے کیونکہ دورِ حاضر میں اس کا جو زبردست پھیلاؤ ہوا ہے (وہ بھلے ہی بالائی سطح پر ہوا ہو) اس کے باعث ہندستان کی عوامی زندگی میں بڑی گہرائی تک حرکت پذیری آئی ہے، لمبے عرصے تک جو سماج جمود کا شکار رہا اسے ایسی تحریک ملی کہ زندگی کے نئے افق تلاش کرنا ممکن ہو سکا۔ ہندستان جیسے ملک میں' جہاں معاشرہ نہ جانے کس زمانے سے ماضی کے بوجھ تلے دبا بے حس و حرکت پڑا ہو، وہاں کوئی بھی چیز ذرا سی بھی حرکت پیدا کرلے تو وہ ترقی کا ایک عامل بن جاتی ہے لیکن جو کچھ حاصل ہوا اس کا منطقی نتیجہ یہ رہا کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ حلقوں کے درمیان بیگانگی بڑھی، ہندستان کی قومی زندگی میں دراڑیں پڑیں جن کے باعث خود سیاسی آزادی کی جدوجہد کمزور پڑ گئی۔

انگریزی کی بالادستی نے ایسے بیج بو دیے جو بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس نے دائمی قسم کی ناخواندگی کو بڑھاوا دے کر ہندستانی عوام کی اکثریت کو ایک طرح سے سزا دی اور ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہو جانے کا خطرہ پیدا کر دیا جس میں جذباتیت اور تعصبات کو کھل کھیلنے کا موقع ملے۔ یہ توقع کرنا محض ایک واہمہ تھا کہ ہندستان کی تیس کروڑ سے بھی زیادہ کی آبادی، انگریزی کو کبھی اپنی مشترکہ زبان بنائے گی یا بنا سکے

گی۔ مواصلات کی سہولیات اور بطور عدالتی زبان اس کے رول نے بلاشبہ ہندستان میں اس کی پوزیشن کو مستحکم کیا لیکن شاید اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ پرائمری درجات کو چھوڑ کر ہر سطح پر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا تو سیاسی بنیاد پر تھا لیکن اس کے مضمرات سیاست کے عام دائرے سے بھی بہت آگے تک تھے۔

تمام ماہرینِ تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ کسی غیر ملکی زبان میں کام کرنا بہت بڑے پیمانے پر توانائی ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف طلبہ کو بدحال کر دیتا ہے اور ان سے اصل تخلیقی کام کی صلاحیت چھین لیتا ہے بلکہ خود تعلیم کے اصل مقصد کو ناکام بنا دیتا ہے۔ طالب علم اپنی مادری زبان میں کام کر کے اپنے مطالعے کے اصل مقصد پر نظر مرکوز رکھتا ہے لیکن اگر ذریعۂ تعلیم کوئی غیر ملکی زبان ہے تو اس کی تمام تر توجہ زبان ہی سیکھنے پر ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے ادبی پہلو پر غیر ضروری طور پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور ہندستان میں بالکل وہی کچھ ہوا۔ ایک اوسط طالب علم کے لیے اعلیٰ تعلیم کا مطلب یہ ٹھہرا کہ اس سے قوتِ اختراع اور آزادی چھین لی جائے۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا سوال ہے عوامی ضروریات سے مشکل ہی سے اس کا علاقہ ہوگا اور اس کا واضح مقصد بس یہی ہوتا ہے کہ آگے کی سطح کی تعلیم کے تصور سے محض آگاہ کرایا جائے۔ مختصر یہ کہ انگریزی پر جو حد سے زیادہ زور دیا گیا اس کے باعث ہندستانی عوام اس علم سے محروم رہے جو عمل کے لیے ضروری ہوتا ہے اور دوسری طرف روشن خیال طبقے سے وہ توانائی چھن گئی جو عوام کی قربت کی دین ہوتی ہے۔

انگریزی، بہرحال ہندستان کی مشترکہ زبان نہیں بن سکتی اور اس حقیقت کے باوجود نہیں بن سکتی کہ بادی النظر میں یہ فائدے کا سودا معلوم ہوتا ہے۔ ہم آج جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہ ترسیل و ابلاغ کی دنیا ہے اور عالمی رابطے بڑھتے جا رہے ہیں لہٰذا اس دنیا سے قریبی رابطہ رکھنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ کم از کم آنے والے کچھ برسوں کے لیے ایک تسلیم شدہ عالمی زبان ہندستان کے پاس استعمال کے لیے رہے' کیونکہ کسی قوم کا

حتمی فیصلہ یا عزم بھی ایک دن میں کوئی بین اقوامی زبان نہیں وضع کر سکتا۔ اگر انگریزی کو بیرونی دنیا سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم رکھنے کے لیے سفارتی زبان کے طور پر باقی رکھنا ضروری ہے تو پھر لوگ یہ دلیل بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اندرون ملک بھی اسے رابطے کی زبان کے طور پر کیوں نہ باقی رکھا جائے خاص طور سے اس حقیقت کے پیش نظر کہ کوئی ہندستانی زبان بھی بہت سے لوگوں کے لیے اتنی ہی غیر ملکی ہوگی اور اسے سیکھنے میں بڑی دقت پیش آئے گی؟۔

اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کرنا بہت اہم ہے لیکن اس سے بھی اہم اندرونِ ملک عوام سے رابطہ قائم رکھنا اور اس کے لیے ہندستان کی کوئی غیر معروف زبان بھی انگریزی سے برتر ہے، بھلے ہی انگریزی بڑی مالدار اور وسیع علاقے تک پھیلی ہوئی زبان ہے۔ ہندستان کی نسبتاً غیر معروف زبان بھی یہاں کی مقامی زبان ہے اور جن لوگوں کی یہ مادری زبان ہے انھیں اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ یہ ملی ہے، دوسری طرف انگریزی ہر ایک کے لیے یکساں طور پر غیر ملکی زبان ہے اور اسے سیکھنے میں بڑی دقت اور مصیبت پیش آتی ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ڈھانچہ، نحوی ساخت اور ذخیرۂ الفاظ میں مماثلت کی وجہ سے کسی ہندستانی کے لیے اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری ہندستانی زبان سیکھنا آسان ہوگا لیکن انگریزی سیکھتے وقت اسے ایسی کوئی چیز نہیں ملے گی جو اس کے کام کو رتی برابر بھی آسان بنادے۔ لہٰذا ہندستان کی مشترکہ زبان کوئی ہندستانی ہی ہو سکتی ہے۔

گاندھی جی کی دور بین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا کہ ہندستانی وہ واحد زبان ہے جو ہندستان کی مشترکہ قومی زبان بننے کی اہل ہے۔ دوسری زبانوں کے بھی اپنے اپنے دعوے ہیں۔ بنگالی زبان کا ادب شاید ہندستان کی دوسری تمام زبانوں کے ادب کے مقابلے میں زیادہ توانا ہے۔ تمل کے پاس بھی شاندار ماضی کی روایات ہیں لیکن ان زبانوں کے مخصوص خطے ہیں اور تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس اعتبار سے کامیابی مرکز کی زبان کو ملتی ہے۔ دلی

جب ہندستان کی سیاسی راجدھانی بن گئی تو بنگالی کے ہاتھ سے وہ موقع نکل گیا کیونکہ راجدھانی کی زبان کو ہر طرف جلوہ گر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ہندستانی کو ہندستان کی تاریخ نے بھی مدد بہم پہنچائی۔ کیا ہندستانی اپنے روپ میں تاریخی عمل کی پیداوار نہیں ہے؟ جغرافیہ، تاریخ اور سیاست، سب نے ہندستانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خود اس زبان کے کردار نے اس کی مدد کی اور ہندستانی مشترکہ زبان قرار دیے جانے کی اہل بنی۔ یہ زبان آسان ہے اور اسے سیکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے اور یہ شمالی ہند کی زبانوں کے مشترکہ نسب کی وہ اعلیٰ قسم ہے کہ معمولی سی مدد لے کر یا بغیر کسی مدد کے وندھیاچل سے شمال کے بیشتر ہندستانی، ملی جلی "ہندستانی" کو سمجھ اور بول سکتے ہیں۔ جس آسانی سے ہم ہندستانی کی کسی ٹوٹی پھوٹی شکل کا سہارا لے لیتے ہیں جو ہمیشہ ہماری اپنی مادری زبان اور کسی خاص قسم کی اردو یا ہندی کا "مرکب" ہوتی ہے اور جس آسانی سے اسے وہ لوگ سمجھ لیتے ہیں جن کی مادری زبان اردو یا ہندی کی کسی قسم سے مختلف ہوتی ہے، وہ اس کی مقبولیت کا دوسرا اور سب سے اہم ثبوت ہے۔ انہی وجوہ سے گاندھی جی نے کانگریس کو ہموار کیا کہ وہ ہندستانی کو اپنی سرکاری زبان قرار دے۔ اب یہ جنوب کی جانب قدم بڑھانے لگی ہے۔ بہرحال "ہندستانی" کو ملک کی مشترکہ زبان بنائے جانے کی راہ میں بھی کچھ دشواریاں حائل ہیں اور حالیہ دنوں میں جنوبی ہند میں جو احتجاج ہوا، وہ اس کا ایک چھوٹا سا ثبوت ہے ۔ ہم اس بات پر بحث کر سکتے ہیں کہ جنوب کے لوگوں کو ہندستانی سیکھنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جب وہ انگریزی سیکھ سکتے ہیں تو ہندستانی کیوں نہیں سیکھ سکتے جو ان کی زبانوں سے زیادہ قریب ہے؟

لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو خود ہندستانی ہی بن رہی ہے۔ کیونکہ یہ تجویز سن کر کوئی بھی پہلا سوال یا تبصرہ یہی کرتا ہے۔ "بلاشبہ ہندستانی لیکن کون سی ہندستانی؟" اس کی دعویدار اردو ہے اور ہندی بھی۔ ان کے اپنے علاقائی اختلافات بھی ہیں۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے لکھنؤ والے کہیں گے کہ اس جنس گراں مایہ کے تنہا اور

حقیقی دعویدار ہم ہیں۔دلی والے بڑی حقارت سے اس دعوے کو رد کردیں گے اور پھر یہ دونوں مل کر بہار کے صوبائی لہجے کا مضحکہ اڑائیں گے۔ادھر حیدر آباد دکن کے لوگ بڑی دلچسپی اور آسودہ خاطری سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور آس لگائے بیٹھے ہیں کہ حرفِ آخر انھیں کا ہوگا۔اسی طرح ہندی میں بنارس کے اس دعوے کو کہ خالص زبان کا علمبردار وہی ہے،دوسرے حلقے چیلنج کرتے ہیں جبکہ "بھوجپوری"اور "دیش والی"زبانیں تقریباً بیرونِ حدود کھڑی ہیں۔ بہر حال ہندی اور اردو کے ان چھوٹے چھوٹے اندرونی تضادات کو ہم نظر انداز بھی کردیں تو ان دونوں کا فرق تو بہر حال باقی رہتا ہے۔یہ بات تو درست ہے کہ اردو اور ہندی کی بنیادی ساخت ایک ہی ہے لیکن اس بنیادی مماثلت کے باوجود مخالف فرقوں اور صوبوں کے درمیان جو بے اعتمادی اور حسد کا ماحول بن گیا ہے اس نے ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی ہے۔یہ دیوار صرف رسمِ خط اور ذخیرۂ الفاظ کی نہیں ہے بلکہ لوگ اپنی اپنی تاریخ اور کلچر کے حصار میں بھی بند ہیں اور معاندانہ جذبات اور خطرناک احساسات نے انھیں اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندستانی کو قومی زبان اختیار کیے جانے کے معاملے میں بنیادی دشواری یہی ہے۔حالانکہ بصورتِ دیگر شاید یہی وہ واحد زبان ہے جو کل ہند زبان بننے کی مستحق ہے۔اب مشکل یہ ہے کہ اردو اور ہندی میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔نہ تو مسلمان ہی رقیب زبان کو برداشت کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہندو۔اب ان میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ سنایا جائے تو نہ صرف یہ کہ دوسری زبان کے حامی اسے مسترد کردیں گے بلکہ شدید قسم کے فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھیں گے۔یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے رسمِ خط کے مسئلہ کا سامنا کرنے سے انکار کردیا ہے اور کمزور سی تجویز پیش کی ہے کہ ناگری اور اردو دونوں رسمِ خط کو برقرار رکھا جائے گا۔لیکن یہ تجویز پیش کرتے وقت جس بات کو بھلا دیا گیا وہ یہ ہے کہ دونوں رسمِ خط کو دائمی قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ دونوں متصادم زبانوں کے مخصوص ذخیرۂ الفاظ کو بھی دائمی تسلیم کرلیا جائے جس کا قطعی نتیجہ یہ ہوگا کہ تاریخ اور

تہذیب کے تئیں وابستگیاں بھی مختلف ہوں گی۔

اردو اور ہندی بنیادی طور پر ایک ہی زبان کے نام ہیں۔ فرق صرف رسم خط اور سنسکرت نیز فارسی، عربی الفاظ کی تعداد کا ہے۔ بہت سے کانگریسیوں نے یہ محسوس کیا کہ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ایک غیر جانبدارانہ رسم خط یعنی رومن رسم خط کو اختیار کر لیا جائے تاکہ فرقوں کے درمیان رابطے کو آسان بنایا جاسکے لیکن اس کی بجائے کانگریس نے ان رسم خط میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے میں پس وپیش کیا اور ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ناگری اور مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے اردو کو برقرار رکھنے کی وکالت کی لیکن دونوں میں سے کسی کو مطمئن نہ کر سکی۔ کانگریس کا یہ پس و پیش بذاتِ خود مسلمانوں کے لیے تشویش کا باعث بنا۔ حتیٰ کہ پرانے کٹر کانگریسی مسلمانوں کو بھی یہ شکایت رہی کہ دونوں رسم خط کو یکساں حیثیت دینے کی تجویز محض "خدا ترسی" پر مبنی ایک قرار داد ہے۔ عملاً ناگری رفتہ رفتہ لیکن پوری مضبوطی سے اردو رسم خط کو کھائے جارہی ہے۔ اس صورتِ حال کو ہمیشہ کے لیے روکا بھی نہیں جاسکتا کیونکہ ان علاقوں میں جہاں مسلمان معمولی اقلیت میں ہیں وہاں وہ خود ناگری رسم خط اختیار کرنے پر مجبور ہورہے ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ وارانہ تلخیاں بڑھیں اور اردو اور ہندی کے درمیان اجنبیت کی دیوار اور اونچی ہوتی گئی۔ ہندی کا رجحان اب یہ ہے کہ پہلے سے بھی زیادہ سنسکرت آمیز ہو جائے جبکہ اردو اس کا جواب خود کو زیادہ سے زیادہ فارسی آمیز بنا کر دے رہی ہے۔ بنگال کی تاریخ اس اعتبار سے ایک روشن مثال پیش کرتی ہے کہ بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے ذخیرۂ الفاظ میں تھوڑا سا فرق ہے اور چونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مغربی بنگال میں ہندوؤں کی، اس لیے جزوی طور پر مشرقی اور مغربی بنگال کی زبانوں پر ان کا مخصوص رنگ چڑھ گیا ہے لیکن مقامی اختلافات کے باوجود مشترکہ رسم خط نے انھیں دو مختلف زبانیں نہیں بننے دیا۔ ہندی کو رسم خط کے فرق نے دو حصوں میں بانٹ دیا جبکہ ایک رسم خط کے وجود نے بنگالی کو اس انجام سے محفوظ رکھا۔

لہٰذا مشترکہ ہندستانی زبان کا مسئلہ حل کرنے کا بہتر طریقہ اب یہی رہ جاتا ہے کہ کوئی اور مشترکہ اور غیر جانبدار رسم خط اختیار کرلیا جائے۔ اکثر نفسیاتی دھمکی کا حملہ کامیاب ثابت ہوتا ہے اور براہ راست حملہ ناکام ہو جاتا ہے لہٰذا زبان کے شعبے میں جو ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو گئی ہے، اسے دور کرنے کے لیے ہم رسم خط کے سلسلے میں کوئی اور صورت نکالیں۔ شاید اس طور پر ہم جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور تلخی پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں۔ ناگری اور اردو رسم خط کی کشمکش کی وجہ سے جو تعطل پیدا ہو گیا ہے اسے دور کرنے کے لیے رومن رسم خط کا استعمال کار آمد ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ یہ رسم خط نہ تو ہندوؤں کا ہے اور نہ مسلمانوں کا اور اسے اختیار کر لینے سے دونوں میں سے کسی بھی فرقے کو نہ اپنی فتح کا احساس ہو گا اور نہ شکست کا۔ نہ تو مسلمان اسے اپنی جاگیر سمجھیں گے اور نہ ہندو۔ یہ ایک سمجھوتہ ہو گا جسے دونوں قبول کر لیں گے اور کسی بھی فریق کو ہزیمت کا احساس نہیں ہو گا اور نہ وہ اپنی انا پر کوئی ضرب محسوس کریں گے۔ اس ایک لمحے میں وہ ساری دیواریں گر جائیں گی جنھوں نے اردو کو ہندی سے الگ کر دیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بنیادی طور پر یہ دو مختلف زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی زبان اور اس کا ایک ہی ڈھانچہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہیں اور دوسری میں عربی فارسی کے الفاظ بڑی تعداد میں ہیں۔ دو مختلف رسم خط کا وجود ذخیرۂ الفاظ کے اختلافات کو مستقلاً بڑھاتا رہے گا اور ساتھ ہی تہذیبی وابستگیاں بھی دو مختلف سمتوں کو لے جائیں گی۔ اگر ایک ہی زبان کے دونوں اسلوب ایک ہی رسم خط میں لکھے جائیں گے تو ان کی بنیادی یگانگت خود بخود عود کر آئے گی۔ جب الفاظ اور خیالات ایک ہی زبان سے دوسری میں داخل ہوتے رہیں گے تو اس وقت جو واضح فرق دونوں میں نظر آتا ہے وہ خود بخود دور ہو جائے گا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اردو اور ہندی کے دو حریف حلقوں کے بیچ سے ایک مشترکہ زبان ہندستانی وجود میں آجائے گی بلکہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں بھی وسعت اور تنوع پیدا ہو گا۔ سنسکرت الفاظ کے ذریعے لائے گئے ہندو عناصر اور عربی فارسی الفاظ کے ذریعے لائے گئے اسلامی عوامل

اُس صورت میں تمام ہندستانیوں کا مشترکہ ورثہ بن جائیں گے اور وہ موجودہ صورتِ حال باقی نہیں رہے گی جس میں قدیم ہندستانی تہذیب کا خزانہ ہندی بولنے والے ہندوؤں تک محدود ہے 'اسلامی تہذیب عملاً اردو بولنے والے مسلمانوں کا اجارہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس سے دونوں کی تہذیبی زندگی کمزور اور ادھوری ہو کر رہ گئی ہے۔

رومن رسم خط میں ہندستانی اس طرح زبان کی معیار بندی میں معاون ثابت ہوگی لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے اس کے تحت بین صوبائی حسد اور رقابت کا مسئلہ ختم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ حسد و رقابت کی اصل جڑ لاعلمی اور شک و شبہ ہے اور لاعلمی اور شک و شبہ کی ایک بڑی وجہ زبانوں کا اختلاف ہے جس نے ہندستانیوں کے درمیان آپسی روابط کو فروغ دینے کا کام مشکل بنا دیا ہے۔ اس بات کا اشارہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں کہ آوازوں، لہجہ انداز رواں ادائیگی کے مقامی فرق کے باوجود بالائی ڈھانچے میں مماثلت ہے پھر بھی یہ بات کتنی عجیب لگتی ہے کہ یکجہتی کے باوجود دوری پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ کا بڑا حصہ بھی مشترکہ ہے اگرچہ تلفظ کے فرق کی وجہ سے یہ بات ہمیشہ واضح طور پر سامنے نہیں آتی۔۔۔ اگر تمام ہندستانی زبانوں کے لیے رومن رسم خط اختیار کر لیا جائے تو آپسی تعلقات کو کافی فروغ حاصل ہوگا اور صورتِ حال آج کے مقابلے میں بہتر ہوگی۔ اس کی وجہ سے دونوں کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی کافی قربت پیدا ہو جائے گی لیکن ان کے ادب کا آزاد اور مخصوص سرمایہ ان کی شناخت نہیں ختم ہونے دے گا۔

اب اس مرحلے میں جنوبی ہند کی صورتِ حال پر غور کیا جا سکتا ہے۔ جنوبی ہند کی زبانوں کا ایک الگ گروپ ہے جو ہندستانی سے آسانی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا، لیکن اگر رومن رسم خط ان کے لیے بھی اختیار کر لیا جائے تو ایک ایسا رجحان ضرور پروان چڑھ سکتا ہے جس کے تحت آج کی زبانوں کی آمیزش سے جنوبی ہند کی ایک مشترک زبان وضع کی جا سکے۔ اس کے بعد اس مشترک معیاری زبان اور ہندستانی کے درمیان بھی قربت پیدا کرنے کی تحریک شروع ہو سکتی ہے۔ اس رجحان کو مزید تقویت اس وقت ملے گی جب

پورے ہندستان میں ہندستانی کو پرائمری کے بعد کی ہر سطح پر لازمی ثانوی زبان بنادیا جائے۔ ثانوی زبان کے سلسلے میں عام طور سے جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کی شدت یہاں اتنی زیادہ نہیں ہوگی کیونکہ کوئی نیا رسم خط سیکھنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔ مشترکہ رسم خط کی وجہ سے اس نئی زبان کا بوجھ کچھ زیادہ پریشان کن نہیں ہوگا کہ اس کا چہرہ (رسم خط) بہر حال مانوس ہوگا۔ ایک مشترکہ رسم خط جنوبی ہند کے باشندے کو نہ صرف اس بات کی تحریک دے گا کہ وہ جنوبی ہند کی زبانوں کے ساتھ ساتھ شمال کی زبانیں بھی سیکھے اور اسی طرح شمالی ہند کے لوگوں کو بھی جنوبی ہند کی زبان سیکھنے میں پس و پیش نہ ہوگا کیونکہ پہلے جیسی دشواریاں باقی نہیں رہیں گی۔ غیر ملکی زبان سیکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ نفسیاتی الجھن ہوتی ہے۔ کسی چیز سے مانوس نہ ہونے کی صورت میں جو پہلا جھٹکا لگتا ہے، اس پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ اجنبیت کا یہ احساس نامانوس رسم خط کی وجہ سے زیادہ شدید ہوتا ہے حالانکہ ضروری استعمال کی حد تک غیر ملکی زبان سیکھنے کے عمل میں نہ تو بہت زیادہ محنت درکار ہوتی ہے اور نہ کچھ زیادہ دشواری پیش آتی ہے کیونکہ اس زبان والوں کے درمیان جن لوگوں کا رہنا ہوتا ہے وہ اس سے واقف ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بچے اپنے کھیل کے ساتھیوں کی زبان آسانی سے سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی رسم خط کا سیکھنا بذاتِ خود کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ ایک عام بالغ آدمی انتہائی مشکل رسم خط بھی کم و بیش ایک ہفتے کی مدت میں سیکھ سکتا ہے لیکن اجنبی رسم خط دیکھ کر کچھ ایسی گھبراہٹ طاری ہوتی ہے کہ لوگ اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ سیکھنے کا تکلیف دہ عمل شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ ذہن پر کچوکے لگاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے کام بہت محنت طلب ہو جاتا ہے۔ جب ہم کوئی کام خوشی سے شروع کرتے ہیں تو وہ آسان بھی لگتا ہے اور جو چیز نفسیاتی رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے وہ حقیقتاً ترقی کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ اگر ہم اس جانب پیش رفت کریں تو بین صوبائی رابطوں اور مفاہمت کو فروغ حاصل ہوگا۔

اگر ہم ہندستانی کی معیار بندی کے لیے متفق ہوں اور اس کا رسم خط متعین کر لیں تو بھی ایک مشکل باقی رہے گی۔ کیا ہم اس "رومن زدہ" ہندستانی کو ہندستان کے مختلف حصوں میں ذریعۂ تعلیم بنائیں گے ؟جو لوگ ہندستان کی مشترکہ زبان کے طور پر فوراً اور بخوشی استقبال کریں گے ان میں سے بیشتر اس سوال پر اعتراض کر بیٹھیں گے کیونکہ ایسا کرنا موجودہ حالات کی ہو بہو نقل کرنے کے مترادف ہوگا۔ یعنی جو رول ابھی انگریزی ادا کر رہی ہے وہی ہندستانی ادا کرنے لگے گی۔ اگر ہم مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائیں اور ہمیں ایسا کرنا بھی چاہیے اور ہندستانی کو ثانوی زبان کے طور پر ہر ایک کے لیے لازمی قرار دے دیں تو اس سے طلبہ پر اضافی بوجھ پڑے گا۔ اس طور پر ہندستانی کچھ زیادہ نہیں سیکھی جاسکتی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ پوری دنیا میں ثانوی زبان کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اگر رومن رسم خط کو تمام ہندستانی زبانوں کے لیے اختیار کر لیا جائے تو اس مشکل پر بڑی حد تک قابو پا لیا جائے گا کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ رسم خط کا فرق نہ صرف یہ کہ اضافی توانائی ضائع کرتا بلکہ نئی زبان سیکھنے کے جذبے ہی کو سرد کر دیتا ہے۔ اگر پورے ہندستان میں رسم خط کی معیار بندی کر دی جائے تو طلبہ کو اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو اور ہندی سیکھنے میں جو مشقت درکار ہوتی ہے، اس سے وہ بچ جائیں گے۔ اس سے وہ نفسیاتی الجھن بھی دور ہو جائے گی جو ایک اجنبی رسم خط سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کے مشترکہ ذخیرۂ الفاظ کے مزید کارآمد بننے کے رجحان سے طلبہ کا کام بہت آسان ہو جائے گا اور رومن میں مادری زبان اختیار کرنے سے، ایک کل ہند زبان کے فروغ کے امکان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔

مشترکہ رسم خط کے طور پر رومن کا انتخاب ہندستان کے کچھ مسائل حل کر دے گا۔ یہ ایک معیاری ہندستانی کو فروغ دے گا اور صوبائی اور فرقہ وارانہ مسائل کی پیچیدگیوں سے نمٹنے میں بھی آگے چل کر معاون ثابت ہوگا کیونکہ تعصبات اور نفرت کا یہ ماحول بے اعتمادی اور شک و شبہ کی دین ہے اور کم از کم جزوی طور پر زبانوں کی موجودہ تقسیم بھی اس کی

ذمہ دار ہے۔ ایک مشترکہ رسم خط نہ صرف یہ کہ مختلف فرقوں کی باہمی نفرت اور شک و شبہ کو دور کرے گا اور مفاہمت کو فروغ دے گا بلکہ ان کی تہذیبی کڑیوں کو بھی ایک دوسرے سے جوڑنے کا وسیلہ ثابت ہوگا۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ رومن رسم خط ہندستانی زبانوں میں رائج آوازوں کی ادائیگی کے معیار پر پورا نہیں اترے گا۔ یہ درست ہے کہ انگریزی میں جو رومن رسم خط استعمال ہوتا ہے اس میں ہندستانی صوتیات کی تمام علامتیں نہیں ہیں۔ لیکن یہ بہر حال ایک معمولی سی دشواری ہوگی جس پر مناسب علامتیں وضع کر کے قابو پایا جاسکتا ہے اور ضرورت پڑی تو بین اقوامی صوتیاتی رسم خط کا سہارا لیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کی دشواری پر قابو پانا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے اور پالی، ترکی اور فارسی کے تجربوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ یہ تمام زبانیں اس رسم خط میں لکھی جاتی ہیں اور یہی سب سے بڑا ثبوت ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے۔

ہندستانی زبانوں کے لیے رومن رسم خط اختیار کرنے کی کچھ تکنیکی اور تجارتی وجوہ بھی ہیں۔ اردو، ناگری یا کسی دوسرے ہندستانی رسم خط میں پرنٹنگ اور ٹائپ رائٹنگ میں جو دشواری پیش آتی ہے، اس سے سب واقف ہیں، یہ کہنا ہی کافی ہے کہ آج تک کسی بھی ہندستانی زبان کے لیے ٹائپ رائٹر نہیں تیار کیا جاسکا ہے۔ سنسکرت خاندان والے رسم الخط ہوں یا عربی خاندان والے، ان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مصوتوں کی علامت کا نظام انتہائی غیر اطمینان بخش ہے۔ اس نظام میں حروف علت کی علامتیں، حروف صحیح کے کبھی پہلے آتی ہیں اور کبھی بعد میں، کبھی نیچے آتی ہیں اور کبھی اوپر۔ یہ ایک بالکل ہی غیر منطقی چیز ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی نظام جس میں دو یا تین حروف علت اور حروف صحیح کی آوازوں کی نمائندگی کرنے والی متعدد علامتیں مل کر جب ایک نئی اور پیچیدہ علامت بناتی ہیں تو وہ نظام بہت بھدا ہوتا ہے۔ یہ نظام تبدیلی کا متقاضی ہے اور قومی جذبات کے نام پر اس کی مزاحمت کرنا ایک احمقانہ بات ہوگی۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اس امکان پر گفتگو کی لیکن ان کا اعتراض یہ ہے کہ رومن رسم خط کا استعمال ہماری زبان کا قومی کردار مسخ کر دے گا۔ معلوم نہیں اس سے ان کی کیا مراد ہے؟ دیسی رسم خط کی دہائی دیتے ہوئے ہم سب سے قومی جذبات کے نام پر اپیل کی گئی کہ ایک غیر ملکی رسم خط پر اپنے رسم خط کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس طرح کے سوالوں کا ایک سیدھا سا جواب یہ ہے کہ "زبان، رسم خط نہیں ہوتی" رسم خط محض بصری علامت ہے جو آوازوں کا اشاریہ ہوتا ہے رسم خط اپنی پسند سے منتخب کیے جاتے ہیں اور آوازوں سے ان کا کوئی لازمی نوعیت کا تعلق نہیں ہوتا اور معانی سے تو اور بھی نہیں ہوتا۔ بچے کو زبان اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ ملتی ہے لیکن اس طور پر اسے رسم خط کا ورثہ نہیں ملتا۔ رسم خط ہر شخص بڑی مشکل سے سیکھتا ہے خواہ وہ غیر ملکی ہو یا خود اسی زبان کا پروردہ۔ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ کسی کی زبان اس کی باطنی فطرت کو کچلے بغیر نہیں بدلی جاسکتی کیونکہ مادری زبان سے سینکڑوں بے نام اور غیر محسوس چیزیں جڑی ہوتی ہیں لیکن اس منطق کو رسم خط سے وابستہ کرنا ایک ناسمجھی کی بات ہوگی کیونکہ کوئی بھی رسم خط کسی بھی زبان کو یکساں اور بہتر طور پر لکھ سکتا ہے اور جرمنی، ترکی، اور چین نے یہ ثابت کر دیا کہ زبان اور رسم خط دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ سنسکرت کی مثال خود سامنے ہے کیونکہ یہ مختلف رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور کہیں بھی اس کا کردار مجروح نہیں ہوتا۔ البتہ ماضی کے ادبی سرمائے کے تعلق سے کچھ پریشانی لاحق ہوسکتی ہے یہ ناگری اور عربی رسم خط میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جارہے ہیں اور اگر رومن کو معیاری رسم خط مان لیا جائے تو عام پڑھا لکھا آدمی اس سے متاثر ہوگا لیکن یہاں یہ اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کے اس سے صرف کسی زبان و ادب کے اسکالر یا مورخ متاثر ہوں گے۔ ان کے لیے دیسی رسم خط جاننا ضروری ہوگا۔ اس کے علاوہ ایسے کلاسکی متون کو 'جو ہمارے قومی اور سماجی شعور کے مشترکہ عنصر بن چکے ہیں' آسانی سے رومن رسم خط میں بھی ڈھالا جاسکتا ہے۔

مشترکہ رسم خط اپنانے سے صوبائی زبانوں کی شناخت مٹ جانے کا بھی کوئی خاص خطرہ نہیں ہوگا۔ یوروپی زبانوں نے بہت پہلے ہی اسے اختیار کر لیا تھا۔ پھر بھی آج تک یہ سننے میں

نہ آیا کہ ان میں سے کسی کی بھی انفرادی شناخت ختم ہو گئی۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانیں ایک ہی ماخذ سے فیضیاب ہوئی ہیں اور ایک دوسرے سے اسی طرح کافی مشابہ ہیں جس طرح دو ہندستانی زبانیں ہوتی ہیں۔ مشترکہ رسم خط نے ان کی خصوصی شناخت کو دھندلایا نہیں ہے بلکہ صرف ان کے آپسی رابطوں کو آسان بنایا ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی کے بہت سے الفاظ مشترک ہیں لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مشترکہ رسم خط نے ان کے آزادانہ فروغ میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ ڈالی ہو۔ اگر ہندستانی زبانوں کے پاس اپنا کوئی ادب نہ ہوتا تو تھوڑا سا خطرہ انھیں اپنی شناخت کے مٹنے کا ضرور ہوتا لیکن ان کے ترقی یافتہ ادب اور روایات کا ورثہ اتنا مضبوط ہے کہ اس کے مٹنے کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

اگر بین اقوامی رابطوں کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو رومن رسم خط اختیار کرنے کے جو فائدے ہو سکتے ہیں وہ اتنے واضح ہیں کہ ان کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جس میں بین اقوامی رابطے دن بہ دن بڑھتے جارہی ہیں اور یہ بات بد سے بدتر ہوگی کہ ہم عالمی حالات و واقعات کے عام رجحان سے اپنے آپ کو کاٹ لیں۔

اب کوئی یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ایک چھوٹی سی بات کے لیے کوئی بھی ایک قوم غیر ملکیوں کے فائدے کے پیش نظر رسم خط کا انتخاب نہیں کر سکتی اور یہ توقع کرنا زیادتی کی بات ہوگی کہ ہندستان رومن رسم خط کے حق میں اپنے تمام روایتی رسم خطوں ہی کو ترک کردے گا، محض اس خیال سے کہ غیر ملکیوں کو کچھ دشواری پیش آتی ہے ،اس اعتراض میں کافی دم ہے لیکن اس کی قدر کرنے کے باوجود اس بات کا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ آج جس طرح اقوام عالم ایک دوسرے کے قریب آرہی ہیں،اس کے پیش نظر یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ رومن رسم خط کا استعمال ہمیں عالمی برادری اور اس کے مشترکہ مفادات کے قریب لے جائے گا کیونکہ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ موجودہ دور رومن رسم خط کا دور ہے۔ انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں نے اسے بہت پہلے اختیار کر لیا تھا۔ جرمنی نے آخر

میں اسے اپنایا اور اب روس بھی اسی سمت میں فیصلہ کن قدم اٹھانے والا ہے۔ ترکی نے راستہ دکھایا اور چین اور جاپان اس پر جلدی ہی عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ پورے کے پورے امریکی براعظم نے اسے اختیار کر لیا ہے۔ اگر ہم بھی یہی رسم خط اختیار کر لیں تو ہم ہندستانی کو دنیا کی ایک اہم زبان بنائے جانے کی سمت پہلا قدم اٹھانے کی سعادت حاصل کر لیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم اپنی قومی زبان کا مسئلہ بھی حل کر لیں گے۔

☆☆☆

بھگوان داس

ہندستانی کو قومی زبان بنائے جانے کے سوال پر کسی بھی حلقے سے کسی طرح کا شبہ
نہیں ظاہر کیا جارہا ہے۔اسی طرح یہ بات بھی تقریباً یقینی نظر آتی ہے کہ اردو اور ہندی میں
سے کوئی بھی زبان ختم نہیں ہوگی اور نہ ہی بنگالی، مراٹھی، تمل یا تیلگو زبانوں پر کوئی اثر
پڑے گی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندستانی کو تقریباً ایک نئی زبان کے طور پر سنوارا اور
سجایا جائے جس میں ہندی اور اردو کے تمام عناصر شامل ہوں اور اس کے علاوہ دوسری
زبانوں خاص طور سے انگریزی' سے بھی کچھ الفاظ لیے جائیں اور یہ کام کچھ بہت مشکل نہیں
ہے۔ عملی طور پر اردو اور ہندی کے تمام افعال مشترک ہیں اور اگر سنسکرت یا عربی سے کچھ
نئے فعل بھی لینے پڑیں تو انھیں بھی اس طرح جذب کرلیا جائے جیسے پرانے لفظوں کو
جذب کرلیا گیا ہے۔ نحوی ترکیب بھی دونوں کی ایک ہی ہے۔واحد فرق جو ہوتا ہے،وہ
بطور خاص اسم میں ہوتا ہے تکنیکی، سائنسی، فلسفیانہ اور ادبی تحریروں میں سنسکرت یا عربی کی
اصطلاحوں کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا۔ مصنف ناگزیر طور پر وہی اصطلاحات استعمال کرے
گا جن سے وہ مانوس ہے۔ سنسکرت کی اصطلاحیں استعمال کرنے والے مصنفین کو چاہیے کہ وہ
ایسی عادت ڈال لیں جس کے تحت کسی اچھی ڈکشنری سے،ان کے عربی اور فارسی مترادفات
تلاش کرکے سنسکرت اصطلاحات کے ساتھ ہی ساتھ بریکٹ میں درج کردیں۔اسی طرح
عربی اور فارسی کی اصطلاحیں استعمال کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ بریکٹ میں ان کے
سنسکرت مترادفات لکھ دیا کریں۔اگر قوم پرست ادیب اسے اپنا اصول بنالیں تو شاید ایک
سال سے بھی کم مدت میں ہر دو زبان سے کئی سو الفاظ مشترکہ سرمایہ بن جائیں گے اور یہ وہ
بات ہوگی جو پورے ملک میں کئی اعتبار سے باہمی مفاہمت کو فروغ دے گی۔ بیس سال سے
زیادہ کا عرصہ گذرا۔ میں پانڈیچری گیا ہوا تھا۔شام کو جب ٹہل رہا تھا تو اچانک راستہ بھول

گیا۔ جن لوگوں سے میں نے درخواست کی کہ مجھے اس ہوٹل کا راستہ بتادیں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ میری انگریزی نہ سمجھ سکے اور میں ان کی فرانسیسی نہ سمجھ سکا۔ خوش قسمتی سے ریلوے لائن پر مجھے ایک آدمی کام کرتا ہوا نظر آیا۔ چونکہ وہ مسلمان تھا اس لیے تھوڑی بہت ہندستانی بھی جانتا تھا۔ اسی لیے وہ میری مدد بھی کرسکا۔ اب رسم خط کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ موجودہ اردو رسم خط سنسکرت اور انگریزی حروف کی آوازیں پورے طور پر ظاہر نہیں کرسکتا لیکن سنسکرت رسم خط کرسکتا ہے۔ اسی طرح انگریزی کا رومن رسم خط بھی نصف درجن اعراب کے ساتھ ان آوازوں کو ظاہر کرسکتا ہے۔ ان باتوں کا فیصلہ منتخب اور نامزد کردہ ممبران کی ایک کمیٹی کرسکتی ہے۔ یاد رکھیے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ دیوناگری (سنسکرت) یا اردو (عربی) رسم خط کو ملک سے نکال پھینکا جائے گا۔ ہندی اردو نیز دوسری صوبائی زبانوں کے بارے میں ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہوگا کہ ایک اضافی قومی زبان کو فروغ دیا جائے اور اسے پورے ملک میں صوبائی یا مادری زبان کے ساتھ ہی ساتھ تمام تعلیمی اداروں میں پڑھایا جائے اور اس کے لیے اس کا یہی رسم خط پورے ملک میں رائج کیا جائے۔

ہندستان کے کسی مرکزی حصّے سے ایک اچھا ہفتہ وار یا ماہانہ جریدہ شائع ہونا چاہیے جس میں ایسے معلوماتی مضامین شائع ہوں جو ہر اعتبار سے بہتر مفاہمت کو بڑھاوا دے سکیں۔ ان مضامین کے توسط سے منظم طور پر علم کے مختلف شعبوں کا احاطہ کیا جانا چاہیے (محض اعداد و شمار نہیں اکٹھا کیے جانے چاہئیں)۔ یہ مضامین ایسے ہوں جو سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیں۔ ہر سوال کے دونوں پہلوؤں پر بحث کی گنجائش ہونی چاہیے۔ کسی طرح کی جانبداری یا بدنیّتی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہر سوال پر ٹھنڈے دل اور معقولیت پسندی کے ساتھ غور کیا جانا چاہیے۔ طنز اور دل آزاری کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ غرض یہ کہ سنجیدگی ہو جذباتیت نہیں۔ یہ جریدہ، جیسا کہ پہلے کہا گیا مرکز میں اور ایک ہی رسم خط میں شائع ہونا چاہیے۔ پھر اسے صوبائی مراکز میں بھی شائع کیا جانا چاہیے۔ اس رسم خط کے ساتھ متن کو

صوبائی رسم الخط میں بھی چھاپنا چاہیے۔الفاظ تو ہندوستانی ہی کے ہوں گے جس کا ترجمہ صوبائی زبان میں شائع کیا جائے گا۔

رفتہ رفتہ اگلی چند نسلوں تک قومی ہندوستانی زبان کے خط وخال متعین ہو جائیں گے اور اس کا اپنا ایک طاقتور سائنسی، فلسفیانہ، فنی اور تکنکی ادب کا سرمایہ ہو گا۔تب قدرتی عمل کے تحت وہ صوبائی زبانیں (اور ان کا ادب) خود بخود غائب ہو جائیں گی جو بہت کمزور ہیں۔اور اس سے کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔

☆☆☆